



WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

PDF



WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پھی کہانیاں



WWW.URDUSOFTBOOKS.COM



WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

2018



WWW.URDUSOFTBOOKS.COM



WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

JANUARY 2018

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پھر دنیا کی پی

E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بانی سہماں مرزا



مدیر اعلیٰ: منزہ سہماں

گروپ ائیڈیٹر: ناصر رضا

مدیر: دانیال شمشی

رکن آہل پاکستان خود چھپو سوسائٹی
رکن آہل آپ پاکستان خود چھپو لیبلز

MEMBER
APNS
CPNE

خط و کتابت کا پتا: II-C-88 فرست ٹاؤن خیابان جاوی کرشم
ڈیشنس فیور: 7-6-2018
ہائی سکول اتحادی، کراچی

میجر مارکیٹنگ

زین مشی

0331-8221212

میجر سرکولیشن

آفتاب عالم

0334-3193174

اکٹنیکس ایڈواائزر

منڈوم ایڈیشن (ایڈوکیشن)

رابطے کے لیے

021-35893122

021-35893123

قیمت فی شمارہ: 60 روپے * جلد: 35 - شمارہ: 01 جنوری 2018ء *

ایڈیٹر، پبلیشور: منزہ سہماں نے مشی پر لیں سے چھپو اکرشائی کیا۔

INFORMATION ONLY

نہایت اہم التماس

قارئین انتظار کے لیے معدورت خواہ ہیں لیکن آپ بخوبی واقف ہیں کہ دنیا میں ہر کوئی اپنے کاروبار کے لیے محنت کرتا ہے تاکہ منافع حاصل کر سکے لیکن اگر ہماری وجہ سے کسی کے کاروبار کو نقصان کا اندر یشہ ہو تو ہمیں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ دیکھیں ہر ڈائجسٹ کے پبلشر بہت محنت کے ساتھ ہر مہینے ڈائجسٹ شائع کرتے ہیں تاکہ وہ مارکیٹ میں فروخت ہو سکے اور ان کو منافع حاصل ہو سکے لیکن آج کے اس اظرنیت دور میں جب وہی ڈائجسٹ یا رسالہ مارکیٹ میں پوری طرح آنے سے قبل ہی آن لائن پی ڈی ایف میں مل جائے تو مارکیٹ سے خریداری بہت کم رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے پبلشر کا بہت نقصان ہوتا۔ لہذا اس سارے معاملے کو خاطر میں رکھتے ہوئے urdusoftbooks.com کی انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ ماہ سے کوئی بھی ڈائجسٹ رواں مہینہ کی 30 تاریخ سے پہلے Upload نہیں کیا جائے گا تاکہ پبلشرز کا نقصان نہ ہو۔

خوشخبری

ان شاء اللہ آئندہ urdusoftbooks.com پر تمام ڈائجسٹ بغیر واٹر مارک کے Upload ہوا

کریں گے تاکہ قارئین کو پڑھنے میں دکٹ کا سامنا نہ کرنا پڑے

قارئین سے مزید درخواست ہے کہ urdusoftbooks.com کے لیے اپنے ویب براؤزر سے Adblocker ڈس ایبل کر دیں تاکہ ویب سائٹ پر سپانسر اشتہارات نظر آسکیں اور ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن ہو سکے انہی سپانسر اشتہارات کی آمدن سے ویب سائٹ کے ماباہنہ اخراجات پورے کیے جاتے ہیں لہذا آپ کا تھوڑا سا تعاون urdusoftbooks.com کو مستقل آن لائن رکھنے میں بہت مددگار ثابت ہو گا۔ شکر یہ

دختر کا ہن

22

م. ن. خ

احوال

08

ناصر رضا

خبر تو بنتی ہے

07

منزہ سہماں

ایک گاؤں کی کہانی

74

عبد الغفار عابد

بکھر تھی منزہ

60

حی جل متنیلو

بازار

39

امہ ترقیق جیلانی

آزمائش

96

ذکر الماس روپی

چاند گرہن

90

فاطمہ عبد الخالق

نئی زندگی

82

فیضان عثمانی

سبر باغ

112

افتخار چوہدری

نئی پیار کہانی

108

گیتا پانڈت

نصیب

102

صف دیوب

تحت نشین

134

نسیم سکینہ صفت

احساسِ ندامت

130

لکھ دشمنوں کی راہ

میں نشے میں ہوں

120

ایں امتیاز احمد

152

خون کا رشتہ

نسیم سر

146

چشم دید

دستگیر شہزاد

140

محبت کے رنگ

نازیہ بتوں رضا

186

وہ ذات و وجود

فوزیہ فرید

176

خوبصورتی

حیدر اسید

160

ریشم کے دھاگے

روشنے سبیعین

214

سنگریزے

مش. خ

204

آپ کی ڈاری

قارئین

192

المتاس

شازیہ سید مغل

232

اشعار کہانی

شیر ناقہ

228

دیس کہانی

زین شمسی

217

مسئلہ یہ ہے

ادارہ

244

موم اور محبت

سید ضمیر شاہ

238

خواجہ خوشید انور

اح. آفی رشیدی

234

سفر کہانی

اختر حفظ

اب CSS ایک حقیقت

- 1) والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ اُن کی اولاد ان کا نام روشن کرے مگر فی زمانہ اکثر والدین اپنی خواہش کو بس اپنے دل میں ہی دبا کر رکھ لیتے ہیں۔
- 2) مشہور تعلیمی اداروں اور ان سے جڑے اساتذہ کی بھاری بھر کم فیس عام والدین کی پہنچ سے بہت دور ہوتی ہیں۔
- 3) ایسے میں ہم آپ کی رہنمائی کریں گے ہم آپ کی اولاد کو آپ کے لیے باعث فخر بنائیں گے۔
- 4) علم کی دنیا میں CSS ایک خواب۔
- 5) اس خواب کی حقیقی تعبیر کے لیے ہم آپ کے ساتھ ہیں۔
- 6) انتہائی قابل ٹیچرز سے گھر بیٹھے اپنی لاڈلی بیٹی یا ہونہار سپوت کو CSS کی تیاری کرائیں۔
- 7) CSS میں آپ کی کامیابی کو ہم یقینی بنائیں گے۔

رابطہ کے بعد



”خبر توبنگی ہے“

ایسی غیر معمولی اور اہم باتیں جن کا انسانی زندگیوں پر گہرا اثر پڑتا ہواں کو خبر کا درجہ دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے معمولی اور غیر اہم باتوں پر کوئی توجہ کیوں دے؟ جیسے کہ اچی کاموسم بھی آج کل بہت اچھا ہو رہا ہے۔ بادل، بارش، اور زالہ باری نے اندر اور باہر دونوں موسموں کو دلفریب بنادیا ہے۔ اب یہ تو خربنگی ہے کیونکہ کراچی میں بارش شاذ و نادر ہی ہوتی ہے، لہذا ہر چیز پر سب سے اہم خبر یہی تھی کہ کراچی میں جل تھل، اسی خوشی کے ماحول میں ایک اور بہت حیرت انگیز خبر نظریوں سے گزری امریکہ میں ٹرین پڑی سے اتر گئی، میں حیران ہوں کہ اب اس میں ایسی خاص بات کیا تھی ہمارے ہاں تو ٹرین تو ٹرین ہر چیز پڑی سے اتری ہوئی ہے۔ کون سا ایسا ادارہ ہے، کون سے ایسے ذمہ دار ان ہیں اور کون سے ایسے رویے ہیں جو پڑی سے اترے ہوئے نہیں ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو ہمارا شمار بھی ترقی یافتہ ملکوں میں ہوتا لیکن ان ساری باتوں کے باوجود میں اب تک نہیں سمجھ پائی کہ ٹرین کا پڑی سے اتنا ایسی کون سی خاص بات ہے بس پھر یہی سمجھ آیا کہ اگر یہ ٹرین پاکستان میں پڑی پر چلتی تو خربنگی، امریکن ٹرین کا پڑی سے اتنا اتنا حیرت انگیز ہے۔ جتنا پاکستانی ٹرین کا پڑی پر چلنا..... تو خبر توبنگی ہے اور اسی خبر کے ساتھ تمام پڑھنے والوں کو میری جانب سے 2018ء کا روشن اور منزہ سہام تابناک سورج مبارک ہو۔

الحوال

قارئین کے درمیان رابط، آپ کے خطوط اور ان کے جواب

☆ محترم احوالی دوستو! سلامت باشد! نئے سال کا نیا، پہلا شمارہ آپ کے پیش نظر ہے..... سال گزشتہ کے آخری شمارے طویل کہانی نمبر کو آپ نے جو بے حد سماں اور پسند کیا، اس کے لیے ہم دل سے تمام قارئین کے شکر گزار ہیں اور اب آپ کے لیے یہ خبر یا اطلاع کہ کچی کہانیاں کے دریں دوست، سینئر لکھاری سیم اختر صاحب نے ماہ جنوری سے شروع ہونے والے انعامی کہانی کے سلسلے سے اپنی کہانیوں کو مستحق رکھنے کا محبت بھرا حکم صادر فرمایا ہے۔ اور اب آغازِ احوال سے پہلے سال نو کی آمد کے حوالے سے سب کے انور مقصود، میرے انو بھائی کی ایک تحریر پوش خدمت ہے۔

پاکستان بننے 70 سال گزر گئے لیکن کجھ تپی نیوایر نہیں آیا۔ ہر سال جانے والے سال سے نہ اور آنے والے سال سے اچھا گزر جاتا ہے۔ چند میئنے ہوئے ہمارے ایک دوست اپنے ساتھ کی مستقبل کا حال بتانے والے کو لے آئے۔ انہوں نے ہمارا ہاتھ دیکھا پھر مختلف زاویوں سے ہماری شکل دیکھتے رہے اور پھر ایک کاغذ پر ہمارے مستقبل کے بارے میں کچھ سطریں لکھ کر ہمیں دے دیں۔ انہوں نے لکھا تھا۔ ”پریشانیاں ختم ہو چکی ہیں، آنے والے سال کا سورج خوشیاں لے کر طوع ہورتا ہے۔“ غرضیکہ ہم کو خوش کرنے والی ساری باتیں اس کا غذہ میں موجود ہیں۔ ہم نے آن کا شکر یہ ادا کیا اور پوچھا۔ ”آج رات آپ کیا کر رہے ہیں؟“ مستقبل کا حال بتانے والے کہنے لگے۔ ”رات کے پروگرام کا بھی سے کیا پتا سکتا ہوں ابھی تو دو پھر ہے۔ پتا نہیں کیا پروگرام بتتا ہے۔“ ہم نے کہا۔ ”بھائی صاحب! آپ کو اپنے رات کے پروگرام کا پتا نہیں تو ہمارے اگلے سال کے پروگرام کے بارے میں آپ نے کہے اندازہ لگایا۔“ ہمارے دوست نے ہمیں تو کہا کہ یہ بہت بڑے جو شی ہیں۔ ہم نے آن سے معافی مانگی اور کہا۔ ”اللہ کرے آپ نے جو کچھ کہا ہے وہ صحیک نکلے۔“ جاتے وقت انہوں نے اپنی فیس جوڑھائی سورو پے تھی لینے سے انکار کیا اور کہا کہ آپ نے ہمارا دل دکھایا ہے انشاء اللہ فیں آپ سے سال ختم ہونے کے بعد لیں گے اور ڈھائی سو نہیں بلکہ ڈھائی ہزار۔“

خبر وہ بغیر فیں لیے چلے گئے۔ چند دن پہلے ہم نے اپنے دوست کو فون کیا اور کہا کہ یار آج

شام مجھے تم اپنے جو شی کے پاس چلے مجھے ان کی فیس دینا ہے کیونکہ نیساں شروع ہونے میں کچھ دن رہ گئے ہیں مجھے کچھ وحشت سی ہو رہی ہے۔ ہمارے دوست نے کہا بڑا مشکل ہے اس کے لیے فیس لینا کیونکہ جurat کو گرومندر پر وہ ترک کے نیچے آگئے۔ ہم نے دریافت کیا کہ کیا ان کو یہ معلوم تھا کہ وہ ترک کے نیچے آ جائیں گے۔ ہمارے دوست نے جواب دیا۔ ”ان کو تو شاید معلوم نہیں تھا مگر ترک والے کے بیان سے پتا چلا ہے کہ اس کو معلوم تھا کہ یہ آدمی ترک کے نیچے آ جائے گا.....! اور اب آغا ز احوال یہ پہلا خط ہے حیر آباد سے معروف صحافی، مصنف اور منفرد لکھاری سید سرور ندیم کا لکھتے ہیں۔ بھائی ناصر رضا اچند ماہ کی غیر حاضری کے بعد سال کے آخری شمارے طویل کہانی نمبر پر تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں۔ منورہ نوری خلیق مرحمہ کی منزل کی تعریف کیا کی جائے، اللہ ان کی مغفرت کے ساتھ درجات بلند کرنے، اس کی کہانی میں ایسا بہت کچھ ہے جو پڑھنے والے کی عقل اور شعور سے مکالمہ کرتا ہے، کھڑکی میں رکھی آنکھ دو اقسام پر مشتمل ریسیسے خالد صاحبہ کے اس ناول نے دل کو مال سے آباد کر دیا یعنی اور وہ بھی کڑواج، ہمیں بتا رہے کہ دشمن بھارت کی دشمنی اپنی جگہ افسوس صد افسوس کر ہم خود بھی تو اپنے دوست نہ تھے۔ بخت گزیدہ ایک ایسی لا جواب زندگی سے جڑی طویل کہانی ہے جو ایک اعلیٰ ناول کی صورت بھی محمد سلیم اختر تحریر کر سکتے تھے۔ اندھیرے کا سفر اچھی ہے مگر عالم کے زمرے میں آتی ہے۔ مقدور یوں را کہ ہوا، بھی ایسی ہی ایک کہانی ہے۔ زندگی کے رنگ گاؤں کے پس منتظر میں بہت اچھی تحریر ہے، مہر دیز دلو اسے اور بھی اچھی تحریر بنا سکتے تھے اگر سونے اور لکھنے کے درمیان فاصلہ کچھ بڑھا ہو تو۔ ”مسکراہٹ“ حسین خواجہ نے بہت ہی خوبصورت خیال بنا ہے اس تحریر کی صورت جو منفرد ہی نہیں مثالی بھی ہے۔ ریشم کے دھانگے روشنے سبھیں کا نام کہانی اور افسانے کے حوالے سے کسی تعارف کا حاج نہیں، منتظر نامے اور مکالے پر ان کی گرفت بہت پکی ہوتی ہے۔ ناول کی پہلی قسط میں بھی انہوں نے یہ کمال دکھایا ہے۔ اب آگے دیکھیے وہ اپنے قارئین کو اور کیا کمال دکھائی پیں؟ ”شاہزاد“ نہرا رضوی پر اسرار کہانی لکھتے کی اپیشیلت ہیں، یہ کہانی بھی چند ناقص مناظر کے قطع نظر انہوں نے اچھی تحریر کی ہے۔ امتاس، تاثور جیسے بہترین ناول کے بعد بھی کہانیاں کے لیے شازی سعید مغل صاحبہ کی یہ دوسری طویل تحریر ہے۔ پہلی اور دوسری قسط لا جواب رہیں، تیسرا قسط ان کے مقابلے میں کچھ کم تھی اب دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ میری تمام نیک تھنائیں شازی سعید مغل صاحبہ کے ساتھ ہیں۔ جن کی امتاس کا مقابلہ انہی کے تاثور سے ہے۔ وہیں کہانی ایک بہت اچھا معلوماتی سلسلہ ہے۔ اشعار کہانی، سفر کہانی، نمایاں شخصیات، حاصل مطالعہ علم اور آگئی ہے۔ جو یقیناً اچھی بات ہے۔ بدیکی کہانی اس پارنس ٹھیک ہی ہے۔ البتہ آواز کی دنیا، معروف علمی شخصیت محمد سلیم اختر صاحب (لاہور والے) کی یادداشت کی جھنپی بھی تعریف کی جائے کم ہو گی، امید ہے کہ وہ آئندہ بھی اچھی کہانیاں کے قارئین کو ایسی خاص تھماری سے نولزیں گے اور اب اجازت سے پہلے آپ کے نام

قارئین اور سچی کہانیاں کے لکھاریوں کے لیے ایک شعر.....

خدا آباد رکھے تم کو پیارے

ہمیں زریز کرتے جا رہے ہو

بھائی سرورِ ندیم، آپ چند ماہ بعد آئے مگر اتنے بھرپور اور بامعنی تبرے کے ساتھ کمال آئے، کیا ہی اچھا ہو کہ آپ ہر ماہ اتنے ہی اچھے، بھرپور مکمل تبرے کے ساتھ احوال میں آئیں... تو پھر کیا خیال ہے؟

☆ ملک عاشق حسین ساجد مظفر گڑھ سے شریک احوال ہو رہے ہیں۔ ناصر رضا صاحب! السلام علیکم، امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ ماہنامہ 'سچی کہانیاں' ماشاء اللہ اب تکھرتا جا رہا ہے۔ بہت سی تبدیلیاں اسے مزید خوبصورت بنارہی ہیں۔ آپ جس محنت اور لگن سے اسے تیار کر کے ہم تک پہنچا رہے ہیں، مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ویلڈن سائیں! اس میگزین کو بہت سارے قارئین زیرِ مطالعہ کیے ہوئے ہیں جن کی تعداد میں روز بروز اضافہ اس کی بے پناہ مقبولیت کا منہ بولتا ہوتا ہے اور اس کی ثیم کو اور اسے مزید ترقی و دائیگی کا میاہیوں کے ساتھ سدا قائم و دائم رکھے آئیں ہو سکے تو پہ اسرار نمبر کو کر کے روحاںی نمبر اور دیگر نمبرز شائع کریں۔ موسم اور حالات کے پیش نظر اور منظوم کلام کو بھی نہیاں جلد دیں۔ تمام سیفیز اور جو نیز لکھاری خواتین و حضرات کی کاوشیں اپنی مثال آپ ہوتی ہیں۔ آج کل ماشاء اللہ ہر تحریر ایک سے بڑھ کر ایک جا رہی ہے۔ تمام لکھاری اور مراسلنگاروں کی خدمت میں خلوص بھرا سلام عرض۔

بھائی ملک عاشق حسین ساجد آپ احوال میں آئے دل شاد اور آباد ہو گیا۔ آپ کی تمام تجاویز پر سنجیدگی سے غور ہی نہیں عمل پیرا ہونے کا بھی وعدہ رہا۔

☆ ممزغہت غفار کر اپنی سے شامل احوال ہو رہی ہیں محترم ناصر بھائی، السلام علیکم! امید ہے کہ آپ معد فیلی اور اسافل بخیر ہوں گے۔ جیسا کہ فون پر آپ نے پہ اسرار کہانی کا حکم دیا۔ میں فوراً ہی کہانی لکھنے بیٹھے گئی اللہ رب العزت بڑا ہی مسبب الالا سب اور کار ساز ہے۔ 1980ء کی کہانی کو اب 2017ء میں شائع ہونا تھا۔ دیکھیں اُس رب کا کرم مجھے فوراً ہی یاد آگئی یہ کہانی میں نے کل ہی شروع کردی تھی حالانکہ طبیعت بہتر نہیں تھی مگر آج توہہت زیادہ ہی خراب رہی سارا دن، نزلہ کھائی بخار سارے بدن میں درد، چھینکیں تو پہ تو پہ۔ طبیعت پھر ماشاء اللہ آج 'سورہ مزل شریف' پر دھوایا دن میں نہیں لکھ کی اب اس وقت رات کے تین بجے رہے ہیں سب سورہ ہے ہیں سوتے مجھے منع کر کے سوتے تھے۔ ای..... اب سو جائیں صحیح لکھے گا..... میں نے کہا کہ ہاں! صحیح لکھوں گی اب سورہ ہیں۔ گرجیسے سب سوتے چکے سے اٹھ کر موبائل کی نارچ میں لکھ رہی ہوں کیونکہ تھیہ کر لیا کہ یہ کہانی انشاء اللہ تعالیٰ لازمی پوست کروانی ہے۔ آج کل بہت ہی زیادہ پریشانی ہو رہی ہے ذاک کے سلسلے میں پہلے اسکوں جاتی تھی سارے کام خود کرتی۔ اب ریشارز ہو گئی ہوں اور پھر

بیکار بھی زیادہ رہنے لگی ہوں اب زیادہ پیدل نہیں چل سکتی۔ بنجے سارے مصروف ہیں۔ ماشاء اللہ شادی شدہ کی مصروفیت، الحمد للہ ماشاء اللہ نو سے آج کل میرا یہ کام کر دیتے ہیں مگر وہ بھی مصروف، اسکوں یوشن کو چنگ، پھر موقع ملتا ہے، تا تو کا کام کرتا ہے ارے ماما..... باٹک پر بس یوں گئے یوں آئے، لیجیے پر اسرار کہانی، وہ چہرہ نورانی، پوسٹ ہو گئی ہے۔ اب اجازت چاہوں کی اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مدد فیصلی، پچی کہانیاں مع فیصلی، کوہم سب کو اپنی رحمتوں اور عنایتوں کے حصار میں رکھے۔ سدا کامیاب و کامران رکھے۔ اپنی حفظہ و امان میں رکھے (آمین ثم آمین)۔

اچھی بہن مز عکھت غفار! ہماری تمام اچھی، پچی اور پکی دعائیں آپ کی محنت زندگی کے حوالے سے آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ اپنے اہل خانہ اور پیاروں کے ساتھ شادر ہیں آباد رہیں۔ وہ نورانی چڑھ موصول ہو گئی ہے۔

☆ نیم سینہ صدف ڈسکہ سے شامل احوال ہو رہی ہیں۔ پیارے ناصر بھائی! السلام علیکم! عرصے بعد آپ سے مخاطب ہونے کی خوشی حاصل کر رہی ہوں۔ دو کہانیاں حاضر خدمت ہیں۔ ایک میرے بھائی دشکیر شہزادی اور دوسری میری بڑھ کر قریبی شمارے کی نظر کر دیں آپ کے دوبارہ آپ نے حد خوشی ہے۔ اللہ پاک آپ لو زندگی میں پچی خوشیاں نصیب فرمائے آمین۔

اچھی بہن نیم سینہ صدف! آپ احوال میں آئیں، خوشی ہوئی آپ کی ارسال کردہ دونوں کہانیاں بڑھ کے زیر نظر شمارے کے قارئین کی زیر نظر کرو دیں ہیں۔

☆ مقصود احمد بلوچ میاں چنوں سے شامل احوال ہو رہے ہیں۔ قابل قدر جناب ناصر رضا صاحب! السلام علیکم! میں یہ امید کرتا ہوں کہ اب آپ بالکل خیر خیریت سے ہوں گے۔ اب آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ بندہ کون ہے۔ ناصر بھائی! میں بھی پچی کہانیاں کا ایک لکھاڑی ہوں۔ لیکن اب پچھہ عرصہ سے میں نے پچی کہانیاں میں لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ نہ لکھنے کی بھی ایک وجہ تھی۔ کیونکہ پچی کہانیاں میں صرف چند مخصوص لوگ ہی لکھ سکتے تھے اس کے علاوہ باقی لوگوں کی تحریریں نظر انداز کر دی جاتی تھیں۔ پچی کہانیاں کا تازہ شمارہ مجھے ملے، ناٹھل بہت ہی خوب صورت ہے اس کے علاوہ آپ نے جو تبدیلیاں کی ہیں مطلب نے سلسلہ شروع کیے ہیں۔ یقیناً وہ سب ہی اچھے ہیں۔ اور سب سے زیادہ خوشی مجھے احوال میں شائع ہونے والے خطوط سے ہوئی ہے۔ کیونکہ جتنے بھی خطوط شائع ہوئے ہیں، سب کے سب اصلی خطوط ہیں۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کریں، پرانے احوالی ساتھیوں ایک اشFAQ بث شاہد رفتیں سہو مہر قاسم خان بلوچ، ایم یحیف عاصم بلوچ، عامر زمان عاصم عبدالعزیز بھی آ، فتحی عزیز میں، اور بہت ہی عرصے سے گم ہماری بہن سدرہ انور علی یہ سب لوگ پچی کہانیاں کی گھری میں واپس لوٹ آئیں۔ آپ سب کی اب دل آزاری نہیں ہو گئی۔ بلکہ ناصر رضا بھائی خوش آمدید کہیں گے۔ اس شمارے کی سب کہانیاں بہت ہی اچھی لگیں۔ اگر زندگی رہی تو اگلے ماہ حاضری ہو گی۔ تب تک کے لیے اللہ نگہبان۔

کہ بھائی مقصود احمد بلوچ، جو وقت گزر گیا گز گیا، بس اب موجودہ وقت کی بات ہوئی چاہیے۔
آئندہ بھی آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔ آپ کی پیدا سر ارکہانی پیدا سر انبر کا حصہ ہوگی۔

☆ مدیر گل تاذ الیا نوالہ سے شریک احوال ہیں۔ میرا نام مدیر گل ہے۔ میں نے یہ کہانی پچی
کہانی سے متاثر ہو کے لکھی ہے۔ برائے مہربانی شائع کر کے میری حوصلہ افزائی ضرور فرمائے گا۔

☆ مدیر گل! ہماری پوری کوشش ہو گی کہ تمہاری محنت رائیگاں نہ جائے۔ کا بہتر سے بہتر لکھنے کا
سلسلہ جاری رکھو۔

☆ ارشاد اقبال چوہان جڑا نوالہ سے شریک احوال ہیں۔ جناب ناصرضا صاحب السلام علیکم!
ایک ماہ کی غیر حاضری پر شرمندگی میں اضافہ آپ کی فون کال نے کر دیا۔ آپ کی محبوتوں کا زیر بار
ہو گیا ہوں، شکریہ۔ بھی تک کاغذی تاج محل کا منتظر ہوں؟ یہ مجرم صاحب کا اگر نمبر ہو تو تحریر فرمایا
دیں۔ گوجرد سے غلام مرتفعی صاحب تحریر کو پسند کرنے کا شکریہ دکبیر کا شمارہ بہت دری سے ملائے نہ
جانے کیوں؟ نعمان احمد آرائیں صاحب پہلے بھی کہانیاں میں کہانی، شعر احوال میں کوئی تحریر
نبھوانے کے لیے نوکن ضروری تھا۔ ناصرضا صاحب نے ختم کر دیا ہے۔ ان کا شکریہ محمد شاہد خان
صاحب کی محنت کے لیے دعا گو ہوں۔ دکبیر کا شمارے کا سرورق بہت خوبصورت ہے دیکھ کر پتہ چلا
کہ واقعی سردی آئی ہے۔ تاریخی کہانی نے بہت مزہ دیا، نمایاں شخصیات کا جواب بھیں اللہ کرے
فضل الہی ایوب صاحب جیسے لوگ سلامت رہیں۔ اللہ ان کو اجر عظیم دے۔ آئین، محمد سلیم اختر کی
بحث گزیدہ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ امتاس کی امانت تو اچھی ہے۔ جوانی اس سے بھی
انشاء اللہ اچھی ہو گی۔ اور جس کی جوانی اچھی ہو تو بڑھا کمال ہوتا ہے، خدار اُس کے صفات میں
اضافہ فرمادیں۔ آخر میں آپ کی محنت مندرجہ ذیل کے لیے دعا گو ہوں۔ تمام احوالوں کو سلام۔

☆ محترم بھائی ارشاد اقبال چوہان صاحب! زیر بار تو ہم بھی ہیں آپ کی محنت اور خلوص کے، یہ مجرم
صاحب کا کاغذی تاج محل، آپ کو ارسال کر دیا ہے۔ ان کا موبائل نمبر بھی آپ کو سینڈ کر رہا ہوں۔
آپ بہت مصروف رہتے ہیں لیکن احوال میں ایک اچھے تصریح کے ساتھ آپ کی آمد بھی ضروری
ہے۔

☆ نعمان احمد آرائیں جام شور سے شریک احوال ہو رہے ہیں۔ السلام علیکم! تازہ شمارے میں
احوال کی محفوظ اچھی ہے اور اسی کوئی بات نہیں جس پر کوئی تقید کی جائے۔ سب نے شمارے پر اچھا
تصریح کیا ہے۔ اس بار میں نے اپنے خط میں شہر کا نام لکھ دیا ہے۔ میں اپنے خط میں تقید کرتا ہوں یہ
تقید برائے تقید نہیں اور یہ ایک اچھے ایڈیٹر کی پیچان ہے کہ تعریف ہو یا تقید وہ کسی کے خط کو شامل
کرنے پر کوئی تدغی نہیں لگاتے، اور یہ آپ کی ایک اچھی مثال ہے کہ آپ نے میرے خط کو خود کو
اہل ادب ثابت کرنے کے لیے شامل نہیں کیا۔ آخر میں تمام احوالیوں، قارئین اور رائٹر کے لیے

اس ماہ کی چار بہترین تحریریں گونسی ہیں؟

آپ کی
نکلنیں

میری نظر میں مندرجہ ذیل تحریریں ترتیب وار انعامات کی مستحق ہیں۔

800 روپے	پہلا انعام
700 روپے	دوسرा انعام
600 روپے	تیسرا انعام
400 روپے	چوتھا انعام

اس انتخاب کا فیصلہ ہم اپنے قارئین کرام کو سونپ رہے ہیں۔ قارئین کی کثرت آراء سے منتخب ہونے والی اُن چار کہانیوں کے نتائج آئندہ شمارے میں شائع کئے جائیں گے اور انہی کے مطابق قلم کاروں کو انعامی رقم ارسال کر دی جائے گی۔ یہاں ہم ایک بار پھر یہ اعتراف کرتے ہیں کہ معاشرے کے عکاس قلم کاربے زبانوں کی زبان اور صداقت کے ترجمان ہوتے ہیں، ہم ان کا قرض انہیں کر سکتے تا ہم یہ انعامات صرف تکمیل فرض کی ایک چھوٹی سی کوشش ہے اور اس کا مقصد نئے قلم کاروں کی حوصلہ افزائی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ تکمیل فرض کی اس کوشش میں آپ مندرجہ ذیل ٹوکن بھر کر ہمارا تھوڑا بیٹھا کیں گے۔

10 یہ ٹوکن صرف جنوری 2018 کے لیے ہے؛ اس سے بھیجنے کی آخری تاریخ

مندرجہ بالا ٹوکن پر کرنے کے بعد کاش کر بیجی، سادہ کاغذ پر بھیجی جانے والی آراء شامل نہیں ہوں گی۔

سلامتی خوشحالی، تندرتی کی دعا اور جن کے عزیز واقارب اس دنیاۓ فانی سے پرداہ کرچکے ہیں ان سمجھی کے لیے دعائے مغفرت اور مجھے بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

۷۰ نعمان احمد آرائیں! مجھے آئندہ بھی ایک بہت اچھے تبصرے کے ساتھ آپ کی احوال میں آمد کا انتظار ہے گا۔ آپ کی زندگی اور صحت کے لیے بے شمار دعائیں۔

☆ حجاب فاطمہ حجاب کراچی سے احوال میں شریک ہو رہی ہیں۔ ناصر بھیا! السلام علیکم! اس سے پہلے تو تمام قارئین اور کچی کہانیاں کے تمام اراکین کو کچی اور کمی دعا میں بہت عرصہ بعد اپنے عزیز شمارے کی یادِ ستائی توہا کر سے التحاء کی کے نہیں شمارہ لادے اور یوں بہت عرصہ کے بعد اپنے پیارے ماہنامے کو دیکھ کے نہ پوچھئی کٹنی خوشی ہوئی ساتھ ہی خوشی مزید بڑھ گئی جب اپنے پیارے بھائی کو احوال میں دوبارہ پیالا (واحش رہے یہ پیالا وہ پایا نہیں جو ناشستہ میں تناول کیا گیا تھا یا ہاہا) خیرابھی تو لیٹ ہونے کے ڈر سے میل کر رہی ہوں اور شمارہ بھی زیرِ مطالعہ ہے اگر خاضری لگ لئی تو فسیب آوری ہو گئی اس بار ایک انتخاب اور ایک اپنی نظم ارسال کر رہی ہوں۔ انشاء اللہ اگلے ماہ بھر پور تبصرہ یک ساتھ آؤں گی زندگی زندگی تو.....

☆ حجاب فاطمہ حجاب! ایک عرصے بعد احوال میں تمہاری آمد پر جی خوش ہو گیا۔ دیکھو تمہاری حاضری لگ گئی ہے احوال کے رجڑ میں اب غیر حاضری نہیں ہوئی چاہیے۔ تمہاری زندگی صحت اور کامیابی کے لیے اس جہاں کی سب اچھی دعائیں۔

☆ ایم حسن نظماً قبولہ شریف سے شامل احوال ہو رہے ہیں۔ قابل قدر ناصر رضا جی! امید ہے آپ اور انسانِ کچی کہانیاں خیر خیریت سے ہوں گے۔ آپ کے حکم کی روشنی میں ایک تحریر حاضرِ خدمت سے۔ معیاری ہو اور پسند آئے تو کچی کہانیاں کے سنہری صفات کی زیست ضرور بنائے گا۔ میں تو ابھی طفل کتب ہوں۔ اور شایدِ جذبات اور الفاظ کے فن سے بھی نا آشنا آپ نے اس قابل سمجھا اور پذیراً دی جس کے لیے ہے حدِ مختار ہوں۔ گزارش ہے کہ مٹی پر آڑی ترقی کیلئے رکھیں کچنچنے سے تصویر بن جائے تو بندہ مصور نہیں کھلا سکتا۔ کہانی کے ہر کردار کے جذبات و احساسات اپنے اور پرہادی کرتے ہوئے لفظوں کو مختلف بیراگراف میں ڈھال کر صفحہ قرطاس پر کھینچنے والا ہی رائٹر کھلاتا ہے پھر وہ اپنے تجربے سے ہو اسے ہوا میں ہوا کھاد کھا سکتا ہے اور یہ نجات کرنے جان جو کھوں اور مختنوں کا کام ہے۔ میں اپنی اس محبت بھری کہانی کے ساتھ آپ بھی کوئے سال کی مبارکباد دے رہا ہوں۔ بہت سے چہروں کے جذبات کی عکاسی لفظوں کی ادائیگی کی ہے؟ اور میں اس میں کس حد تک کامیاب رہا؟ فیصلہ آپ پر محضر ہے۔ ساتھیوں! محبت بہتے ہوئے پانیوں کی طرح بے ثبات نہیں ہوتی اور نہ ہوا کی طرح اپنی نکشیں بدلتی ہے۔ وہ تو بہار میں ھلنے والے اس اولین ٹکونوں کی مانند ہوا کرتی ہے۔ جو بتا قیامتِ محجن دل میں مہکتا رہتا ہے۔ اپنی ابدی مہک سے دلوں میں چاہتوں کے پھول کھلاتا رہتا ہے، میرا پیغامِ محبت ہے ان ساتھیوں کے لیے جو ایک ہی جگہ انہا

وہ صد اعتماد کرتے ہوئے اسے اپنی منزل بھی لیتے ہیں اور دوسرے کسی کے جذبات اور سوچ کا ذرہ بھر احسان نہیں کرتے حالانکہ وہ بنا افہمار کے بھی آپ کو بے پناہ چاہتے، الفتوں اور محبوں سے پیش آتا ہے۔

لہجہ ایم حسن نظامی، احوال میں آپ کی آمد ہمارے لیے باعث سرست ہے۔ آپ اچھا لکھتے ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ بہت منفرد انداز میں لکھتے ہیں۔ آپ کی پہجت بھری کہانی بہت اچھی ہے اور اسی لیے ہم نے اسے ماہ مارچ 2018ء میں پچی کہانیاں کے محبت نامہ کے لیے ابھی سے منتخب کر کے رکھ لیا ہے۔ آئندہ بھی احوال میں آپ کی آمد اور خوبی کہانیوں کا انتظار رہے گا۔

☆ عمارہ عبید چیچ وطنی سے شریک احوال ہو رہی ہیں۔ انکل ناصر! احوال میں یہ میری پہلی حاضری ہے۔ امید ہے آپ سمیت محفل کے بھی لوگ میری حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ انکل میں پُر اسرار کہانیاں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ پچی کہانیاں کے سال میں تقریباً چار شمارے پُر اسرار ہوتے ہیں بھی وجہ ہے کہ پچی کہانیاں مجھے بہت پسند ہے۔ کہانیوں کے علاوہ اس کے سارے سلسلے اچھے ہیں خاص کر آپ کی ڈائری تو بہت ہی اچھی ہے۔ انکل میں ایک پُر اسرار کہانی لکھ رہی ہوں اگلے تھرے کے ساتھ بھتیجے دوں گی امید ہے فروری کے پُر اسرار نمبر میں شائع ہو جائے گی۔ معاشرے کی اجتماعی اصلاح کے لیے زندگی کے رنگ جیسی کہانیاں سودمند ثابت ہوں گی، وہ لوگ بہت عظیم ہوتے ہیں جو اپنی خوشیاں دوسروں کے لیے قربان کر دیتے ہیں۔ ریشم کے دھاگے یادگار خریر ہو گی۔ بخت گزیدہ بھی بہت اچھی گلی۔

☆ عمارہ عبید امحفل احوال میں دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید، آپ کی پُر اسرار کہانی کا انتظار ہے۔

☆ اسماع غفور چیچ وطنی سے شریک محفل ہو رہی ہیں۔ انکل ناصر اور تمام احوالی میر آزاد قبول فرمائیں۔ تین چار ماہ بعد آپ لوگوں سے ملاقات ہو رہی ہے۔ انکل آپ کا پیغام چاچ غفار مُصلل دیتے رہے، مگر کچھ گھریلو اور اسکول کی مصروفیات ایسی تھی کہ کوشش کے باوجود بھی نہ لکھ سکی۔ آپ کی محبت کو سلام شاید اس بار بھی آپ لوگوں سے ملاقات نہ ہو پا تی مگر بھائی نعمان احمد کے سوال کے جواب میں یہ سطریں لکھ رہی ہوں، قابلِ احترام بھائی نعمان میرا مقصد مردوں کی کردار کشی اور غیر ضروری تلقید نہیں تھا غیر ضروری تلقید وہ تکوار ہے جو سب سے پہلے خوبصورت تعلقات کا سر قلم کر دیتی ہے میں ممکن ہے کہ آپ حق پر ہوں، پر حقیقت کوں جھٹلا سکتا ہے چاروں طرف کے راستے بند ہوں تو تاریک گلیوں میں راستے کی تلاش عورت کی مجبوری بن جائی ہے اور حالات سے سمجھوئے کرنا ہی عورت کی مجبوری خبری، یقین نہ آئے تو صمیں خواجہ کی مسکراہٹ پڑھ لیں۔ عظیم مردوں کی بات کریں تو آن بھی بہت سے محمد بن قاسم ہمیں ملیں گے، قدریق کے لیے مہر پر ویز کی زندگی کے رنگ، کافی ہے۔ تفصیل میں نہیں جانا چاہتی صرف اتنا بتا دیں بھائی کہ جس طرح آپ اپنی مرخصی کی زندگی

گزارہ ہے یہ کیا آپ کی بہن کو بھی وہی زندگی گزارنے کا حق ہے؟ آپ کے جواب کی منتظر رہوں گی۔ بہن مریم شادی مبارک ہونے سفر کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔

اچھی ہیجی اسما غفور، احوال میں تمہاری آمد ہمارے لیے باعث صرفت ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کر تم آئندہ بھی اپنی آمد کا سلسلہ برقرار رکھو۔

☆ عبد الغفار عابد چیچہ طفی سے شریک مغلل ہو رہے ہیں محترم ناصر رضا اور عزیز بہن بھائیوں آپ سب کو میرا خلوص بھر کر اسلام اور دین پڑھیروں دعا میں ساتھیوں اسافی زندگی رشتوں سے بندھی ہے اور رشتوں کی ڈور رویوں سے بھی غور کیا ہم نے ہمارا دین پڑھیروں کے ساتھ کیسا ہے؟ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دوسروں سے ملنے میں تمام زندگی صرف ہو جاتی ہے اور خود سے بھی ایک بار بھی ملاقات نہیں ہو پاتی۔ یا سال شروع ہو رہا ہے آئیں عہد کریں دوسروں کی اصلاح سے چلے ہم اپنی اصلاح کریں گے اگر ہم انفرادی طور پر اپنی اصلاح کا تہیہ کر لیں تو پورے معاشرے کو شبتوں پر ڈال سکتے ہیں۔ باجی منزد کے ادارے نے پھر دکھی کر دیا ماؤں کے لخت جگر محفوظ اور پرانی پاکستان کے لیے اپنے ہوئے ہوئے عظیم تاریخِ الکرہ ہے یہ اس پر پوری قوم کو فخر ہے ان کی شہادتیں رائیگان نہیں جائیں گی۔ بھائی نعمان احمد یہ حقیقت ہے ہر سال ہزاروں کی تعداد میں ڈا جسٹ چھتے ہیں اور ہزاروں ابدی نیند کے حوالے ہو جاتے ہیں وجہ سفارش اور تعلقات ہوتی ہے۔ سچی کہانیاں سے رہانا لعلق ہے اس کی پالیسی میراث اور معیار کو برقرار رکھنا اور اس کا منشور مجتبیں تضمیں کرتا ہے، اصلی اور عقلی کی نیاز ہی ہم سب کا فرض ہے کیونکہ اس کی بقا ہمیں عزیز ہے۔ میری رائے غلط ہو سکتی ہے۔ پسر امام مہبل کی رائے کو کہے جھلائیں گے۔ بھائی ملازم حسین شیرازی شور کھلاڑی نہیں تماشائی کرتے ہیں آپ کے تبرے کی تعریف کے لیے میرے پاس لفظ نہیں ہے، دولت کی خاطر ہم اتنے گر کچھ ہیں کہ رشتوں کے تقدیس اور اخلاقیات کو بھول بیٹھے ہیں ہر کوئی دولت کے لائچ میں انداھا ہو چکا ہے لیکن یاد رہے دولت سے ہم گدے تو خرید سکتے ہیں نیند نہیں، عنک تو خریدی چاکتی ہے لیکن نظر نہیں، دولت سے ہم جسمانی راحت کا سامان تو خرید سکتے ہیں عرقی و روحانی سکون و اطمینان نہیں خرید سکتے۔ محترم سلیمان اختر نے اس موضوع پر بہت جاندار تحریر پر بخت گزیدہ، لامی اسی طرح مہر پر دیز نے اپنی تحریر زندگی کے رنگ، میں معاشرے کی اصلاح کرنے کی کوشش کی۔ اگر کچھ حاصل کرنا ہے یا کر کے دکھانا ہے تو ہم اپنا مقصد کا تعین کریں اور پھر خود کو اس کے حوالے کر دیں یہی تدریت کا عظیم منحوم ہے۔ مہر پر دیز نے اپنی تحریر میں انسانیت کو زندہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ م ن خ کی منزل نے بھی بہت ممتاز کیا۔ کسی کو بھولنا آسان نہیں ہوتا، بعض اوقات خود کو بھول کر کسی کو بھولنے کی کوشش کی جائے تو پہچتا ہے کہ اپنا آپ بھول گیا اور صرف کوئی اور اپنے آپ میں رہ گیا ہے۔ محمد سلیمان اختر صاحب نے ریڈ یوکی اہمیت پر روشنی ڈالی، بہت اچھا لگا۔ ذرا کچھ ابلاغ میں ریڈ یو ایسا نمیڈیم ہے جس کی اس جدید ترین دور میں اہمیت کم ہونے کی بجائے مزید بڑھی ہے کیونکہ یہ ایک

پُر اسرار کہانی نمبر

”بھی کہانیاں، کا شمارہ فروری 2018ء پُر اسرار کہانی نمبر ہوگا۔ اس یادگار نمبر میں نامور لکھاریوں کی ایسی کہانیاں شامل ہوں گی، جنہیں آپ عرصہ دراز تک فراموش نہیں کر سکیں گے۔

جناتی کہانیاں، ارواح کہانیاں، خوف اور دہشت سے بھری ڈراؤنی کہانیاں ہی اس پُر اسرار نمبر کا حصہ نہیں ہوں گی، روحانیت کے اسرار اور تصوف سے جڑی نہایت ہی اعلیٰ اور خصوصی کہانیاں بھی اس کا حصہ ہوں گی۔

ایجنت حضرات سے درخواست

برائے کرم اپنے آرڈر سے ادارہ سرکولیشن کو فوری طور پر آگاہ کریں

سمی ذریعہ معلومات ہے جو نظری کام سے توجہ ہٹائے بغیر سننے والے کو اپنی ثیث دینے میں مدد کرتا ہے، 1965ء کی جگہ میں ملک ترجم نور جہاں کا ہر گاہ رائیدیو کے ذریعے ہی فوجیوں نے سماں میں قابل ذکر اے پتھر ٹال تے نہیں وکدئے کرن شیبیر کی تحریر اندر ہیرے کا سفر کمال کی تحریر تھی دیتا میں آنے کا مقصد ہم بھول چکے ہیں۔ زندگی کا اصل مقصد اجتماعی سوچ ہے مگر ہم نے انفرادی سوچ سے اپنے لیے پریشانیاں پیدا کر لی ہیں ہمارے کردار دوسروں کے لیے عذاب بن رہے ہیں اس کی وجہ ہم میدان عرفات والا پیغام بھلا بیٹھے ہیں اندر ہیروں کو روشنی میں لانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم میدان عرفات والا سبق یاد کریں۔ ریشم کے دھانگے کی پہلی نقطہ پڑھ کر خوشی ہوئی امید ہے اس کی ہر نقطہ سپس سے بھر پور ہوگی۔ شازلی سعید مغل کی سلسلے وار تحریر امتاس بہت متاثر کر رہی ہے۔ اس پر یہی لکھا کافی ہے۔ چلتے ہوئے منزل کی بابت پوچھتے ہوئے نہیں بدگمان مت کرو یہ تو منزل پر پہنچ تکریبی معلوم ہو گا کہ ہم کہاں جانا چاہتے تھے۔ زین شمسی نے ایمان تازہ کر دیا، شیم احمد نے محمد ایوب فعل الہی سے ملاقات کرائی بہت اچھا لکھا۔ انعامی سلسلے سے پچی کہانیاں کی مقبولیت بڑھے گی، ناصر بھائی کی ڈاڑھی میں ہر کسی نے اچھا لکھا۔ انعامی سلسلے کے جو ناچیز کے نوٹے پھوٹے لفظوں اور بے ترتیب جملوں کو پسند کرتے ہیں اس یہ تو آپ کا بڑا پن ہے جو ناچیز کے نوٹے پھوٹے لفظوں اور بے ترتیب جملوں کو پسند کرتے ہیں اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گا اللہ ہم سب کو زندگی کی تمام خوشنوار سر میں ایمان اور صحت کے ساتھ عطا فرمائے آئیں۔

پھر بھائی عبدالغفار عابد! گھرائی اور گیرائی سے آراستہ آپ کا تبصرہ اچھا لگا..... آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ اور ہاں اس بار آپ کے خط میں کوئی شعر شامل نہیں..... حیرت ہوئی؟ سو اب ایک شعر میری طرف سے آپ کے لیے.....

بزم میں حشر اک پا ہے
کون آئینہ رکھ گیا ہے

☆ ڈاکٹر فرمان بھٹی، منڈی صادق گنج سے شریک احوال ہیں۔ ناصر انکل، سلام! اس پارشمارہ کافی دیر سے ملا پر جب ملا تو بھی گلہٹکوے دور ہو گئے، طویل کہانی نمبر زبردست رہا، مسکراہت بخت گزیدہ شاہ مراد کھڑکی میں رہی آکھے منزل، مقدور یوں را کہ ہوا آواز کی دنیا وہ کہانیاں ہیں جن کو میں نے بار بار پڑھا، دونوں نازل بھی خوب رہے، آپ کی ڈاڑھی جو کہ دراصل ہماری ڈاڑھی ہے کے تمام مراسلات اپنا ہائی نہیں رکھتے، خطوط کے بارے میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ کچھ لوگ انتشار پھیلاتے ہیں، مخفل کے ماحول کو خراب کرتے ہیں آپ اس چیز کا ذرا خیال رکھا کریں۔
پھر فرمان بھٹی صاحب! طویل کہانی نمبر آپ کو پسند آیا تھکریہ احوال میں خطوط کی اشاعت کے حوالے سے میں بس یہ خیال کرتا ہوں کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔
☆ بارش علی ثمیر چک جیوے والا سے شریک احوال ہو رہے ہیں۔ ناصر جی! آداب! پچی

କୁଣ୍ଡଳିରେ ପାଦମଧ୍ୟରେ ଏହାରେ କିମ୍ବା କିମ୍ବା କିମ୍ବା
କିମ୍ବା କିମ୍ବା କିମ୍ବା କିମ୍ବା କିମ୍ବା କିମ୍ବା କିମ୍ବା କିମ୍ବା

بچوں کو کوئی مسئلہ نہ ہو، کم از کم بچوں کے لیے چھت تو ہوئی چاہیے۔ عرض یہ ہے کہ جتنے صفات پر آپ مجھے حکم دیں گے میں کپوز کرو کر بھیج دیا کروں گا، اپنے مسائل اور مسائل کے پیش نظر میں پوری تحریر نہیں بھیج سکتا۔ اور آخر میں بس اتنا کہنا چاہوں گا کہ میں اس امر سے بخوبی واقف ہوں کہ میرے تصرے میں بہت سی کمی رہ گئی ہے لیکن آپ محبت کی نظر سے یہ کمی دور فرمائیں گے آپ کے ثابت جواب کا طالب ہوں۔

لہٰ مختار طاہر مقصود ہاشمی صاحب! آپ احوال میں آئے دل شاد اور آباد ہو گیا۔ سرور شاز عبد الحکیم ساجد اور باہر نایاب صاحب خود بہت اچھے ہیں، اس لیے دوسروں کی تعریف کرتے ہیں۔ آپ اپنے ناوی کی دو تین اقسام اتوار سال کریں۔ امتاس یاریشم کے دھاگے دونوں میں سے جس کا بھی پہلے اختتام ہو گا میں آپ کے ناوی کا آغاز کرنا چاہوں گا۔

☆ حسین خواجه محن آباد سے شریک احوال ہو رہے ہیں۔ ناصر رضا صاحب! السلام علیکم!
جناب عالی! اس بار شارہ چھ تاریخ کو ملا سب سے پہلے تو میری کہانی کی اشاعت کے لیے آپ کا بہت شکریہ یہ سب آپ ہی کی محبت ہے ورنہ میں اس قابل کہاں رب کریم آپ کو سلامت رکھے تا قیامت رکھے آمین تم آمین۔ ناصر صاحب آپ نے دونے سلسلے شروع کیے ہیں جو کہ لا جواب ہیں اور ہو بھی کیوں نا آخر یا کمال رائٹرز نے قلم بند کیے ہیں مختار مردو شانے سب یعنی صاحبہ ایک مشہور نام ہے اور بہن شازی سعید غنی صاحبہ اپنا کوئی ہاتھ نہیں رکھتیں اب سمجھ آیا جن لوگوں کے نام میں ش، آتا ہے وہ باکمال ہوتے ہیں جبھی تو دونوں سلسلے ش، نام سے شروع ہوئے ہیں رب کریم مزید ترقی عطا فرمائے آمین، اچھا جی اب آتے ہیں اس ماہ کی شاندار و جاندار کہانیوں کی طرف تو جی پہلی کہانی ہے بہن رئیس خالد کی ٹھکری میں رکھی آگھے جو کہ ماہ دسمبر کی خصوصی کہانی ہونے کے ساتھ ساتھ لا جواب بھی تھی، بہن اتنی اچھی کہانی لکھنے پر بہت بہت مبارکباد جناب سلیمان اختر صاحب کی بخت گزیدہ بہت اعلیٰ بہن کرن شیر صاحبہ اندھیرے کا سفر اچھی کا دوش تھی۔ بہن حنا بشری کی تحریر مقدار یوں را کہ ہوا سو میں سے سو بھر کی حقارہ رہی۔ آپ کی ڈاڑی میں تمام انتخاب پسند آئے۔ عورت کے نام سے میں نے اپنی سوچ قلم بند کی تھی، جس کو آپ نے جگہ عنایت فرمائی، شکریہ احوال کی محفل میں بھی بہت اچھا لکھتے ہیں، میرے علاوہ نعمان احمد شروعات آپ نے علی النصاری سے کی ہے اور کہا ہے کہ ہائیڈ پارک ہو یا آپ کی ڈاڑی ایک ہی بات ہے یہ سوچ کے دو الگ انداز ہیں۔ میں اس پر بس اتنا کہنا چاہوں گا اگر تم نے شمارے پر تصریح کیا ہوتا تو زیادہ اچھا ہوتا اب اگر تم کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی تو اس میں بھلامیرا کیا تصور ہے؟
لہٰ بھائی حسین خواجه! آپ کتنے قابل ہیں شاید آپ کو اندازہ نہیں ہے..... آئندہ بھی آپ کی کہانیوں کا انتظار رہے گا۔

اور اب اجازت سے پہلے نئے سال کی آمد اور بیتے ہوئے برس کے حوالے سے نوجوان شاعر

اشعر جواد کی ایک دل سے مکالمہ کرتی تھم آپ کی بصارتوں کے رزق کی صورت میں ہے۔

بیتے برس کا نوحہ

اب کہاں اتنی فرست کہ

بیتے برس کا نوحہ لکھوں!

دل کرفتہ حادثوں کے

تلسل کو میں

ماضی کا سامنہ لکھوں

گزشتہ تھی ایام کو

مقدار کا جام جم لکھوں

اب کہاں وہ حوصلے کہ

مجروح آنا کی تیر گیوں میں

دل جب سوختہ ہوا تو

کتنے ستارے آنسو

کی صورت بکھر گئے

خواب کتنے چیز گئے

کتنے مہرباں

اس نزع میں

بٹ گئے

مرے غم خوار کتنے

ان پر پیچ را ہوں سے

ہٹ گئے

گر میں

ذات کی تمام سچائیوں کے ساتھ

اپنی جگہ ابھی تو

استقامت پذیر ہوں

اس انتظار میں کہ

بھی جو فرست ملے تو

میں بیتے ڈوں بیتے برس کا

نوحہ لکھوں!

پھر طیں گے کر خدا لایا

ناصر رضا

تاریخ کے جھروکوں سے جھاگٹی علم سے آپ دلیک زندہ تیری

دھرم حضرت کا خال

(حصہ اول)

حضرت مہمانی کا خال

اے زہ عشق تیری ہدایت کے واسطے
سوناتے عشق لارہے ہیں کوئے ہتاں سے ہم

گ-ن-خ

”دیکھو وہ سامنے کوہ سینا جسے کوہ طور بھی کہتے ابراہیم بن کالب نے بلند ترین چوٹی کی طرف اشارہ ہیں۔“ لاوی بن یعقوب کے خاندان کے موزع عالم کرتے ہوئے اپنے چھوٹے بھائی ایش بن کالب



میں وہ سب کچھ مانگنا چاہتا ہوں جس کی مجھے آرزو ہے۔ ”ابراہیم بن کالب نے اپنے اندر مغلق ہوئی تمثیلوں کو محوس کیا۔ شاید وہ فیصلہ کر رہا تھا کہ کپلے کیا مانگئے، منصب یا اولاد؟“

وہ دونوں بھائی تھے مگر ان کی معمولی میں بہت فرق تھا۔ ابراہیم بن کالب کی عمر پینتیس سال تکی اور ایش بن کالب کی عمر میں سال مگر عمروں کے اس فرق کو نظر انداز کر کے ان دونوں میں بھائیوں والی چاہت بھی تھی۔ باب میتے والا حرام بھی اور دوستوں والا پار بھی۔ بات الفع کی ہوتی یا نقصان کی خوشی کی ہوتی یا کسی کی وہ ایک دوسرے سے ہی کرتے تھے اسی لیے ایش بن کالب ان محرومیوں سے بھی واقف تھا جن کا اس نے بھی اٹھا رکھیں کیا تھا۔ ابراہیم بن کالب لاوی بن یعقوب کے خاندانی رواج کے مطابق خود کو علم کے لیے وقف کر چکا تھا اور ایش بن کالب ایک تاجر تھا اسی لیے اس بارگوہ سینا کی طرف سفر کرتے ہوئے ابراہیم نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ یہاں قیام کر کے مرادیں مانگ کر انہیں واپس ہونا تھا اور تحرارت بھی واپسی میں ہی کرنا تھی۔

بیت المقدس کی غیر تعمیر کے بعد اس قوم نے اسے اپنی تہذیب کا مرکز بنایا تھا اور اس مقدس گھر کی کہانت کے لیے ایک باقاعدہ نظام قائم ہو چکا تھا۔ یوسا مسیح بالرغم قابل میں نشتمان تھے جن میں گیراء و قیلے زندگی کے لاتقداد شعبوں میں دیگر امور کی انجام دہی کے لیے مخصوص تھے لیکن ”بنی لاوی“ صرف اور صرف بیت المقدس کی کہانت کا ذمہ دار تھا۔ یہ لاوی بن یعقوب کا خاندان تھا۔ ابتداء سے اس مقدس گھر کا کاہن صرف اسی خاندان سے چنانجاہا تھا جو تمام مذہبی رسمیں ادا کرتا تھا، قوم کو راہی سے روک کر تکلی کی طرف راغب کرتا، مذہبی معاملات کی گمراہی، وقف پجوں کی برداشت، مقدموں کے فیضے ناتا، انصاف کرتا، بیت المقدس کے خاص حصے میں جا کر بخور جلاتا اور دعا ایں کرتا۔ الغرض اس کی حیثیت ایک قاضی یا ماجی کی سی ہوتی یا ایک بارپا اور تکہباں کی۔

بیوسر ایش بن کاہن پر انہا اعتماد کرتے تھے

سے کہا۔ ”یہی وہ بلند ترین پہاڑ ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خدا نے اپنی شریعت عطا کرنے کے لیے طلب کیا تھا۔ میں جب کپلی بار بابا جان کے ساتھ یہاں آپا تھا، جب بھی اس پہاڑ کے بالائی حصے کو بادلوں نے پوچھی ڈھکا ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ بابا جان نے اپنے بزرگوں سے اور انہوں نے اپنے بزرگوں سے بھی سنا ہے کہ اس پہاڑ کی چوٹی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چل کیا تھا۔ بتیں وہ اپنے خدا سے خدا نے اپنا جلوہ دکھایا مگر وہ بے ہوش ہو کر گر گئے تھے اور وہی حصہ مسئلہ بادلوں میں چھپا رہتا ہے۔“ ابراہیم بن کالب نے یہ سب ایک ہی سانس میں خوشی سے رُکش آواز میں یوں کہا جیسے یہاں آنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہو اور اس وقت وہی نہیں بلکہ خود ایش بن کالب بھی بڑی حیرت، عقیدت اور خوشی سے اس پہاڑ کو دیکھ رہا تھا جس سے ہزاروں داستانیں وابستہ تھیں۔ ابراہیم بن کالب نے دھیرے سے اعتراض کے انداز میں کہا۔

”ایش، میرے بھائی! تمہارے ساتھ اتنا طویل سفر کرنے کے لیے میں رضا مند ہی اس لیے ہو اتھا کہ تم اس طرف سفر کر رہے ہے تھے ورنہ یوں مسئلہ سفر کرنا آسان بات نہیں ہے۔“

اس وقت ایش بن کالب نے اسے تائیدی نظر دیں و دیکھا۔ ان دونوں نے بہت کم قیام کے بغیر یہ سفر کیا تھا۔ اس پہاڑ کے دامن میں ایک رات گزارنے کی تمنا سے بھی تھی لیکن ابراہیم کے دل میں مچھلے والی تمنا کو وہ بہت حد تک جانتا تھا اور اسی وقت خود ابراہیم نے بھی دھیرے سے کہا۔

”مجھے معلوم ہے یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رتب سے جو مانگو وہ ضرور ملتا ہے۔“ اس کے لمحے میں عجیب اشتیاق تھا، عجیب آس تھی۔ ایش بن کالب محسوس کیے بغیر نہ رہا۔ اس نے کہا۔

”موسیٰ کے رتب سے جہاں بھی مانگو وہ ضرور دیتا ہے۔“

”مگر میرا اعتقد جگہ پر بھی ہے اور آج کی رات

یہاں تک کہ بادشاہ وقت بھی اس کی تعظیم کرتا تھا۔ اس ساری خدمت کے بدلے میں یہ کہاں ان سے کچھ بھی نہ لیتا بلکہ اپنی روزی خود کماٹا، ساری قوم سے زیادہ سادہ زندگی گزارتا۔ قوم اس منصب اور عہدے کے لیے بنی لاوی کے جلیل القدر علماء کو منتخب کر کے ان میں سے ایک کو پختے کے لیے باقاعدہ قرآندازی کرتی۔ اس وقت تمام علماء موجود ہوتے، جس کے نام قرعہ نکل آتا، اسے اپنا کامن مان لیتے۔ ایسے میں بنی لاوی کا ہر جوان زیادہ سے زیادہ علم حاصل کر کے خود کو اعلیٰ ترین ثابت کرنا چاہتا تھا اور جو خود یہ منصب نہ پائتا، اپنے بیٹوں کے لیے کوشش رہتا۔ اس زمانے میں بنی لاوی کے خاندان کا بڑا بیٹا خود کو حصول علم کے لیے وقف کر دیتا تھا تاکہ یہ منصب پا سکے اور ابراہیم بن کاپ بھی اس خواہش سے بے نیاز نہیں تھا۔ بیت المقدس کا کہاں بننا معمولی بات نہ بھی مگر وہ بنی لاوی کے علماء میں سب سے کم عمر سمجھا جاتا تھا لہذا اس کے کا، بنی شیخ کی امید لوگوں کو بہت کم تھی پھر بھی اس رسم کی ادائیگی سے پہلے ان دونوں کو وابس بیت المقدس چینچت کی آرزو بھی مگر چونکہ ان کے پاس وقت کی فراہد ایسی تھی، وہ با آسانی اس تجارتی سفر سے واپس جا کر اس رسم میں شریک ہو سکتے تھے۔

ان دونوں کا ایک ہی گھر تھا اور لگتا تھا کہ ان دونوں کی بے پناہ چاہتیں ان کی بیویوں میں بھی خلل ہو گئی تھی۔ ابراہیم بن کاپ کی بیوی حسنہ اولاد کے سوا ہر نسبت سے مالا مال تھی۔ اپنی تیس سالہ زندگی کا بڑھ لمحہ اس نے خوش رہنے اور خوش رکھنے میں گزارا تھا۔ گھر میں ہوتی یا بابت المقدس جاتی، دوسروں کے لیے ہی طلب کرنی لیکن ان سب اوصاف کے باوجود تھبائیوں کے لمحوں میں کسی شفے سے وجود کی تمنا پر قابو نہ پا سکتی۔ یوں برسوں گزر گئے جب ایش بن کاپ کی تو عمر بیوی زیخار نے تھکتے ہوئے لاثان بن ایش کو اس کی گود میں ڈالا تو اسے لگا کہ یہ کبی پوری ہو گئی ہے۔ اب لاثان اس کا تھا اور جب موتی کے رتب نے ایش اور زیخار کو ایک اور بیٹے ہماران سے نوازا تو ان کا خلق پچھے اور مضبوط ہو گیا۔

ذعاع کے الفاظ ادا ہوتے رہے، آنسو پہنچ رہے، وہ گز گز اترہا، مانگتا رہا اور بادلوں میں جھپی ہوئی چوپی پر خدا کے موجود ہونے کا احساس اسے دیوانہ بناتا رہا۔ لتنی دیر گر ری اسے اندازہ ہی نہ ہوا، ہاں بہت دری بعد قلب کی طہانتی نے اسے یقین دلا دیا کہ موتی کے رتب نے گزارش سن لی، الجا قبول کر لی، تب اس نے زمین پر اپنا سر رکھ دیا۔ دوسروے دن اس نے کہا۔ ”ایش میرے بھائی! میرا دل گواہی دیتا ہے کہ موتی کے رتب نے میری گزارشیں سن لیں۔ قبولیت ذعاع کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ قلب پر ٹکون طاری ہو جاتا ہے جس کا احساس مجھے پہلی بار ہوا

ہے۔

موقع پر اپنے تجارتی سفر سے لوٹنے والے ابراہیم بن کالب سے سب ہی واقعہ تھے اور اس کی علمی حیثیت بھی جانتے تھے الہذا انہیں دیکھتے ہی ایک شور پا ہو گیا۔ کوئی بولا۔

”ارے ابراہیم بن کالب مجھی تو حافظ تو ریت اور عالم ہے۔ لکھوں کرم ہے۔“

”ہاں ہاں نعمتی پوری کرنے کے لیے شامل کرنے میں کیا حرج ہے؟“ کسی نے چلا کر کہا۔ ہر طرف شور پا تھا اور اصل صورت حال سے تا واقعہ یہ دونوں بھائی حیران تھے۔ اسی وقت کسی نے آزار لگائی۔

”بنی لاوی کے خاندان کا ہے عالم تو ریت ہے تو دیکھ سپاٹ کی چلو قرعد اندازی شروع کرو۔“ یہ سکھتے کہتے کچھ لوگ قریب آئے اور گھوڑے سے اترتے ہوئے ابراہیم بن کالب کو بیت المقدس کی طرف لے جانے لگے۔ لوگ ابھی تک چیزوں کی رہتے تھے۔

”دیکھو آج صبح سے ہم لوگ بارہ ہویں عالم کے لیے پریشان تھے اور وہ اتنے طویل سفر سے آنے والا تھا۔“

اب ابراہیم بن کالب کے قلب پر وہی دعا و الیمانیت عود کر آئی ہی۔ سب جوتے اتارا تار کر بیت المقدس میں داخل ہونے لگے۔ بیت المقدس کے اندر کا نظارہ آج پکھا اور تھا۔ پانی سے بھرا ہوا طشت اس گھر کے مقدس صحن میں رکھا ہوا تھا۔ اس کے کرد خاندان بنی لاوی کے معززین ہیرابنا کھڑے تھے دوسرا بڑا گھیرا بیت المقدس کے باقی خدمت گار اور صلبوں کا تھا پھر دوسرا قبائل کے معززین کا نمبر تھا۔ یہ گھیرا قدر سے بڑا تھا اور تیرا باقی قبائل کے معززین کا تھا اور پھر بیت المقدس کے دیگر خدمت گز ازوں کا جن کی اہمیت عام لوگوں سے تو زیادہ تھی گران معززین سے کم گھی الہذا اسی ترتیب سے سب کو مقام ملے تھے۔ ان سب کے علاوہ لوگوں کا بہت بڑا ہجوم تھا جو اپنے جوتو بابر اتار کر اندر آگئے تھے اور جو اندر نہ آسکے تھے باہر ہی سے نیجوں دیکھنے کے

”موسیٰ کا تب آپ کو ہر بعثت عطا فرمائے۔“ ایش بن کالب نے کہا۔ ”اب ہم واپسی کا سفر شروع کر سکتے ہیں۔“

”لے بٹک بے بٹک، ہمارے پاس وقت کی قلت نہیں ہے لیکن غیر ضروری دیر کرنا بھی مناسب نہیں ہے۔“

دونوں بھائیوں نے پادلوں میں چھے ہوئے پہاڑ پر آخری نظر ڈالی اور واپسی کے لیے ھوڑے موڑ لیے۔ اس وقت ان کی گفتگو کا موضوع بیت المقدس اور قرعد اندازی کی رسم گی۔

بیت المقدس میں عام قرعد اندازی کا طریقہ تو یہ تھا کہ جو معاملہ طے نہ پاتا، تو ریت لکھنے والے عام مصلی اپنے اپنے قلم بانی سے بھرے ہوئے طشت میں ڈال دیتے۔ جس کا قلم بھی پانی پر تیر جاتا، اس معاملے کو وہی طے کرتا اور سب اس قیطی کو مان لیتے لیکن کہانت کا فیصلہ اور کاہن کا انتخاب کوئی عام بات نہ تھی۔ ایسے میں خاندان بنی لاوی کے عالموں اور تو ریت مقدس کے حافظوں کو مدد یا کام جاتا جن کی تعداد بارہ ہوئی ضروری تھی۔ بنی اسرائیل کے لیے متوں بارہ کے عدد کی بڑی اہمیت رہی۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ فرزند تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا مارنے سے بارہ پیشے پھوٹے جنہیں بارہ قبیلوں نے اپنی اپنی ملکیت بنا لیا اور آگے چل کر وہی اس قوم کی پہچان بن گئے۔ دن کے بارہ کھنکھنے تھے رات کے بارہ ہنخنے اور سال کے بارہ ماہ تھے اور اب بھی بنو اسرائیل کے بارہ ہی قبیلے تھے جن میں گیارہ بیت المقدس کے دیگر تمام امور کے گمراں اور بارہ ہوں بنی لاوی کہانت کے لیے مخصوص تھا اور ان کے بھی چیدہ چیدہ صرف بارہ علماء کو دعوت دی جاتی تھی جس کے لیے یہ خاندان برسوں منت کرتا تھا۔

اس بارہ قرعد اندازی کے لیے دعوت دی گئی تو صرف گیارہ عالم ہی جمع ہو سکے۔ اب ایک اور کی تلاش تھی اور یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ اسی دن اسی

تمنائی تھے۔ جنہیں اندر کا منظر نظر نہیں آ رہا تھا، وہ آوازوں سے اندازہ کر رہے تھے۔ اس وقت اندر کا منظر عجیب تھا۔ پانی سے بھرا ہوا طشت درمیان میں رکھا ہوا تھا۔ سب کی نظریں اس پر مرکوز تھیں۔ پانی کی حرکت کم ہوتے ہوتے ساکن ہو جاتی، تب کارروائی شروع کی جاتی۔ لوگ انتظار کر رہے تھے اور ابراہیم بن کالب اس صورت حال سے حیرت زدہ سا ہورہا تھا۔ دعائیں اتنی جلد اڑ دکھائیں گی اسے یقین تو تھا مگر خود رہاں کا تحریر بھی بار ہورہا تھا۔ اسے لگا، ہونٹ بار بار خشک ہو رہے ہیں جنہیں زبان پھیر پھیر کر ترکنا ضروری تھا۔ بھی اسے لگتا، کوئی اندر سے کہہ رہا ہے۔ ابراہیم بن کالب، تم تو صرف عالم کی تکنی پوری کرنے کے لیے لائے گئے ہو پھر حلیل دیئے جاؤ گے۔ کاہن تو نہ جانے کوں بننے والا ہے؟ اس کے ساتھ ہی اسے لگتا، کوئی اندر سے ہی اطمینان دلا رہا۔ کیا تم بھول گئے کہ خاندان بنی لاوی کے لادھاد اور جوان بھی صاحب علم ہیں اور یہاں موجود تھے مگر موئی کا رتبہ ہی تم کو طویل سفر سے یہاں لایا اور تم اندر بیک آ گئے۔ ابھی اسید و نیم کی یہ کیفیت جاری ہی کہ دیکھتے ہی دیکھتے طشت کا پانی ساکن ہو گیا، تب بوڑھے مجاہر نے آواز بلند کی اور چلا کر بولا۔

”بیت المقدس کے ظفیم کام کا، ہن ابراہیم بن کالب۔“
”دیکن نام پکارا جاتا رہا۔ جو لوگ خوش نہیں تھے وہ صرف ناکام ہونے والے تھے۔ اے میں کامیاب ہونے والوں کے شور میں وہ بھی گم ہو کر رہ گئے اور صرف ایک ہی نام لیا جا پڑا تھا جسے سن کر ابراہیم بن کالب کا یقین دعاوں کی قبولیت پر بدھتا جا رہا تھا۔ وہ ول ہی ول میں رتب کا ہمدرد آدا کر رہا تھا۔ اے بیت المقدس کا کام، ہن خبی کریں گیا تھا۔ اب لوگ اسی وقت حلف و فاداری چاہتے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے محن کا منظر بدل گیا پانی کے طشت کے ہٹاتے ہی چاروں طرف گیرا ڈال کر کھڑے ہونے والے سرک سرک کر محن کی دیوار کے ساتھ کھڑے ہونے لگے تاکہ وفاداری کا حلف اٹھاتے ہوئے عام کو دیکھاوسن سکیں۔ اس وقت حلف لینے والے حلیل القدر عالم اور یہ اقرار سننے والے لاتعداد افراد موجود تھے۔ ابراہیم بن کالب کو ان سب کی موجودگی میں وہ قسم کھاتی تھی جس پر ایک کام کی حیثیت سے عمر پر عمل کرنا تھا۔ چند لمحے وہ خود کو سنبھالتا رہا۔ اس دوران کی عالم نے جا کر بیت المقدس کے خاص حصے میں بخوبی جلا یا جس کی خوبی سے محن مہک

تمنائی تھے۔ جنہیں اندر کا منظر نظر نہیں آ رہا تھا، وہ آوازوں سے اندازہ کر رہے تھے۔ اس وقت اندر کا منظر عجیب تھا۔ پانی سے بھرا ہوا طشت درمیان میں رکھا ہوا تھا۔ سب کی نظریں اس پر مرکوز تھیں۔ پانی کی حرکت کم ہوتے ہوتے ساکن ہو جاتی، تب کارروائی شروع کی جاتی۔ لوگ انتظار کر رہے تھے اور ابراہیم بن کالب اس صورت حال سے حیرت زدہ سا ہورہا تھا۔ دعائیں اتنی جلد اڑ دکھائیں گی اسے یقین تو تھا مگر خود رہاں کا تحریر بھی بار ہورہا تھا۔ اسے لگا، ہونٹ بار بار خشک ہو رہے ہیں جنہیں زبان پھیر پھیر کر ترکنا ضروری تھا۔ بھی اسے لگتا، کوئی اندر سے کہہ رہا ہے۔ ابراہیم بن کالب، تم تو صرف عالم کی تکنی پوری کرنے کے لیے لائے گئے ہو پھر حلیل دیئے جاؤ گے۔ کاہن تو نہ جانے کوں بننے والا ہے؟ اس کے ساتھ ہی اسے لگتا، کوئی اندر سے ہی اطمینان دلا رہا۔ کیا تم بھول گئے کہ خاندان بنی لاوی کے لادھاد اور جوان بھی صاحب علم ہیں اور یہاں موجود تھے مگر موئی کا رتبہ ہی تم کو طویل سفر سے یہاں لایا اور تم اندر بیک آ گئے۔ ابھی اسید و نیم کی یہ کیفیت جاری ہی کہ دیکھتے ہی دیکھتے طشت کا پانی ساکن ہو گیا، تب بوڑھے مجاہر نے آواز بلند کی اور چلا کر بولا۔

”خاندان بنی لاوی کے معزز عالمو.....! اپنے قلم آہنگی سے پانی میں ڈال دو۔“ یہ آواز سنتے ہی ان بارہ عالموں نے اپنے قلم اس پانی میں ڈال دیئے۔ اس وقت بیت المقدس میں موجود ہر فرد کی نظریں اس طشت پر مرکوز تھیں اور سب علماء کے قلم تیزی سے چکر کھارے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کوئی بھی قلم پانی کی سطح میں جا کر سی بھی عالم کو مایوس کر دیتا اور قلموں کی تعداد گھٹ جاتی۔ یوں تعداد سختی رہی، ایک دو تین چار اور دیکھنے والے محدود ہی رہے۔ سب عالم پلکیں جھپٹائے بنا پانی کو دکھر رہے تھے یا قلموں کو دیکھ رہے تھے یا پھر ان کی نظریں محض اس قلم کے لیے بے چین تھیں جو واحد تیرتا ہوا رہ جاتا اور اس حلیل القدر منصب کا اعلان کر

بنی لاوی کا ہر مرد عمر بھر محنت کرتا تھا، تمبا کرتا تھا مگر محروم رہ جاتا تھا کیونکہ یہ منصب صرف ایک کو ملتا تھا۔ باقی محنت کرنے والے دیکھتے رہ جاتے تھے۔ منصب سے ناموری اور اعزاز ملتی ہے۔ دنیا کی نظر اسی پر ہوئی ہے۔ اس میں نہیں آزمائشوں اور قتوں کا احساس ان سے گزرے بغیر کسی کو نہیں ہوتا۔ ان دونوں کے گھر تک پہنچنے سے قبل یہ خیر علاقے بھر میں عام ہو چکی تھی اور انہیں یقین تھا کہ حسنہ اور زیست دوسری مجزز عورتوں کی طرح گھر سے باہر آتی انہیں مبارک بادیں گی لیکن وہ کہیں بھی نظر نہ آئیں اور دلوں کے اندر نہیں دلوں میں چھپائے ارادہ دپن ظریں ذاتی دہ دلوں گھر تک پہنچنے۔ اپنے گھوڑے اور دیگر اشیاء غلام کے حوالے کر کے وہ دلوں بڑا احاطہ پار کر کے گھر میں داخل ہوئے تو دروازے پر خدمت گار لوڈی کے ساتھ صرف زیستا نے لوبان جلا کر اس کا استقبال کیا اور بولی۔

”زیستا بیت المقدس کے عظیم کا ہن کو سلام پیش کرتی ہے اور مبارک بادیتی ہے۔“

اس کے جواب میں ابراہیم نے بڑے مضطرب سے انداز میں ان کے سر پر ہاتھ رکھا، دعا دی۔ لوڈی کو بھی دعا دی۔ حسنہ کی غیر موجودی ان دونوں کو متعدد کر رہی تھی۔ ایش بن کالب نے کہا۔

”کیا یہ سلام اور مبارک باد مجزز کا ہن کی زوجہ کو پیش کرنا نہیں چاہیے تھا؟“

یہ سوال تھا، استفارا یا اپنے اخ्तرا ب کا اظہار، جو بھی تھا زیستا نے اسے عسوں کیا اور بولی۔

”یقیناً انہیں یہاں موجود ہوتا چاہیے تھا لیکن علاقے کے معراجیم نے انہیں چلے پھر نے سے منع کیا ہے۔ موٹی کا رب مجزز کا ہن کو کہانت کے بلند مرتبے کے ساتھ اولاد کی نعمت بھی عطا کرنا چاہتا ہے۔“

اس وقت ایش بن کالب نے جبرت اور سرست سے دیکھا اور ابراہیم بن کالب کو لگا کہ ہر طرف کھٹاں بچ رہی ہیں رُگ رُگ میں منی سی دوڑ رہی ہے۔ مگر قدر مالی مسیوں کے بعد اکرم نبی مصطفیٰ کے لیے

گیا۔ اسی جگہ ایک بڑے طاق میں ایک فرشتے کا مجسمہ اپنے ہاتھ میں موم تی لے کر رہا تھا۔ اس موم تی کو نئے کاہن نے خود جلا کر موٹی کے ترب سے قنم کھائی اور اب اسے یہاں موجود سب لوگوں سے عہد کرنا تھا۔

یہ رسم بڑی مقدس تصور کی جاتی تھی اور اس وقت بھی سب بڑے شوق اور عقیدت سے دیکھ رہے تھے۔ ابراہیم بن کالب نے اس موم تی کو روشن کیا۔ اس وقت بیت المقدس کی مجزز عورتوں میں مبارک بادی کا گیت گانے لگتیں۔ کچھ نے اپنے ہاتھوں میں اگر بیان لی ہوئی تھیں اور حلقہ لینے والے عالم تیری سے اس خاص حصے کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں فرشتے کے سفید پیکر کے ہاتھ میں موم تی اور بخور کی خوبصوری چلی رہی تھی۔ یہ عالم ابراہیم بن کالب کے دامیں اور باریں اور عقب میں کھڑے ہو گئے تب اس نے اس مقدس گھن میں جمع سب کو دیکھا اور مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

”محترم و بزرگ علام! آپ سب کی موجودگی میں موٹی کے کرب نے جس طرح مجھے یہ منصب سونپا، آپ سب گواہ ہیں۔ بلکہ اس مجزز خاندان میں سب ہی مجھ سے زیادہ قابل اور عالم ہیں مگر موٹی کے رب نے میرا انتخاب کیا ہے تو میں اسی جیلی القدر رب کی قلم کھا کر، آپ سب کو گواہ ہنا کر عہد کرتا ہوں کہ بیت المقدس کے کاہن ہونے کا پورا پورا حق ادا کروں گا۔ میں آپ سب کی زندگیوں کو اتنی زندگی پر، آپ سب کے لئے کو اپنے نفع پر آپ سب کے حقوق کو اپنے حقوق پر ترجیح دوں گا۔ میں حضرت موئی علیہ السلام کے تمام احکامات پر عمل کروں گا اور آپ سب کو بھی اسی کی ہدایت دوں گا۔“

.....
اس پار گھر کی طرف جاتے ہوئے ابراہیم کی کچھ عیب کیفیت تھی۔ بلکہ وہ صرف خاندان میں لاوی کا ایک صاحب علم جوان تھا لیکن اب ایک دم سے ہی بیت المقدس کا وہ عظیم کاہن بن ہیں گیا تھا جسے پادشاہ بھی سلام کرتا تھا۔ یہ وہ بلند ترین منصب قماں کے لیے

گئی تھی۔ اس دن اپنی خواب گاہ میں جانا اے عجیب کے بارے میں اس عالم نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ بس اب وہ بے چینی سے اولاد کا منتظر تھا اور وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ وقت کا انتظار کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ اس کے جلو میں کیا، کیا آئے والا ہے؟ اسے کبھی اندازہ نہ تھا۔

سب ہی مگن تھے سب ہی خوش تھے۔ لاثان اور پاران خاندان نبی لاوی کے دو بیٹے ان کی توجہ کا اور تیرا آئے والا ان کے انتظار کا مرکز تھا۔ وہ جو بھی تھا، پیتا یا بیٹی، یقیناً اس گھر کو خوشیوں سے بھر دینے والا تھا۔ وہ سب جب ساتھ ساتھ ہوتے، یہی موضوع چھڑ جاتا۔ ایش بن کا لب کھتا۔ اگر مقدس کا ہن کو موٹی کے رتب نے بیٹا عطا کیا تو ہم اس کا نام "یعقوب" رکھیں گے۔

ایسے میں زیجاہتی۔ اگر بھی ہوئی تو میں اس کا نام "حوا" رکھوں گی۔ "حوا" کے معنی ہیں "خواہش" تمنا، آرزو۔ اس وقت سب بس دیتے۔ نام بھی عجیب تھا اور معنی بھی عجیب۔ یہ سب باش خوشیوں کا اظہار کرتیں۔ وہ سب ہی بے چین سے انتظار کر رہے تھے۔ وقت گزرا اور بیت المقدس کے کا ہن کوئی مصروفیت دے گیا۔ اب اس کا زیادہ وقت اس مقدس گھر میں گزرنے لگا اور ایش بن کا لب ایک طویل سفر کے بعد آرام کر کے ٹھکن اترنے میں صرف تھا۔

ایسے میں ہوم منے اپنے انداز بدالے۔ کی پر خونگوار اڑالا، کسی کو لپیٹ میں لے لیا۔ ایسے میں کسی نے محسوس بھی نہ کیا جب ابھی ذات سے بے نیاز ہو کر کام کرنے والی زیجاہ کو ٹھنڈگی میں۔ بات تو کچھ بھی نہ تھی، موسیٰ اپنا اثر دکھارا باتھا۔ لوگ نزدِ بخارا شکار ہو رہے تھے لیکن اس بار مرض کی نویعت کچھ اور بھی یا زیجاہنے ہی بے پروائی اختیار کر لی گئی کہ وقت گزرتا رہا۔ طبیب آتے کئے علاج پر لئے گئے سب مرض کی نویعت پر غلطگو کرتے رہے مگر موت کا علاج کسی کے پاس نہ تھا۔ سب دیکھتے ہی رہ گئے اور زیجاہ یہ ہفتہ کی جان لیوا تکلیف کے بعد پانچ سالہ لاثان اور دو دو حصے پتے ہاران کو روتا بلکہ چھوڑ کر ہمپسہ بیش کے لیے رخصت ہو گئی۔ ابراہیم اور حسن کی کاؤشیں ایش بن

گئی تھیں۔ اس دن اپنی خواب گاہ میں جانا اے عجیب لگ رہا تھا جیسے وہ حسن کو پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ حسن نے اسے بتایا کہ ان دونوں کے سفر پر جانے کے کچھ دن بعد ہی اس کی طبیعت خراب ہوئی تو حیثیم نے بتایا کہ وہ مان بنے والی ہے۔ گویا کہ وقت کا بڑا حصہ گزر کا تھا اور کم وقت باقی تھا۔ اس وقت بیت المقدس کا چلیں القدر عالم اور عظیم کا ہن اپنی دوسری آرزو کی محیل میں بے چینی سے گھریاں گئے تھے۔ موتی کے رتب نے دونوں خوشیاں ایک ساتھ ہی عطا کر دیں۔

کہتے ہیں، منصب مالکنے والے کو آزمائش ملتی ہے، شہرت طلب کرنے والے کو بدنامی اور دولت طلب کرنے والے کو ہوس مگر پھر بھی انسان کے دل میں یہ تمام آرزوؤں کی ملحتی رہتی ہیں، دولت، نام وری اور عزت۔ انسان ان خواہشات پر بھی قابو نہیں پا سکتا۔ بھی ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ابراہیم بن کا لب بھی انسان تھا اور اس کے علم کی بدولت اس منصب پر اس کا حق بنتا تھا، اولاد کی تمنا بھی اس کے خیال میں جائز تھی۔ اس دنیا میں کوئی شخص ایسا ہوا ہی نہیں جس نے اولاد کی آرزو نہ کی ہو۔ وہ بھی ان ہی میں سے ایک تھا اور پھر انسان ہے بھی عجیب و غریب تھوڑے بے پناہ نہمتوں کے حصول کے باوجود ایک کی کو اپنی محرومی بنا لیتا ہے پھر کوشش، ہر خواہش اور ہر کاوش اسی کے حصول کے لیے کرتا ہے۔ ایسے میں دعا، دو اور علم و عمل کی سب صلاحیتوں کو بھول جاتا ہے جن کا ٹھکر آؤ کرنا واجب ہوتا ہے۔ یوں عمر ہر ٹھکر آؤ نہیں کرتا ہے، کوئی کڑا ہاتا ہے اسی لیے بھی بھی بڑی دعاؤں کے بعد کوئی خواہش کسی بہت بڑے نقضان کے ساتھ پوری ہو جاتی ہے اور انسان کو خبر ہی نہیں ہوتی۔ ابراہیم بن کا لب نے بھی پندرہ برسوں میں صرف محرومی کو محسوس کیا تھا، کہیات کے منصب کی تمنا کی تھی۔ اور جمل موتی پر جا کر لئے ہی نفع کی پاتی کی تھی۔ اس کے عوض نقضان کو بھول گیا تھا اور موتی کے جلیل القدر رتب نے اس کی دعا قبول فرمائی تھی۔ منصب عطا کر دیا تھا مگر آزمائش کے ساتھ جس

وقت کی قیمت ابھی ادا کرنی تھی۔ حسن کا پیر پھسلا اور وہ گرفتی تھی۔ چیز کی آواز نے سب کو متوجہ کر لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھر بھر گیا۔ خدمت گار لوڈی نے خدمت کی اور احباب خلوص کو آزمائے میں کمی نہ کی۔ اس وقت ان میں سے کسی کو بھی علم نہ تھا کہ جان کے بدالے جان کا معاملہ ہے۔ وہ سب ہی حسن کو ہوش میں لانے اور اپنی روح کے دنیا میں لانے کا اہتمام کر رہے تھے۔ دنیا میں آنے والی روح کو آنا تھا، وہ آئنی مگر اس شہ تنہاؤ سے طلب کی ہوئی اور ا manus سے مانگی ہوئی اولاد نے اس دنیا میں پہلا قدم رکھا تو ہوش خود سے بے گانہ حسن نے اس دنیا سے منہ مورڈیا۔ دیکھنے والے چیختے چلاتے رہ گئے غورتوں نے غم اور مدھوشی میں بال کھول کر منہ پینچے شروع کر دئے گر ابراءٰ یم بن کالب اس نئے وجود کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ شاید انسان جتنے بلند منصب پر ہوتا ہے اُسے ہی بڑے حوصلے کے ساتھ آزمائشوں سے گزرا جاتا ہے۔ ابراءٰ یم بن کالب، بیت المقدس کا عظیم کاہن، قیامت خیر آزمائشوں سے گزر کر اس وجود کو تکتارہ گیا جسے موئی کے زب سے اس طبیل القدر پہاڑ پر جا کر بانگا تھا۔ ایک خناساروئی کی طرح نرم وجود چھوٹی سی آواز اس کا دل چاہا اسے کلکجے میں اتارتے تب ہی خدمت گار لوڈی سط نے کہا۔

”مقدس گھر کے طبیل القدر کا ہن.....! آپ کو موئی کے زب نے بیٹھی عطا کی ہے۔“

”ھوا!“ ابراءٰ یم بن کالب کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ”ھوا یعنی خواہش، تمنا، آرزو۔“ آنسوؤں سے نمیں آواز کسی نے نہیں سنی، بس دیکھنے والوں نے دیکھا کی تینی لاوی کے عظیم کاہن نے اس نرم وجود کو بینے سے لگایا جسے باپ کے بوسے سے پہلے آنسو ملے تھے۔ ابراءٰ یم بن کالب بہت بڑے غم سے گزرا تھا۔ ہمدردی کرنے والے بے پناہ محبتیوں کے باوجود رخصت ہو گئے۔ اب غموں کو باشندے اور محبت کرنے والی ایک ہستی کا اسے شدت سے انتظار تھا۔ دل چاہتا تھا کہ کھڑی کی چوچھائی میں ایش بن کالب آجائے اور وہ اس کے کندھے پر سر کھکر اپنا

کالب کی محبتیں اور مخصوص بچوں کی بے کسی کوئی بھی اسے نہ روک سکا۔ سونپنے بخشنے کی ہر صلاحیت جیسے ختم ہو گئی تھی۔ جو جہاں تھا، جسے اتنی جگہ ایک پتھر تھا۔ میان لامان یا باران رو تے تو انہیں لگا، اس گھر میں زندگی موجود ہے۔ ابراہیم بھی چونکہ جاتا اور حسن بھی ہوش میں آ کر ان بچوں کو بینے سے لگا لگتی۔ یوں بھی اب وہ دونوں اسی کی کھو کر رہے گئے تھے اور ایش بن کالب اس کمرے کا جس سے اس کی بہت سی یادیں داہستھیں۔

وہ سعیہ میں مندے کر لیتا تو وقت کا پایا ہی نہ چلتا اور ابراہیم اس کی تھائی پسندی سے گھبرا کر اسے سفر کے شورے دیتا لیکن اس کے جانے کے تصور سے خود ہی گھبرا جاتا۔ لگنا تھا، غم ان سب کے اندر بیٹھے گئے ہیں کہ وہ سب خود سے بھی ڈرانے لگے ہیں یوں جیسے ایک دوسرے سے منہ چھپا رہے ہیں۔ ان ہی دنوں ایک بڑے ملے کا اعلان ہوا۔ تا جر لوگ مختلف عاقلوں سے مال لے گر اس میلے میں جاتے اور اپنی دکان لگاتے۔ ایش بن کالب ایسے میلوں میں جا جا کر بہت نفع کمالاتا تھا۔ اس وقت مال سے زیادہ سوچوں اور صحت کے لیے یہ سفر ضروری تھا، شاید اس بات کو اس نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ بہت کم وقت میں اس سفر کا فیصلہ ہو گیا اور لامان کو پیار کر کے باران کو چھتے ہوئے اس نے حسن کو دیکھا، ہنسنے کی کوشش کی، حسن نے آنسو پیتے ہوئے ڈعا دی۔ سب وہ ابراہیم سے گلے ملتے ہوئے ایک اچھے وقت پر ملے کی تمنا لیے رخصت ہو گیا۔ اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا کہ وقت کے ترکش میں اور کتنے تیر باقی ہیں جو ابراہیم کے بینے میں پوست ہونے والے تھے؟ ایک خوشی کے انتظار میں انسان کتنے غم جھیل جاتا ہے، شاید جھیل کر ہی اندازہ ہوتا ہے۔

ایش بن کالب چلا گیا۔ چند ہفتوں کا سفر تھا۔ یہ وقت ان سب نے ہی بڑی بے چینی سے گزارا۔ کسی نئی روح کی آمد کا تصور ہزار ہائیوں میں بھی عجیب مسروت دیتا ہے۔ ابراہیم بھی خود کو پشاش رکھنا چاہتا تھا۔ اس وقت کا احساس اسے اب بھی تھا لیکن اس

سنس توڑتا ہوا ایش بن کالب اس کے سامنے تھا مگر لگتا تھا، کچھ کہنے کی سکت نہیں ہے۔ وہ زخوں سے چور چور چند لمحے سے دیکھتا رہا پھر سانس بھیج کر بولا۔ ”بھائی محترم.....! انسان کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے، وہ فیصلہ اللہ ہی کا ہوتا ہے کیونکہ اس کی منظا و مدد کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔“ یہ کہتے کہتے ایش بن کالب نے ہاتھ بڑھایا تو ابراہیم بن کالب نے یہ ہاتھ تھام لیا۔ اس نے ملجنیا نظروں سے اسے دیکھا اور بولا۔ ”آپ لاہان اور ہاران کا خیال رکھئے۔ حسنے سے کہیے نہیں مال.....“

اس وقت بات پوری نہ ہوئی کہ عمر میں پہلی بار ابراہیم بن کالب بلند آواز سے رو دیا۔ کچھ کہنے یا وعدہ کرنے کا مقام ہی نہ تھا۔ کیسے کہہ دیتا کہ حسنہ تو خود ایک بڑی تمنا پوری کر کر دنیا سے رخصت ہو گئی۔ ان تین بچوں میں سے کسی کی بھی ماں نہیں ہے مگر وہ یہ بات کہہ نہ سکا اور روتا رہا۔ کہتا بھی کس سے ایش بن کالب یہ سب سننے کو وہاں موجود ہے۔ اس دن ہیت المقدس کا عظیم کامن اس کے جد خاکی کو اٹھائے پلٹ آیا اور زیخا اور حسنہ کی قبروں کے پاس ایک قبر اور بن گئی۔

.....*

وقتِ زخم دیتا ہے اور وقت ہی اسے بھردیتا ہے، اس کا اندازہ انسان کو خود ہوتا ہے۔ دیکھنے والوں کو نہ زخم ظراحتے نہ ان کے بھر جانے کا احساس ہوتا۔ انسان خود گزرے وقت کی نشانیں کو عنزیز رکھ کر اسے بھول جاتا ہے یا صبر کر لیتا ہے۔

ایش بن کالب جسے اس نے بیٹوں کی طرح پرورش کیا تھا، اس خاندان کو دو بیٹے دے کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ابراہیم نے سوچا ”قدرت کو یہی منظور تھا۔“ اب اس نے پچھرے ہوئے بھائی کو ان دو بیٹوں میں پالا تھا۔ اسے بھولانیں تھا، بس سمجھوتا کر لیا تھا، حسنہ، اس لی عنزیز یوپی ٹوٹ رکھتے کرنے والی ساتھی ساتھ چھوڑنی گئی۔ زندگی کا دو دیش اسے اسے اتنا ہی یاد تھا۔ اس محبت اس ساتھ سے وہ محروم ہو چکا تھا لیکن حسنہ کی نمائی موجود تھی ہے، ہر خودی سے

سارا غم آنسوؤں میں بہادے۔ دن ان تینوں کے کام کرنے اور اداہیہ عمر سیط کو ہدایت دینے میں گزر جاتا اور رات میں ایک بازو کے ساتھ ہلاہان دوسرا سے بازو کے ساتھ ہاران اور سینے پر چھوٹی سی رضاۓ میں لیتی ہوا اسے مصروف رکھتی۔ خیالات بھی اپنی اور بھی جمال کا اعاظر کرتے، بھی کوئی پرانی یاد مفترض کرتی تو بھی جمال کی کیفیت آنکھیں نہ کر دیتی۔ ایسے میں مستقبل بھی اپنی کرن و کھاتا۔ وہ تصور ہی تصور میں ایش بن کالب کو دیاں آتے ہوئے دیکھتا اور کہتا۔

”میرے بھائی! لیخا کا نام البدل نہیں مل سکا مگر اس گھر کو ایک عورت کی ضرورت ہے۔ لاہان کو ہاران کو اور ھوا کو۔ پروش اور نگہداشت کا کام صرف اور صرف عورت ہی کر سکتی ہے۔“ یہ سوچتے سوچتے اسے لگتا اب اسے صرف ایش بن کالب پری ضرورت ہے۔ اس کا انتظار ہے جس کے سہارے وقت گزارے۔ اب اس کے کان وہ دستک سننا چاہتے تھے جو ایش بن کالب کے آنے کی خبر دیتی۔

اور ایک رات دروازہ بجتے کی آواز نے اسے نیند سے چونکا دیا۔ اسے خوب اندازہ تھا کہ آدمی رات گزر چلی ہے۔ ایش بن کالب کا آنا متوقع تھا لیکن جیرت کی بات تھی کہ کیا اس وقت دروازے پر متین غلام موجود نہیں یا بہت گہری نیند سو گیا ہے جو آنے والے کو اتنے زور سے دستک دیتی پڑی؟ جب تک ابراہیم بن کالب اٹھتا سیط بڑے دروازے تک پہنچ گئی۔ اس وقت آنے والا ایش بن کالب نہیں بلکہ قافلے کے لٹ جانے کی خبر ہی۔

آنے والوں نے خبر دی کہ قافلہ منزل پر پہنچ کر لٹ گیا، میر قافلہ مارا گیا، مال لوٹ لیا گیا اور کچھ مسافروں کی حالت خراب ہے، ان میں ایش بن کالب بھی ہے۔ ابراہیم پر کیا گزری، یہ محسوس کرنے وال کوئی نہ تھا۔ تین کم سن بچوں کو سیط کے حوالے کر کے گھر سے قافلے کے پڑاؤ کے مقام تک وہ کس طرح پہنچا، شاید اسے خوبی احساس نہ تھا، بس اسے اتنا ہی پتا تھا کہ ایش بن کالب اور اس کے ساتھیوں کو فرق تھا۔ نہیں ایسا۔ اس کے پہنچنے تک کچھ رخصت ہو گئے اور

بچانے کے لیے اس نے یہاں بھی سمجھوتا کر لیا تھا۔ اب
ہاں بھی بھی تھائی کے لحوس میں تعجب سے سوچتا۔
”کیا آرزو دیں یوں بھی تجھلیل پاتی ہیں؟“ تھنا میں
یوں بھی پوری ہوئی تھیں؟ کہاں کا قدس منصب مانگا
تو سب کچھ گیا۔ اولاد انگلی تو گھر میں اولاد کے سوا
کچھ باقی نہ رہا۔ یہ سب تصورات تھائی میں متوجہ
کرتے لیکن تھائی کا وقت کم سے کم ہوتا گیا۔ کہاں
کی ذمے داریاں اور بچوں کی موجودگی اسے مصروف
کرتی رہی۔ سیطہ خادی بھی اور ان بچوں کی ماں
بھی۔ ان کی دیکھ بھال کھانے پینے کھیلے اور سونے
چانگے کے اوقات کا خال رکھنا اسی کی ذمے داری
تھی۔ ہاں ان سب کے مستقبل کے لیے سوچنا ابراہیم
بن کالب کا فرض تھا اور وہ ہمیشہ ایک ہی بات سوچتا،
ایک ہی فیض کو دہراتا۔ ابراہیم بن کالب ہی لاوی
کے عظیم کام ہاں، تم خاندانی روایات کے مطابق بڑے
فرزند کو عالم اور دوسرے کو تاجر بناؤ گے تاکہ تمہارے
گھرانے کا ایک لڑکا ضرور کہانت کے مقابله کے
لیے موجود رہے۔ تمہارے باپ نے تمہیں عام اور
ایش کو تاجر بنایا، اب تم لاثان بن ایش کو عالم اور
ہاران بن ایش کو تاجر بناؤ گے۔

”میں اداں نہیں ہوں۔“ ہوا نے لکڑی کے
گھوڑے پر رونگ کرتے ہوئے کہا۔ ”لاثان ہمارے
ساتھ کھیلتا ہیں، میں پڑھتا ہے۔ تم میرے ساتھ کھیلتے
ہو، تم تو نہیں جاؤ گے؟“

”نہیں۔“ ہاران نے اپنے طور پر فصلہ کیا۔ ”ہم
دونوں یہاں رہیں گے۔“

ہوا خوش ہو گئی۔ کتب اور گھر میں وہ دونوں
ساتھ ہوتے، ساتھ کھیلتے۔ ہاران کوئی تین بات سمجھتا تو
اسے ضرور سمجھتا تا اور وہ خود بھی جو کام کرتی، اسے
 بتاتی۔ ابراہیم بن کالب ان پر دولت لاثانا، انہیں خوش
رکھنے کو سب کچھ کرتا۔ جب مقدس گھر سے واپس اپنے
گھر آتا تو اسے لگتا، صرف میں بچے ہیں جو اس کا
دامن سمجھ لیتے ہیں۔ وہ تمام وقت ان میں گزارتا، ان
کے کھیل دیکھتا، ان کے بڑھنے لکھنے میں دوچسی لیتا اور
انہیں ڈھروں محبتیں دے کر پھر چند دن کے لیے چلا
جاتا اور وہ خود مصروف اور بچے پھر ایک دوسرے میں
کم ہو جاتے۔ اب وہ دونوں لاثان کو دیکھ کر خوش
ہوتے گر اس کی محفلیں دیر تک انہیں مسروں نہ
کر سکتیں۔

لاثان کا راستہ جدا ہو چکا تھا جو بہت کشادہ بہت

چاہیے کہ اس نے وقت وہ بھول جاتا کہ اس گھر میں
ایک بچی بھی ہے۔ اس کا بھی کوئی مستقبل ہے؟ اچھے
سے اچھے علم کی حلاش صرف لاثان بن ایش کے لیے
ہوتی اور تجارتی فن میں طاقت کرنے کے لیے ہاران
بن ایش پر توجہ دی جاتی۔ بے پناہ محبت کرنے والا
باپ اس مم سن بچی کو سینے سے لگا کر سوتا۔ اس کی
غذہ اس کے لباس کا سب سے بہتر انتظام کرتا لیکن وہ
کیا چاہتی ہے، کس بچے کے ساتھ خوش گھوڑے کرتی
ہے؟ اس جیلیل القدر عالمی نظر وہاں تک جاتی ہی نہ
ہے۔ یوں وقت گزرتا گیا، ابراہیم بن کالب بیت
ال المقدس کے کاموں میں مصروف ہوتا گیا اور بچے
تیزی سے بڑے ہوتے گئے۔

علاءت کے ماتب سے تعلیم پانے کے بعد اب
لاثان بن ایش کو مرید علم کی ضرورت تھی۔ یوں بھی گھر
میں کیا تھا جو وہ وقت نزاری کے لیے رہتا؟ اب اسے

کہتا۔
”اور اس کے بعد؟“ وہ پھر سوال کرتی۔
”اپنی بیٹی سے۔“

یوں سوال اور جواب کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔
سب ہستے مگر چوتھی حقیقت تھی کہ ابراہیم بن کالب کو حوا سے حد درجہ محبت تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اس سے بات کرتے کرتے بھی بھی وہ چوک جاتا۔ اسے لگتا کہی نے کہا ہے۔

”ابراہیم بن کالب اپنے خاندان کے اس آخری بیٹی کی کہانت اور منصب کے لیے تمہیں ابھی سے محنت کرنا چاہیے۔“

تب وہ لامان بن ایش کو ایک دم ای کوئی نیادرس دینے لگتا۔ حوا پر سے گرفت کم ہو جاتی اور اسی وقت ہاران کو زدیک اُتاد کیجئے کہ حوا بھی جسے سب کچھ بھول جاتی۔ لبے تقد کا دبلائپلا کتابوں میں اور ہر دم کہانت کے آداب سمجھنے والا لامان اسے متوجہ نہ رکھتا اور بابا جان بھی صرف ہوتے تب ہاران کے سوا کوئی نہ تھا۔ وہی سماں تھا، وہی دوست اور وہی پناہ۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ ساتھ مضبوط ہو رہا تھا، انسیت بڑھ رہی تھی ایک دوسرے کا ساتھ ضروری بنتا جا رہا تھا، سب کی دنیا وسیع ہو رہی تھی لیکن حوا کی دنیا مست کر صرف ہاران تک محدود ہو رہی تھی۔ بابا جان صرف تھے کوئی بات نہیں۔ لامان چلا گیا، اب آتا بھی تو اہم نہ لگتا۔ علاقے کے بچے بھی ملتے، بھی نہیں لیکن ہاران ساتھ ہے تو سب کچھ ہے۔ یہ چند ہفتہ ہوتا گیا اور اسے اندازہ ہی شہ ہوا۔ ہاں جس دن ابراہیم بن کالب نے اعلان کیا۔

”ہاران.....! تمہاری علاقے کے مکتب کی تعلیم مکمل ہو چکی ہے۔ اب تمہیں فنِ حرب کی تربیت کے لیے جانا ہو گا۔“

ہوانے چوک کر دیکھا، ہاران بھی اسی کو دیکھ رہا تھا۔ مگر بابا جان سے کچھ کہنے کی ہمت اس میں نہ تھی لہذا یہ کام اس نے کیا اور بولی۔

”بابا جان.....! ہاران کو فنِ حرب کی تربیت کیوں لئی ہے؟ وہ تو تاجر بنے گا۔“

ٹوپیل تھا۔ ابراہیم بن کالب جب علاقے کے لوگوں میں بیٹھ کر اس کی یادی کرتا تو وہ سب حیرت سے دیکھتے۔ تربیت کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ بہت جلد خاندان بنی لاوی کا فرد ہونے کے باعث مزید تعلیم کے لیے متعجب کر لیا گیا تھا۔ اس اختیاب کے لیے بھی امتحان ہوتا تھا جس میں بنی لاوی کے خاص خاص لڑکے ہی شریک ہوتے اور چند ایک ہی کامیاب ہوتے تھے اور اس برس بارہ سالہ لامان بن ایش نے اپنی قابلیت سے سب کو حیرت زدہ کر دیا تھا اور آئندہ کے لیے بیت المقدس کے مصلیوں نے اسے تعلیم و تربیت کے لیے مخصوص کر لیا تھا۔ ابراہیم بن کالب کی خوشی کی انتہائی تھی وہ خود کا ہن تھا اور اس کا ہونہار بھیجا کا ہن بنے والا تھا۔ اسے لگا، مستقبل محفوظ ہے۔ بنی لاوی کے خاندان کی عزت اور شان سب اسی کے دم سے ہے۔

اس پار وہ گھر آیا تو علاقہ بھر کے لوگوں نے حاضری دی، سلام پیش کیا اور مبارک باد دی۔ ان سب کو لگا کہ لامان بن ایش، ابراہیم بن کالب کے لیے لازم و ملزم بن چکا ہے اور اس کی ضرورت بھی تھی۔ بیت المقدس کا عظیم کام ہے اسٹھنے بیٹھتے اسے کہانت کے اصول سمجھا ہا، لوگوں سے محبت کی تعلیم دیتا، انصاف اور اخلاق کے درس دیتا، یہ یا تسلیم ہاران بھی سنتا اور حوا بھی لیکن حوا کے سر سے گزر جاتی۔ ہاں ابراہیم بن کالب کا قرب اسے اچھا لگتا۔ اس کی موجودی اسے بہت بھائی، بھی بھی وہ اس کے قریب ہو جاتی، بازو بہا لہا کر کیا اس کی داڑھی کو چھوکر پوچھتی۔

”بابا جان.....! آپ کو سب سے زیادہ کس سے محبت ہے؟“

تب ابراہیم بن کالب اسے بازو کے حلقوں میں لیتا، اس کے نرم زم بالوں کو چوتا اور کہتا۔ ”ہمیں سب سے زیادہ محبت اپنی بیٹی سے ہے۔“

”اور اس کے بعد؟“ وہ سب کو غفر سے دیکھتے ہوئے دوسرا سوال کرتی۔

”اس کے بعد بھی اپنی بیٹی سے۔“ ابراہیم بع

”ہاں میں.....!“ ابراہیم بن کالب نے پیار سے کہا۔ ”مگر بھی کسی تجارت میں بھی مقابلہ اور لڑائی کی ضرورت پیش آ جاتی ہے لہذا فن حرب کی تربیت توہنگی کے لیے ضروری ہے۔“

یہ آخری فیصلہ تھا گویا کہ ہاران بن ایش کو گھر سے جانا تھا۔ اس وقت ہوا کو لگا کہ ایک طویل ساتھ ہے جو پھٹکنے والے۔ اتنا وقت تو اس نے ابراہیم بن کالب کے ساتھ بھی نہیں گزارا تھا لہذا اداہی لازمی تھی۔ اس نے کہا۔

”بابا جان.....! میرے ساتھ کون کھلیے گا؟ کون پڑھے گا؟“

”یعنی.....! تم کسی بھی لڑکی کو دوست بنا لو۔“ ابراہیم بن کالب نے طبینان سے کہا۔ ”علاقوں میں بہت سے گھریں بہت بچے ہیں سب ہی تمہیں جانتے ہیں مگر ہاران کو تو شہ سواری اور ششیر زندگی ضرور سیکھنی ہے ورنہ وہ کسی بھی دشمن سے ہار جائے گا۔“

شاپرہ ہاران نے اس بات کو سمجھ لیا تھا۔ وہ بس افسر وہ تھا۔ ابراہیم بن کالب نے اسے پیار سے دیکھا اور بولا۔

”ہاران.....! اسپتہ جو ان گھروں سے جاتے ہیں پڑھتے، لکھتے اور لڑائی کی تربیت لیتے ہیں پھر آج جاتے ہیں تو لگتا ہے کہ اسی واپس آگئے۔“ مستقبل بنانے کے لیے چند برس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اور پھر تم تو گھر سے بہت دور نہیں جاؤ گے ہفت پدر وہ دن میں گھر آتے رہو گے اور یہ میرا وعدہ ہے کہ جس دن تم فن حرب کی تربیت مکمل کرو گے جو ماگوں کے طبقاً ہے۔“

ایک وعدہ ہو گیا۔ ہاران رخصت ہو گیا اور ہوا چپ چاپ روئی رہ گئی۔ آنسو جو نظر نہیں آتے سکیاں جو سنائی نہیں دیتیں بڑا دکھ دیتی ہیں۔ ایسے دکھ جو سمجھے جاتے ہیں نہ سمجھائے جاتے ہیں صرف اپنا سرمایہ ہوتے ہیں۔ ہاران کی رخصتی کا دکھ بھی صرف اسی کا سرمایہ تھا۔ کسی سمجھدار آدمی کو اس سے غرض ہی کیا تھی بڑوں کے نزدیک ایسی بچانہ باتوں کی اہمیت کیا۔ بھی ڈانٹ دیا۔ بھی سمجھا دیا۔ ان کے پس عدوہ

لئی خواہشات پامال ہوتی ہیں کتنے جذبات پلے رفaro سے گزرتا رہا۔ اس وقت نے لئی خواہشات کو منا کر کتے جذبوں کو جنم دیا۔ کسی کو پہنانے چلا۔ ہوا کیا سچھتی ہے، بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ بس اسے خود لگتا کہ اس کا ہر تعلق ہر خوشی اور ہر رشتہ صرف ایک نام ہے ہاران بن

جانتے ہیں، کوئی نہیں جان سکتا۔ ابراہیم بن کالب جسے بجلیل القدر عالم کے نزدیک بھی یہ باشی بچپن اور نا بھی تھیں۔ ہاران کے لیے تعلیم و تربیت لازمی تھی۔ عمر بھر کا سوال تھا، نسلوں کا ادارہ اور حکا اور یہ افسر دگی چند دن کی بات تھی۔ شاید جذباتی عمر سے گزرنے کے بعد جذبوں کی کوئی اہمیت نہیں رہتی لہذا ہاران بن ایش چلا گیا۔

ہوا کو ان کا جسے اب وہ اکلی رو گئی ہے، تھارہ گھنی ہے، کرنے کو کچھ بھی نہیں رہا، یوں بخت کے ایک ایک دن کر کے سب دن گزر گئے۔ اس نے کچھ بھی نہ کیا، ہاں اس دن ابراہیم بن کالب کے ساتھ لاٹاں اور ہاران دونوں آئے تو اس نے کافی گھر میں بہار آگئی ہو اور ہاران کو بھی مخصوص ہوا کہ آج بہت خوش ہے، مسرور ہے۔ اس دن وہ سب دونوں کی باشی اسے سنا تارہ۔ فن حرب کی تعلیم اور یہ مکتب اس کے لیے نیا تھا اور ہوا کے لیے بھی۔ وہ دیکھی سے یہ سب سنتی رہی اور سمجھا ہی نہ سکی کہ یہ باشی اچھی لگ رہی ہیں یا یہ ساتھ خوشی دے رہا ہے؟ دن گزر، رات نہیں اور ہاران پھر چلا گیا کہ اس پاروہ اس طرح نہیں روئی نہ اس نے بابا جان سے مدد پکڑ رہا گئی کے وقت سے ہی آئے کا انظار کرنے لگی۔ اب یہ ان سب کی زندگی کا معمول بن گیا کہ ایک بخت میں صرف ایک رات گزارنے آتے اور دوسرے دن صحیح کی روشنی ہوتے ہی چلتے جاتے۔

ایسے میں ابراہیم بن کالب حسب دستور کہا نت کے آداب پر ہدایت دیتا رہتا، لاٹاں بن ایش اس منصب کے لیے دن رات مصروف رہتا اور ہاران اس کے ساتھ ساتھ اس سے اسی اچھے دونوں کی باشی سنتا اور اسے اچھے دونوں کی لمحے کی لمحے کی باشی اسے سنا تا۔ اس طرح آنا جانا ہوتا رہا اور وہ تو اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔

اس وقت نے لئی خواہشات کو منا کر کتے جذبوں کو جنم دیا، کسی کو پہنانے چلا۔ ہوا کیا سچھتی ہے، بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ بس اسے خود لگتا کہ اس کا ہر تعلق ہر خوشی اور ہر رشتہ صرف ایک نام ہے ہاران بن

کوئی نہیں ہے، آپ ہی تھوڑا سایاں بڑا دیکھیے۔“
ہوا گولو کے عالم میں تھی، طوبیں دم دو پھر پیاسا
سافر لیکن لیروں کی بھی کمی نہ تھی اور پھر بڑے چھانک
کا غلام کیا ہوا؟ ان سوچوں کے ساتھ ہی وہ اپنی آواز
میں دب دے اور بے خوف پیدا کرتے ہوئے ہوئی۔
”آپ بڑے دروازے پر ٹھہریں، میں آپ کو
کھانا اور پانی بھجوائی ہوں۔“

”مگر مجھے پہاں بیٹھ کر کھانا ہے۔“ سافر نے
ضدی تو ہوا چوکتی۔ اب اسے دھکانے کی ایک ہی
صورت تھی کہ اس علاقوں میں سب عورتوں کی طرح وہ
بھی اپنی مدد کے لیے اپنے مردوں کو پکارنے لگتی۔ بے
ٹک وہ ھر میں موجود ہوں یا نہ ہوں، اس سے وہ ذکر
بھاگ جاتا، اس وقت اس نے بھی بے ساختہ نام لیا
جو اسے بہت عزیز تھا۔ جس سے محبت اور اعتاد کا ہر
رشتہ قائم تھا۔ اس نے زور سے کہا۔

”ہاران.....! نیچے آؤ،“ دڑاں سافر کو پانی پلا
دو۔“

”اچھا، آتا ہوں۔“ اس جواب کے ساتھ
achaik دروازہ کھل گیا اور سافر بھائی کی بجائے
اندر آگیا۔ ہوانے اندر آتے ہوئے ہاران کو دیکھا۔
حیرت، صرفت اور ستائش کے جذبوں نے ایک ساتھ
یلغارکی اور فضا قبھوں سے گون آگئی۔ اس نے کہا۔
”اس طرح آنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”یہ یقین کرنے کے لیے کہ مصیبت کے وقت
تمہارے لبوں پر ہمارا ہی نام آتا ہے۔“ ہاران نے
خوشی سے جھوٹے ہوئے کہا۔

”واقعی یہ بھی عجب اتفاق تھا کہ آپ کا ہی نام
پکارا۔“

”کیا تم کوئی اور نام بھی پکار سکتی ہو؟“ ہاران نے
پوچھا۔

”آج آپ لاثان اور بابا جان سے پہلے کیے آ
گئے؟“ اس نے بات ثانی چاہی تو ہاران نے کہا۔

”اب ہم بھی نہ جانے کے لیے آگئے ہیں۔ یعنی
فرن حرب کی تربیت ملیں، اب شادی پر تھجارت۔“

اسی لمحے ہوانے رخ موڑ لیا اور واپس جاتے

ایش، جس کی گرفت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا
رہی ہے۔ وہ دل و دماغ کو اس سوچ، اس تصور سے
آزاد نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ کوئی یاد یا تصور نہیں، اس کا
دل ہے، اس کی سوچ ہے۔ وہی اس کا پہلا سماجی تھا
اور وہی اس کا ہر سماجی تھا۔ بابا جان کا نصیر تھی نہیں
وہندلا گیا تھا۔ اس کی جگہ ایک مصروف ترین کا ہے
نے لے تھی۔ وہ کاہن جس پر سب کا حق تھا جواب
مستقبل کا کاہن بنانے میں اس قدر مصروف تھا کہ
بے پناہ محبت کے باوجود بھی اپنی بیٹی کو وقت نہیں دے
سکتا تھا مگر اسے کوئی ملکہ نہیں تھا۔ وقت نے اسے ان
سب کی مجبوریاں سمجھا دیں اور اس کی سوچوں کا
بھی تو ایک مرکز تھا جس سے اس نے ابتدائی سالیں
سے محبت تھی اور عمر نے اس محبت کو پختہ کر دیا تھا۔

بہت سا وقت گزر گیا۔ سطھ تھی تھی۔ اب خدمت
کے لیے کسی نئی خادم کی ضرورت تھی لیکن کتب
چھوڑنے کے بعد ھوا سب کچھ خود کرنا تھا تھی۔ اسی
تھی ایک دوپر تھی جب پورے گھر کی صفائی کے بعد وہ
دھلے ہوئے کپڑوں کی تہہ باری تھی۔ سطھ کھانا بنا کر
اپنے کرے میں آرام کے لیے جا چکی تھی کہ بڑے
چھانک پر گھوڑا رکنے کی آواز نے اس کی توجہ لوٹ لی۔
اسے لگا، کوئی مہمان ہے جو دور سے سفر کرتا ہوا آیا
ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ بڑے چھانک پر تین
خادم ایسے آئے والوں کو ٹھہرانے اور میز بانی کرنے کا
ذمے دار تھا مگر گھوڑا رکنے کے چند منٹ بعد ہی اندر
کے دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونکہ پڑی۔ کیا
خادم وہاں موجود نہیں تھا؟ اس بات سے زیادہ اسے
اس بات کا تردید تھا کہ سطھ بھی تھک کر آرام کرنے چلی
گئی تھی اور اب شام سے پہلے جانے والی نہ تھی۔
دستک پھر ہوئی تب اس نے دروازے کے قریب
جا کر پوچھا۔ ”کون ہے؟“

”ایک سافر..... مصیبت زدہ..... پیاسا.....“

یہ آواز بھی عجب تھی۔ ہوا پر بیشان ہو گئی۔ اس نے کہا۔

”لیکا بڑے چھانک پر خادم نہیں ہے جو تم یہاں
نکھل جائے؟“

”جناب اس سافر کی مصیبت سننے والا وہاں

ہوئے بولی۔

"آپ پہلے کھانا کھائیں گے یا سفر سے واپسی
کے بعد غسل ترینیں گے؟"

"کیا تم نے کھانا کھایا؟" ہاران نے پوچھا۔

"نبی سطھ کھانا کھا کر سونے چل گئی اور میں
دھلے ہوئے کپڑے سمیت رہی تھی کہ اس کام کے بعد
کھاؤں گی۔"

"تو پھر آؤ پہلے کھانا کھاتے ہیں اور اس دوران
ہم تمہیں اپنی شاندار کامیابی کے قصہ سنائیں گے اور تم
دادوٹی۔"

اس دن ان دونوں نے ہمیشہ کی طرح بہت سا
وقت ساتھ گزارا۔ بہت ساری یاتمیں میں طرح
بچپن سے کرتے تھے لیکن ہوا کو لگا کہ آج خوشی کا کوئی
اور انداز ہے۔ ہاران واپس آگیا تھا مگر بھی نہ جانے
کے لیے اور عین اسی وقت خود ہاران یہی سوچ رہا تھا
کہ اس بار ابراہیم کو وہ بات یاد دلانے کا جو اسی نے
فیں حرب کی تربیت کے لیے جانے سے پہلے کی تھی۔

"ہاران.....! جب تم اپنی تربیت مکمل کر کے آؤ
گے تو جو باغوں ملے گا۔" اور ہاران نے اس وعدے
کو دل پر لکھ لیا تھا۔ اس بارہہ یہ وعدہ یاد دلانے والا
تھا۔ اخترس کر دنوں ہی اپنی اپنی جگہ مصروف آئے
واملے وقت کا انتظار کر رہے تھے اور ایک درسے کی
موجودگی سے ظاہرا ہے تھے۔ ایسے میں انہیں خود

اپنے جذبہوں کو پیچان لینے میں دیرینہ تھی۔ جب ہوا کام
میں مصروف ہوئی اور ہاران مدد کرتا تو انہیں لگتا تھا
کہ بچپن والی ہوانیں ہے نہ وہ سادہ سا ہاران جوں میں کر
کام کرتے تھے بلکہ اب ہربات تقریر اور سماحت کی حد
سے آگے بڑھ چکی تھی۔ اب تقریر میں جتنے معنی ہوتے
ساعت میں اس سے زیادہ اشتیق پیدا ہو گیا تھا۔ ہوا
کو لگتا۔ ہاران کے سانس لینے میں بھی بکروں جذبے
پوشیدہ ہیں ہربات پا منی اور ہر کام با مقصود لگتا۔

یوں اس بارہ دنوں ملے تو جذبہوں کے نئے نئے
معنی آفکار ہوتے گے اور انہیں لگا کہ شعر، سمجھ، مقل
سب کچھ آئنے سے قبل انہوں نے محبت کی کی ہے.....
محبت.....پہنچیں کی جاتی ہے یا ہو جاتی ہے؟ انہیں

اس سے بھی غرض نہ تھی؛ بس انہیں تو لگتا تھا کہ محبت ان
کے خون میں گردش کر رہی ہے سانس کی آمد و رفت
کے ساتھ جاری ہے، محبت کا تصور برا خوش آیا لگتا
ہے جبکہ سامنے کوئی رکاوٹ بھی نہ ہو۔ ہر دم ساتھ
رنہیں اور کیلئے والے دو بچے اپنے سوا کسی کے بارے
میں سوچتے ہیں نہ تھے اور اس تے لیے سوچتے؟ اپنے
سو انہوں نے کسی کو دیکھا بھی نہ تھا۔ ایک ابراہیم بن
کالب بیت المقدس کا عظیم کام اور دوسرا الامان بن
ایش، مستقبل کا کام، ان دونوں نے کوئی نہ بھی۔

اس بارہان دونوں کو آنا تھا مگر نہیں آئے۔ ہوا
رات گھری ہونے تک انتظار کر کری رہی مگر جرملی کر
لامان بن ایش کو تربیت مقدس کی تعلیم کے ساتھ اب
مقدس مقامات کی سیر بھی کرنی ہے۔ ایسے میں وہ سفر
پر جانے والا ہے اور ابراہیم بن کالب طالبان علم کے
اس قائلے کو روانہ کر کر ہی آئیں گے۔ ہوا کو بڑی
مایوسی ہوئی۔ اسے لامان بن ایش کے نہ آنے کی پروا
ندھی۔ ہاں ابراہیم کا انتظار ضرور تھا جس کے لیے وہ
نہ نئے کھانے بناتی تھی، تیاری کرنی تھی۔ اگر ہاران
نہ ہوتا تو شاید وہ افسو وگی سے رو دیتی لیکن جس نے ہر
ادا کی اور ہر دکھ کے بعد اسے ہنسایا تھا، اب بھی
موجود تھا لہذا چند لمحے کی ادا کے بعد وہ پھر نہ دی
اور وقت پھر کرنے لگا۔

کھٹکے دونوں میں اور دن بھتوں میں بیت گئے
اور ایک دن ابراہیم بن کالب آگیا۔ ہوا کو لگا،
فضاؤں میں ٹھنڈک ہے، ہواوں میں مہک ہے اور یہ
دن خوشیوں سے بھر پور دن ہے۔ اب وہ تینوں ہوتے
اور زمانے بھر کی باتیں۔ ہمیشہ ابراہیم کی توجہ لامان کی
طرف رہتی، اس کی تعلیم کیا کہانت کا مقدس پیش۔
خاندان بنی لاوی کا یہ جوان جس سے پوچھی امیدیں
وابست ہیں ہوا کو نہ اس جوان سے غرض تھی نہ کہانت
کے مقدس منصب سے اور نہ خاندان بنی لاوی سے۔
بل ابراہیم دیکھ لامان کی یاتم کرتا تو اسے اچھا نہ
لگتا۔ دل چاہتا کہ اب وہ ہاران کی باتیں کریں۔
abraہیم بن کالب کو ہاران سے بھی اتنی ہی محبت کی
بھتی لامان سے۔ وہ تینوں جنحے ہوتے تو بہت ساری

”مگر لاہان کی کلائیوں پر توبال ہیں؟“ لاہان نے مذاق سے اس کی بات کا لی۔

”اوھ.....“ ابراہیم نے کہا۔ ”میں نے پچھاں لیا، یہ ہاتھ سبیط کے ہیں۔“ اب فضا قہقہوں سے گونجنی سبیط بھی اپنی بھی شرک سکی اور ہوا اور ہاران تو تھے ہی بہت خوش اور ابراہیم کو ان سب کی خوشیاں ہی اچھی لگتی تھیں۔ اس کا دل چاہتا کہ لاہان کو کہانت کے مزید علم کے لیے انتخاب کر لیا جائے اور ہوا کو ہریش نصیب ہو۔ ہاران بنی لاوی کا معزز تاجر ہلاکئے۔ ان سب کو دیکھ کر وہ بار بار تمنا کرتا۔ ایسے میں ہاران اسے اس کا پرانا وعدہ یاد دلانے کا موقع خلاش کرتا رہ جاتا۔ اس کا دل چاہتا اسے کہے۔ ”بایا، ہوا میری زندگی ہے، اسے میں جان دے کر بھی حاصل کرنا اور خوش رکھنا چاہتا ہوں۔“ مگر یہ سب کہتے ہوئے وہ بھجک جاتا اور وقت ہاتھ سے نکل جاتا۔ آخراً یک دن اس نے اپنی پوری قوت مجتنع کر کے کہا۔

”بایا، آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے جب آپ نے کہا تھا کہ جب میں اپنی تربیت مکمل کر کے لوٹوں گا تو جو مانگوں گا ملے گا؟“

”ہاں بیان مجھے اپنا وعدہ خوب یاد ہے۔“ ابراہیم نے یاد کیا۔ ”مگر تو کیا ملتے گا؟“ ”جو مانگوں گا، وہ دے دیں گے؟“ ہاران نے پکا وعدہ دینا چاہا۔

”ارے کیا تو مجھ سے پھر سے عہد لینا چاہتا ہے؟“ ابراہیم نے پس کر کہا۔ ”ارے پاگل! میں نے تو سیرے باپ لوگی پا لاتھا اور مجھے بھی۔ بھلا کیا کوئی اپنی اولاد کو مالیوں کرتا ہے؟ میرے پاس جو کچھ بھی ہے تم ہی لوگوں کا تو ہے اور تو کیا ملتے والا ہے؟ کیا میں جانتا نہیں میں جو تیری رُگ رُگ سے واقف ہوں۔“

اس وقت ہاران کی آنکھیں چمک گئیں۔ اسے خوانہوایہ لگا کہ ابراہیم سب جانتا ہے۔ وہ جھینپ سا گیا اور اسے آزمائے کوپول۔

”اچھا؟“ بتائیے کہ میں آپ سے کیا ملتے والا ہوں؟“

باتیں ہوتیں، ماضی کی حال کی مستقبل کی۔ ہواستی، ان میں حصہ لتی۔ اس دن ابراہیم نے کہا۔

”موتی کے ترب سے ڈعا کرو کہ وہ بنی لاوی کے جس لڑکے کو مستقبل کا کاہن بننے والے ہو۔“

”کیوں بابا جان؟“ ہوانے جریان ہو کر دیکھا۔ ”اچھا کام کرنے کے لیے کوئی بھی ہو سکتا ہے لاہان ہی گیوں؟“ ابراہیم بن کا لب نے پس ٹرا سے دیکھا۔ وہ جتنی حسین تھی، اتنی ہی مقصود بھی۔ ابھی وہ دیکھے ہی رہا تھا کہ ہوانے نیا سوال کیا اور بولی۔

”بابا جان! آپ نے کہانت کے لیے لاہان ہی کا کیوں انتخاب کیا ہے؟ کیا ہاران ذہین نہیں ہے؟“

”ہاران لاہان سے بہت زیادہ حسین تھی ہے ذہین بھی اور بیہادر بھی۔“ ابراہیم بن کا لب نے سمجھایا۔ ”ذہین بنی لاوی برسوں سے کہانت کے لیے بڑے بیٹے کو ہی تیار کرتے ہیں۔ میرے باب نے مجھے علم دیا اور ایساں کوتا جر بنا دیا۔ اب میں نے لاہان کو علم دیا اور ہاران کوتا جر بنا دیا۔“

”میں علم بھی رہے اور تجارت بھی۔“

”لیکن بابا جان بنی لاوی میں جن کے ایک ہی پیٹا ہو وہ کیا کرتے ہیں؟“ اس بار ابراہیم بن کا لب بے ساختہ پس دیا۔ اسے لگا کہ ہوا کی مقصود بھی ذہانت ہے جس پر وہ فخر کر سکتا ہے۔ وقت یوں گزرتا رہا، ہوا کی مقصودیت اور ہاران کی شرارتیں ابراہیم کو سارے غم بھلا دیتیں۔ اس دن وہ دھوپ کی زد میں بیٹھا ہوا تھا کہ ہوانے عقب سے آ کر اس کی آنکھیں بند کر لیں۔ ایسے میں جب تک وہ پچھانتا نہیں تھا، وہ چھوڑتی نہیں تھی اور اس دن ابراہیم بن کا لب بھی شرارت پر آمد تھا۔ اس نے کہا۔

”میں پچھاں گیا تو کون ہے یہ ہاتھ ہاران کے پیٹ۔“ اس وقت ہوا کا بھی سے برا حالت تھا۔ ہاران نے منظر دیکھا اور بولا۔

”ذہین میں یہاں ہوں۔“

”اچھا؟“ ابراہیم نے تجاہل عارفانہ بردا اور شرارت سے بولا۔ ”تو پھر یہ لاہان کے ہاتھ ہیں۔“

والدین اولاد کو خوشیاں ان کی مرضی سے نہیں بلکہ اپنے
میلے سے ناپ کر دیتے ہیں۔ اس کا بھی اپنا یادا نہ تھا
وہ بھی ناپ کر دینا جانتا تھا، پیاس بجھے نہ بجھے یہ ان کا
نصیب۔ یہ رات گزر گئی۔ وہ سریع بہت بڑی خوشی
لائی۔ لاہان بن ایش اپنے تعلیمی سفر سے واپس آگئا
تھا۔ مگر رات میں کس وقت آیا یہ کسی کو خبر ہی نہ ہوئی۔
صحن ہاران نے تعجب سے کہا۔

”بھائی! آپ رات کس وقت آئے؟“

”تم سب آرام کر رہے تھے۔ میں نے بے
آرام کرنا کوارہ نہیں کیا۔“ لاہان نے جواب دیا۔
”اور پھر راستے میں سرائے سے مکھانا کھا کر آیا تھا لہذا
خادم نے دروازہ کھول دیا اور میں آ کر لیٹ گیا۔“
ہوا کو یہ بات عجیب سی لگی۔ بھلا اتنے عرصے بعد
کوئی اپنے ہی ٹھرمیں اتنے پچھلے انداز سے آتا ہے؟
مگر اس نے اس وقت کچھ نہ کہا۔ ہاں جب ہاران سے
کہا تو وہ بولا۔

”درالصل بھائی کسی کو بھی تکلیف دینا نہیں
چاہتے، وہ بہت عظیم ہیں۔ میں دینا جانتے ہیں، لیتے
چکھے بھی نہیں۔“

یہ بات غلط نہیں تھی۔ لاہان بن ایش بے ضرر
فطرت کا مالک تھا۔ علم کے سو ماکی شیئے سے غرض نہ
تھی۔ اپنی کوئی آرزو نہ کی، کوئی طلب نہ تھی اسی لیے
جب ابراہیم بن کمال نے کہا۔

”میرے پیشے لاہان بن ایش! تمہارے لیے
میرے دل میں عجیب سی آرزو چکل رہی ہے۔ اگر میں
تمہارے لیے کوئی فیصلہ کروں تو قبول کرو گے؟“

”بابا! آپ سے ہٹ کر نہ میں کچھ ہوں نہ میرا
کوئی فیصلہ۔ آپ کی خوشی میری خوشی ہے اور مجھے
آپ کا ہر چکھ ممنوع ہے۔“ لاہان نے کہا۔

”حکم نہیں؛ میں میری خواہش سے کہ میں تمہیں ہوا
سے منسوب کر دوں۔ اگر تمہاری کوئی اور پسند
نہیں.....“

”میری کوئی پسند نہیں۔“ لاہان نے جواب میں
جلدی کی۔ ”آج تک حصول علم کے سوامیں نے کوئی
آرزو بھی نہیں کی، یہاں تک کہ آج سے قبل میں نے

اس وقت ابراہیم نے اس خوب صورت جوان کو
محبت سے دیکھا جو بالشبہ بہت جھیلی بہت حسین تھا
بہت نہ ملکھ تھا۔ چند لمحے محبت اور بھس سے دیکھنے
کے بعد اس نے کہا۔

”اوسر پر لڑ کے میں جاتا ہوں تو کیا مانگے گا۔
ایک لبے تجارتی سفر کی اجازت۔“

ہاران نے ساختہ افسر دہی بھی نہیں دیا۔ علم کے
کمال کو پہنچ کر بھی یہ مقدس کا ہن اپنی ہی اولاد کے
جز بات سے ناواقف تھا۔ اس وقت اس کا دل چاہا کہ
کہہ دے۔ ”مجھے تجارتی سفر کی نہیں، ہوا کی ضرورت
ہے، ہوا جو میری تمنا ہے میری زندگی ہے۔“ مگر وہ یہ
سب ایک دم سے کہہ نہ سکا اور کہنے کا موقع بھی نہ
ملا۔ ہوا کھانے کی اطلاع دیے اسی طرف آرہی تھی
ان دونوں کو خوش اور مسرور دیکھ کر وہ بھی سرو رہ گئی۔

اس رات جب کھانے کے بعد وہ دونوں کھلے
آسمان کے نیچے چھپل قدی کرتے ہوئے پاتیں کر
رہے تھے، میں اسی وقت ابراہیم اپنی خواب گاہ میں لیتا
ہوا ایش بن کمال سے کیے ہوئے وحدے کے
پارے میں سوچ رہا تھا جس نے مرتبہ ہوئے کہا
تھا۔ ”لاہان اور ہاران کا خال رکھے گا۔“ اور اس
خواہش پر ابراہیم نے عمر بھر عمل کیا تھا۔ انیں خوش
رکھنے کے لیے زندہ رہا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا
بہت بڑا حصہ لاہان کو عالم بنانے کے لیے مخصوص کر
دیا تھا اور ہاران کی تعلیم اور حرربی تربیت اسی محبت کا
نتیجہ تھی۔ اس نے بھیشہ ہی آرزو کی تھی کہ اس کے
دونوں پیشے تاریخ عالم اور بڑے تاریخیں اور اس کے
کی تکمیل کے لیے اس کے دل میں تھنا چکل رہی تھی کہ
ہاران کو تجارتی سفر پر جانے کی اجازت دے دے اور
ہوا اور لاہان کو ایک دوسرے کے ساتھ شلک
کر دے۔ اس کے خیال میں لاہان جیسا عالم اور
جنیدہ مزار جو ان ہی ہوا کی قدر کر سکتا تھا۔ وہ یہ سب
سوچتا ہا، غور کرتا رہا مگر اسے پتا ہی نہ تھا کہ ان کی
خوشی کیا ہے؟ ہاں اگر وہ اس وقت کھلے آسمان کے
نیچے خوش اور مسرور ہونے والے ان دونوں بچوں کو
دیکھ لیتا تو شاید جان جاتا کہ ان کی خوشی کیا ہے لیکن

سو اہر اذیت سے گزر گئے اور کسی کو خبر ہی نہ ہوئی۔ سب نے اپنے اپنے انداز سے خوشی ملائی گر اس شام اندر ہیرا ہونے کے بعد ہاران بن ایش نے تاریکی کی زدیں کھڑے کھڑے ابراہیم بن کالب سے کہا۔

”بابا! آپ کو اپنا وعدہ پاد ہے نا کہ مجھے طویل تجارتی سفر کی اجازت دیں گے؟“

”تمہیں اجازت ہے بیٹے!“ ابراہیم بن کالب نے تاریکی کے سبب اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی اور پیار سے بولا۔ ”تمہاری خوشی میری خوشی اور تمہاری ترقی میری ترقی ہے مگر تمہاری آواز کیوں رندہ رہی ہے؟“

”پچھے نہیں۔“ ہاران مزید اندر ہیرے کی طرف پلٹ گیا۔ ”موسم خراب ہے.....“

”اور تم لوگ اختیار ہی نہیں کرتے۔“ ابراہیم نے محبت سے کہا۔ ”جانتے نہیں ہونا کہ تمہاری تکلیف سے مجھ پر کیا قیامت گزر جاتی ہے۔ باپ بخوبی تو پا چلے گا۔ ہاں تمہارا تجارتی قالہ کب روانہ ہونے والا ہے؟“

”بابا! شاید مجھے آج رات ہی جانا پڑے جائے۔“ ہاران نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

جو لوگ کیڑا لاولاد ہوتے ہیں، نہیں بن مانگے ہی اولاد مل جاتی ہے وہ بھی اپنی اولاد کو سیکھ کر کھو دیتے ہیں اور ابراہیم بن کالب نے اپنی ترقی کی محبت کے لیے ”جل موئی“ پر جا کر موئی کے رتب سے اس نعمت کی آرزو کی ختنے سے رتب نے سن لیا تھا اور شادی کے برسوں بعد یہ بھی عطا کر دی تھی۔ اس نے بھی اس زندگی کا سامنگی۔ لامان بن ایش سنجیدہ باوقار محبت کرنے اور دکھنے کو محسوس کرنے والا جوان جو بابا جان کی نظر میں ہی نہیں بلکہ سب کی نظریوں میں اعلیٰ ارجمند تھا، اگر اس نے ہاران بن ایش کی پرستش نہ کی ہوئی تو اس کی پسند بابا جان سے جدا نہ ہوئی۔ سرقا اس نے اب بھی جھکا دیا تھا مردی کا نقش امن تھا۔ ہاں باپ کی محبت نے اس کی محبت کا خون کر دیا تھا۔

(اس کہانی کا دوسرا حصہ آئندہ ماہ پڑھیے) .

حوالے کے بارے میں بھی نہیں سوچا تھا لیکن اب جبکہ وہ آپ کی آزو ہے تو مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہشی ہو کر رہے گی۔“ ابراہیم بن کالب اس سچی پر جتنا بھی فخر کرتا، کم تھا جس نے کم عمری میں ہی علم بھی حاصل کر لیا تھا اور تمام مقدس مقامات کی زیارتیں بھی۔ اب اسے کہا ت کے منصب سے کوئی نہیں رُوك سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ بہت فرمائیں بروار تھا اطاعت گزار تھا۔ آج ہوا کے مستقبل کی طرف سے وہ مطمئن ہو گیا تھا۔ دوسرے دن سننے والوں نے اس اعلان کو جریت اور خوشی کے ساتھ سنا جب بیت المقدس کے ظہیم کا ہن نے کہا۔

”میں نے اپنی تمناؤں سے ماگی ہوئی بیٹی کے لیے جس سے میں دنیا جہاں میں سب سے زیادہ محبت کرتا ہوں، ایک اعلیٰ ترین جوان کا انتخاب کر لیا اور وہ ہے میرا بھتیجا لامان بن ایش۔“

اس وقت سب نے خوشی کا انتہار کیا۔ مبارک باد دی اور ہوا نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

نجانے غم کی کیفیت چھپا جا ہتی تھی یا آنسو روکنا مقصود تھا؟ ہاران بن ایش نے پھیل پھٹی نظریوں سے یہ سب دیکھا۔ ابراہیم بن کالب، اس کا عظیم پیچا تھا، اس کا محسن تھا، مربی تھا جسے اس نے بھی دکھ دینا نہیں

چاہا تھا اور دوسرا لامان بن ایش تھا۔ اس کا محبوب بھائی جس نے بھی کسی سے کچھ نہیں مانگا تھا، بھی ضد نہیں کیا تھی اور اس کی خوشی اسے اپنی خوشی سے زیادہ عزیز تھی۔ اس کا صحت مند چہرہ مسرور تھا۔ ہاران کو اس تھی مسرت اچھی تھی۔ اس کے رخ کے گدنور کا ہال اس کے پاکیزہ کردار کی گواہی دے رہا تھا۔ اس نے اپنی خرد میوں اپنے ٹھوٹوں کو ضبط کرتے ہوئے سوچا۔

”ہاران بے شک ہوا کو ایسے ہی پاکیزہ کردار جوان کی ضرورت ہے۔“

غرض کر کسی نے کچھ نہیں کہا۔ جو مسرور تھے مبارک باد دے رہے تھے اور جو ملین تھے، ٹھوٹوں کے جام پی گئے تھے۔ غم کے جام پیٹا زہر کے جام پیتے سے بھی زیادہ شکل تھا۔ وہ ترپے پلے اور موت تھے

لئن مدد کی خاص کہانی

ایک ریاضتی ذوقی جزل کی یاد تحریر کی صورت



ٹھیکانہ نیازی کا

وائس نہ جانا وہاں کہ تیرے شہر میں منیر
جو جس جگہ پر تھا وہ وہاں پر نہیں رہا

احمد توپتی جیلانی

امام بارگاہ کرتل مقبول حسین سے مسلک ایک تاریک راہ داریوں میں پوسٹ ہو جاتی۔
دلی پتی مگلی نقطہ چند قدموں کی مسافت پر پیچ در پیچ ”کلاسٹر فوبک“ نما یہ طرز تعمیر پلے طبقے کے



فلمي نام ماشر مدن لال جي تھا۔ سنہ 1948ء کے اوائل میں، کے ایل سہگل نے لاہور میں 'شو' کرنے کی حمایت بھرتے اصرار کیا کہ مدن لال کی موجودگی کو ضروری بنا جائے۔ خاصی تگ و دو کرنے کے بعد شنگیت سازوں کے بالا خانوں سے موصوف کی رہائش کا کھرا آر پی محلہ جا لکلا۔ آپ کی شمولیت نے میوزیکل شو تو چار چاند لگادیے۔

شو کے اختتام پر سہگل صاحب نے ماشر مدن لال کو اپس بھارت آئے پر رضا مند کرنے کی سر توڑ کوشش کی۔ شنید ہے مدن لال نے زیر ب مکراتے ہوئے صرف اتنا کہا۔
 ”بہت بہت دھنے واد..... کندن لال جی، اب ہمارا جینا مننا اسی دھرتی کے ساتھ طے پاچا ہے۔“

شمی قسم وطن کی لگن نے انہیں مغلی اور غربت کے علاوہ کچھ نہ دیا اُس کے باوجود اپنے اکلوتے بیٹھے صابر علی کو حچھی تعلیم دلوانے کی خاطر مشہور و معروف 'سینٹ تھریا'، مشہری اسکول میں داخل کروادیا۔

وقت کے دھارے نے اسی پلٹا کھایا کہ رقص و سرور کی محفلیں محدود ہوتی چل گئیں۔ سازندے، موسیقار اور فنکار دھنہ چھوڑ، گزر اوقات کی خاطر چھوٹے موٹے پیشوں سے مسلک کی رجھتی ہے۔ یہ بھلی ماشر مدن پر بھی گری، قاضی احمد کے وساطت سے 502 درکشاپ میں توکری ملی۔ اچھے روئے اور اچھی کارکردگی کے باوجود مقامی لوگوں کی اکثریت نے انہیں دل سے قبول نہ کیا۔ ساتھی محنت کش اُن پر آواز کتے۔ بھیا، ہندوستانی اور مژوں سے جیسے القاب روز مرہ کا معمول بن گئے۔ دل برداشتہ وزیر علی نے بالآخر ملاظمت

ہندوؤں کا خاصہ رہی۔ دل پیش کی مانند بھول بھیلوں جیسی ایک ایسی لگلی بھی ہی جہاں صحیح دشام پار موئیم سارگنی، اور الغزوے کی مدھر دھنیں راہ گیر دل کو اپنی جاہناب متوجہ کر لیتیں۔

یہ پیاس گاہ قاضی احمد کی تھی۔ بحیثیت پیشہ ور موسیقار، قسم ہند سے قبل آپ پے Bombay Talkies میں بطور استاذ میوزک ڈائریکٹر رہے۔ لاہور مستقل آباد ہونے میں تاکامی کے بعد پنڈی آگئے شام ڈھلتے ہی آپ کی رہائش گاہ پر موسیقی سیکھنے والے طلباء طالبات کا تانتا بندھا رہتا۔

راجہ بازار سے مسلک بدنام زمانہ قصائی گلی راولپنڈی کا ایک مشہور و معروف تاریخی مقام تھا۔ وجہ شہرت چھوٹے گوشت کی دکانیں، شادی بیاہ سے متعلقہ ساز و سامان کے کھوکھے، بالا خانے اور گانے بجائے کے ٹھیکے، یہاں سے وابستہ فنکار قاضی صاحب سے سر اور تال میں نکھار پیدا کرنے یا پھر ایڈ و انس ٹریننگ حاصل کرنے اُن کی رہائش گاہ پر پریاض کرتے۔

قصائی گلی میں منعقد ہختیں خالصتاً موسیقی سے رغبت رکھنے والوں کے لیے تجسس اور ان ہی کے دم سے قائم تھیں۔ بدکاری، جسم فرم روشنی اور دوسروں گھناؤنے کا روبرابر میں دچپی لینے والے لوگ سرانے تیلی رام، رتہ امرال جیسی جگہوں کا رخ کرتے۔

ہندوستان سے بھرت کے اجڑے خاندانوں میں ایک کنبہ و زیر علی کا بھی تھا۔ قسم ہند سے پہلے وہ ایک مخفی سارگنی نواز تھے۔ آپ کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ بیگم اختر، مراد آبادی، پنج ملک، خورشید جگ مون، اور کندن لال سہگل، وزیر علی کی شرکت کے بغیر آرکیٹس اکادھورا سمجھتے۔ آپ کا

چھوڑ دی۔

ایسی ہی ایک صبح ساتھ والی قطار میں کھڑے
صابر نے سرگوشی میں مجھے خبردار کیا کہ اس دعا کا
حصہ ہرگز نہ ہوں!

کھڑے چھپتے والد محترم کی توجہ جب اس دعا کی
طرف لوائی تو آپ خاموش ہو گئے۔ پھر میری
پیٹھے تھپٹھاتے بولے۔

”ہمارے ملک میں تعلیم عام کرنے میں
مشنیٰ اسکولوں کا کردار نہ صرف اہم ہے بلکہ
قابلِ عین ہی ہے۔ جب یہ قابلِ اعزاز دعا
کی جائے تو آپ خاموش کھڑے رہیں، کوئی
مضائقہ نہیں۔“

ایک دن بخوبی کہ وزیر علی اللہ کو چیارے
ہو گئے۔ مغلسی گویا آنکھن میں تیار کھڑی ہمی تعلیم
چھوٹی اور صابر باپ کی ڈگر پر چل نکلا۔ دراشتی
کاروبار کو خوب سنبھالا باوجود کہ یہ ایک لکھن راہ
تھی۔

لڑائی مار کٹائی، جاتو زندگی، دنگا فساد، اغواء
برائے تاداں، بردا فروٹی اور پولیس مقابلے، یہ
تمام مرامل صابر نے نہایت مہارت سے طے
کیے اور ”علاقہ بند معاشر“ بن گیا۔ پندتی بھر میں
اُس کی دھاک بیٹھ گئی۔ پھر نہ جانے کیوں اور
کیسے جج کی سعادت حاصل کی۔

واپسی پر بے پناہ تبدیلیاں ساتھ لایا۔ مخصوص
عاقلوں کے اس بے تاث بادشاہ نے نہ جانے کتنی
ستم رسیدہ خاتمیں کو بردا فروشوں کے چنگل سے
آزاد کروا کر سرائے نیلی رام اور ویمنچ کے
درمیان ایک پر اپنی کرائے کی جویلی میں پناہ دی۔
وھندے سے منسلک خاتمیں اور ان کے بچوں کی
فللاح و بہبود میں دن رات مشغول صابر ہر سال
حج کی سعادت سے فیض یاب ہوتے ہوئے
”حاجی صابر علی سرائے نیلی رام وائلے“ کے نام

پھر ایک وقت آیا ’میوزک الینگ‘ زور
پکڑنے لگیں لیکن موسیقی کے سازوں سامان کی
جدت نے سارگی کو اولاد فیشن اور فرسودہ ساز
ڈیکلیر کرتے ہوئے اسے پکے را گوں تک محدود
کر دیا۔ بھوک اور افلاس نے وزیر علی کو پھر میں سے
اتار دیا۔ قصائی گلی کے پرانے شناس آڑے
آئے۔

بدتفاقی، جس سے وزیر علی عمر بھر بدکارتہا اب
اُس کا ذریعہ معاش بن گئی۔ شراب کی بھیان،
شیکھ افون اور ہنگ کی کپوں کی فروخت کا
کاروبار کی کی شرکت کے بغیر وزیر علی کی زیر
مگر اپنی ہونے لگا۔ آسودگی اور معاشی خوشحالی نے
اپنا اثر صابر علی پر بھی ظاہر کیا۔ آریہ محلہ میں
رہائش اور سینٹ ٹھریسا اسکول کا درمیانی فاصلہ
چند سو گز ہونے کے باوجود وزیر علی اپنے بیٹے صابر
علی کوئی نویلی واکس ہال (Vauxhall) موڑ کار
میں خود چھوڑنے آتا۔ عمر میں مجھ سے چند برس
سینئر ہونے کے باوجود صابر کی میرے ساتھ
گاڑھی چھپتی۔

مشنیٰ اسکول کے الگ تھلگ قطعہ میں ایک
چھوٹا سا گر جا گھر اور اس کے ساتھ منسلک ایک
پہاڑی جس کے پیوں پنج کھڑا حضرت مریم کا
رنگدار جسمہ بہت خوشما منظر پیش کرتا۔ ”مارنگ
گلوری“ کے پھولوں کی بیلوں سے ڈھکی یہ
پہاڑی میری اور صابر کی دوستی کا مرکز اس وقت
بنی جب ہر ہفتے کی صبح طلباء و طالبات کی اسمبلی
ہوتی۔ اجتماعی دعا کی جاتی جس کے اختتامی الفاظ
کچھ یوں ہوتے۔

”اے خدا اے ہمارے باپ، ہمارے اور پر
رحم کر۔“

سے پہچانا جانے لگا۔
موہن پورہ کی رہائش سورن لا پیدائشی ہندو
تھی۔ ہر منگل کی صبح پوچاپاٹ کے دوران اپنی من
مونتی سندرا آواز میں جب یہ بھگن الاتی،

”تیرے مندر کا ہوں دیپک جل رہا۔“

تو مندر میں بیٹھے شرنا رتھی آنکھیں موندے
ہنکے لگتے۔ مندر کے پچاری شری رام دیونے اس
کی آواز میں مزیں نکھار پیدا کرنے کی خاطر قاضی
احمد سے درخواست کی کہ اُن کی پتری کوشاغر دی
میں لے لیں۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے گیت کی
ریتھر سل کے دوران ہی ارد ٹرک کے بالا خانوں
اور کھوؤں کے فکاروں کا جھکھلا لگ گیا۔ اتنی کم
عمرِ اتنی سچھلی اور اتنی شیر میں ادا؟

ت ملکیتکر کے مشہور گیت ”تم نہ جانے کس
جہاں میں کھو گئے؟“ کی محور کن ادائیگی کے
دوران حاضرین و ناظرین افسوس زده سے
ہو گئے۔

قاضی احمد نے اٹھ کر پنج کا ماتھا چوڈا اور
صرف اتنا کہا۔

”یہ آواز اللہ کی دین ہے، پیٹا آپ کوڑینگ
نہیں سازندوں کی ضرورت ہے۔“

اور پھر یوں چند رہن، چند رکھی، سورن
ت ”چوپھالتا“ کے نام سے مشہور ہو گئی۔

گرمیوں کی اُس شام کی یہ محفل چند رہنیں
زاویوں کی فرمائش پر کرتیں بائی کے کوٹھے پر معقد
ہوئی تھی۔

بازار اور اُس کے ساتھ مسلک گلی کو چوپاں میں
روز مرہ کی طرح رونقیں اپنے عروج پڑھیں۔

موتیے کے ہار اور گجروں کی بھرمار نے پورے
ملک کو بھینی، بھینی خوبیوں سے معطر کر کھاتا۔

خوست ماری عورتیں دن بھر پنگ توڑنے

کے بعد شام ڈھلتے ہی چاک و چوند ہو گئیں۔
چھوٹی لتا کی آمد آمد تھی۔ سفید چاندنی پر گاؤں تکیے
لگائے شم دراز تماش بین شراب سے لطف اندوڑ
ہوتے وفا فو قفاراہ داری کی جانب تکتے۔

دھان پان سی چھوٹی لتا، اپنی ماں کے ہمراہ
سرڈھانپے تانگرے سے اتری اور نہایت اعتاد سے
سیرھیاں چڑھتے گئی۔ خوش آمدیدی نعروں کے
شور و غوغاء میں چیف سازندے نے ایک بھاری
بھرکم موتیے کی کلیوں سے لداہار پیش کیا اور سرپر
ہاتھر کر آشیر باد دی۔

آندماں آمد یہ رکھا اور شان و شوکت
صاریحتی کے لیے موجب جیت ہنا۔ کوٹھے کے
بالقاہل کھدو میراثی کے جھرو کے سے یہ سب پچھے
بغور مٹاہدہ کرتے اُس نے سوالیں نظریں ڈالیں؟
سرکار یہاں کی نہیں، کسی مندر کی دادی
ہے۔ ہندی ہے۔ بہت اچھا گاتی ہے، ایک
بینچک کے پانچ سور و پیچتی ہے اُس کی ماتا!

کھدو نے اٹھی جبص یونٹ کے فیلڈ اسٹاف
کی طرح موٹی موٹی معلومات فرفراتلتے، دوس
چون شراب کی یوتوں کی سپلائی اور موصول کی مدد
ادا کی اور صابر کو الوداع کہنے کی خاطر اُس کے
پچھے سیرھیاں اترنے لگا۔

باتھ کے اشارے سے ’بس ٹھیک ہے‘ بچھے
آنے کی ضرورت نہیں، کا اشارہ کرتے صابر علی قلی
میں آ گیا۔ اول پریکارڈ کارکارا دروازہ کھولا، پھر نہ
جانے کیا سوچتے گاڑی بندگی اور کرتیں بائی کی
بزم گاہ کی جانب چل دیا۔ سیرھیاں چڑھتے
سازندوں کے سرتال میں باہمی ربط پیدا کرنے
کی گونج سنائی دینے لگی، دیدہ زیب بلوڑی
فانوسوں سے مرصن یہ کوٹھا تماش بینوں کے ذوق
قص و سرور کو منظر رکھتے آ راست کیا گیا تھا۔ سفید

گذہ ہو چکی تھیں۔ روز مرہ کے اس دستور سے صابر بخوبی واقف تھا۔ گلی میں جا بجا کھڑے بے زیب دیانت دلالوں کی نکٹریاں کاندھوں پر صافہ نما مفتر اور ترچھی توپی سجائے راہ گیروں کو گھیرنے میں مصروف تھیں۔

آن میں سے چند ایک صابر علی کو پہچان کر نہایت ادب و احترام سے دیاں ہاتھ سینے پر کھکھ کر پکارتے۔

” حاجی صیب ستے خیراں!“

☆.....☆

”ہاں بھی فوجی بھائیو کھانا کہاں کھاؤ گے؟“
ڈیڑھ گھنٹہ چب کا طویل روزہ توڑتے صابر نے سید سعید حسن اور راقم سے سوال کیا تھا؟
”کہیں بھی چلے چلو۔“ میں نے وقت پچانے کی خاطرفرازی پہنچ دیا۔

”سعید بھائی نمک منڈی چلا جائے؟“
”یار تیر اعذاب یہ ہے کہ تو بذات خود ہمیں لینے کے لیے گھر آپنچا ہے۔ آدمی انکار بھی نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی یہ بتاتا ہے کہ جانا کہاں ہے اور کرنا کیا ہے؟ اور پھر چب سادھ لیتا ہے۔ ”سعید حسن نے ہائے ہائے کرتے اپنی بے نی اور بے چارگی کا پُر زور ماتم کیا۔

”واہ بجان اللہ! اور جب آپ لوگ تین تین گھنٹے پتی دھوپ میں ڈرل کرتے ہیں اور چب سادھے کھڑے رہتے ہیں تو اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

میں نے 23 مارچ کی پریئہ دیکھی ہے۔ اللہ معافی خاموش بے میں چب، بس ساکت کھڑے رہو، گھوڑے پر سوار سالا وہ افرادہ دو تین ہزار بے بس فوجیوں کو فقط اپنی تکوار کے مل بوتے گھنٹوں بوجو کی طرح چھاتا ہا۔ وہ

چاندنی چوکو سرخ رنگ کے ایک چھوٹے سے مغلی گلدیلے پر بیٹھی یہ گلکارہ نظریں جھکائے آرکیسٹرا کی منتظر تھی۔

صابر علی کو اپنے درمیان پا کر کرتیں بائی خوشی سے پھولی نہ سمارہ تھی۔ صابر نے بھی تماش بینی نہیں کی۔ جب بھی بھی ٹھکے پر آتا ہوتا تو مقصود سو فیصد کاروباری ہوتا۔ یہ غونجواری تبدیلی کم از کم کرتیں کے لیے نہایت حیران کی تھی۔

چیف سازندے نے تیاری کا اشارہ دیا۔

چھوٹی لٹانے دھیرے سے سر اٹھایا۔ حاضرین مجلس کا فردا فردا چہرہ کرتے فرشی سلام پیش کیا۔ پھر صابر علی سے نظریں چار ہو گئیں۔ گندی رنگت، مناسب قد و قامت، پیکھی ناک، صاف شفاف چہرہ اور ہونوں پر ایک بہمی سی اداں مسکراہت، یہ نوار دکون تھا۔ لٹانے سرگوشی میں ماں سے پوچھا؟ چند منٹ مزید خاموش بیٹھے رہنے کے بعد صابر علی دھیرے سے اٹھا اور غلام گردش کی جانب چل دیا۔ سیرھیاں اتنے تک سازدا آواز متحرک ہو گئے۔

چھوٹی لٹانے جب ”کٹتے ہیں دکھ میں یہ دن پہلو بدبل کے“ کا مشہور و معروف نغمہ چیڑھا تو صابر علی کی سیرھیاں اتنے کی رفتار بذریعہ کم ہوتے ہوئے بالکل تھم گئی۔ اتنی سریلی اتنی مدد آواز؟

صابر نے گھوم کر پیچھے دیکھا۔ اوپر حاضرین مجلس کی واد وادہ میں کان بڑی آواز سائی نہیں دے رہی تھی۔ خاموش، گم، مدم وہ باہر نکل گیا۔ بوجھل قدم اٹھاتے گاڑی کے پاس بچنچا۔ سر گما کر ایک اچھتی سی نظر کرتیں کے کوئی نہ پڑا۔ بازار اب مکمل طور پر جاگ چکا تھا۔ گرد و پیش موسمیت کی لہریں اور گلکاروں کی صدائیں ایک دوسرے میں

بھی کیا پیشہ ہے اور یہاں سالی دو گھنٹے کی خاموشی مارے جاتی ہے۔“ صابر نے میرے زانوکو شرارت دبانتے کہا۔

سز 70-60 کی دبائی میں پیشے کے اعتبار سے فوج ایک نہایت پُر کش ادارہ تھا۔ ائمہ کرتے ہی طلبکاری ایک کیفر تعداد سلیکشن بورڈ کی تیاری میں مصروف ہو جاتی۔ کاماب کیڈیٹس جب بھی ملٹری اکیڈمی سے تعطیل پُر کھل لوئتے تو ہمہ وقت سینے بلیز راور فلیٹ ہیئت زیب تن کیے رہتے۔ یہ گھنٹی نارکینگ ٹائم، فوج کے آرزو مند طلباء میں جولانی کیفیت پیدا کر دیتی۔ سلیکنٹس ٹاؤن چندی میں ڈیوپٹی سجن نامی ایک صاحب طبلاء کو افسر سروز سلیکشن بورڈ (ISSB) کی تیاری کرواتے تھے۔

آپ پیشے کے لحاظ سے سائیگنلوجست تھے۔ بڑے بھائی یحیی طاہر محمود جیلانی نے ڈیوڈ صاحب سے رابطہ کرتے ارقام کی ایڈمیشن کروائی اور تین میئن کی ٹریننگ کے مبلغ ڈیڑھ سور و پے بھی ارسال کیے۔ بدستمی سے جس دن کو چنگ کلاسز شروع ہوتی تھیں اسی دن ہمیں شکار کرنے کی خاطر چوہا سیدن شاہزادہ ہونا تھا۔ یہ پلان آٹھ دس یوم سے مرتب کیا جا رہا تھا۔ سید سعید سنگھ حسین اور رام اس خاص موقع کی بڑے عرصہ سے تلاش میں تھے یہ وہ وقت ہوتا جب سردوپوں کی آمد پر چکوال کے نواحی علاقوں میں چیتے دیکھے جاتے۔ جھوٹی ٹائم کے اس چیتے کو مقامی زبان میں بڑا کے نام سے پکارا جاتا۔

گھنٹین کا آبائی گھر سلوی، چکوال میں تھا جو ہمارا بیس کمپ ہوا کرتا تھا۔ درحقیقت سلیکشن بورڈ کی تیاری میری ترجیح نہیں تھی اور میرے نزدیک بھی کی جا سکتی ہی، لہذا بھرپور بریک لگانے کے باوجود موڑ سائکل تحرک کوت کی وجہ

پلان کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا، گیارہ دن کی غیر حاضری کے باوجود ڈیوڈ صاحب نے خندہ پیشانی سے استقبال کیا اور ٹریننگ سائکل کے اختتام پر 50 روپے بھی یہ کہتے والپیں کر دیے کہ آپ نے یہ ٹریننگ صرف چار ہفت کی تھی؟ بہر کیف سلیکشن بورڈ کے طویل اور پچھیدہ مراحل طے کرتے اور گرتے پڑتے اللہ کے قسم سے سرخو ہوا اور ملٹری اکیڈمی پہنچ گیا، پہلی سرماہی ٹریننگ کے خاتمه پر دس یوم کے تعطیلات ہوئیں۔ پنڈی پہنچتے اگلے روز ہی شکار کا پروگرام بنا ڈالا۔ چکری اور گور خان کے مضائقات ہماری پنڈیدہ شکار گاہیں تھیں۔ گندم اور پتنے کے بھتوں میں بھورے تھے شام ڈھلتے ہی میدان میں اتر آتے اور ہم جیسے گھات لگائے شکار پوں کی بھینٹ چڑھ جاتے۔ وگرنہ مردانہ طریقہ کارتو انہیں ہوا میں مار گرانا ہوتا جو ناپختہ عمر کے اس حصے میں ہماری استعداد سے باہر تھا۔

ماضی کی طرح ہمارا رخ اُس شام کی مندرہ کی جانب تھا۔ بھائی طاہر محمود کی 12 ٹچ شارٹ گھن کوئی نے فوٹا کیا اور اخیر میں پیٹ کر سعید حسن کے پر کردیا۔ جنگل گرین فوجی جیکٹ اور مخصوص فوجی ہیئر کٹ میں ڈوبی وضع قطع لیے ہم دونوں ہیوی موڑ سائکل پر فرائٹے بھرتے براست ڈلہوزی بورڈ سے ہوتے مال روڈ چاپنچے۔ کمانڈر انچیف ہاؤس سے فلک پلی سی سڑک سے ایک سیاہ اسٹاف کار یک لخت نمودار ہوئی۔ نہ پائلٹ جیپ، نہ آوت طراییزرن نہ ٹریک پولیس کے سار جنگ نہ ملٹری پولیس کے پواٹھ میں اور نہ ہی خیریہ والوں کی جانی پچانی نیلے رنگ کی ٹوپیا جیپ چونکہ ہماری رفتار بہت تیز تھی، لہذا بھرپور بریک لگانے کے باوجود موڑ سائکل تحرک کوت کی وجہ

جنگ عظیم دوئم کی ساڑھے سات ہارس پاور نورشن موڑ سائکل میرے بہنوئی اسلم غزنوی کو ان کے کسی عزیز نے تحفناً پیش کی تھی، دیوبنگل تم کی اس بیت ناک مشین کو چلانا آسان کام نہ تھا۔ غالباً ان ہی وجہات کی بنا پر دونوں حضرات نے اسے ڈارا کر رکھا تھا۔ پانچ میلین پیروں میں کے دائیں طرف جزا موڑ کارکی مانند گیر شفت لیور اس کی بیت ناکی کو مزید ہوا دے رہا تھا۔

”ایسے اشارت نہیں ہو گئی میں دھکا دیتا ہوں۔“

سعید حسن نے عجلت سے موڑ سائکل کے پیچھے آتے ہوئے کہا۔
موڑ سائکل کو نیوڑل میں ڈالا۔ بیت کو ہلانا کون سا آسان کام تھا بکشل تمام جنتش ہوئی، فرسٹ گیر لگایا، پنج چھوٹے ہی جیسے مردہ زندہ ہو گیا، سکیورٹی اساف نازل ہوا چاہتا تھا۔ جس قلمی انداز سے سعید حسن موڑ سائکل پر سوار ہوئے کاش اُسے فلما یا گیا ہوتا۔ میرے باہیں کاندھے کا سہارا لیتے شاہ صاحب نے جست لگائی اور پچھلی سیٹ پر جا کرے غیر متوقع اس حکلے سے موڑ سائکل خوب ڈال گئی۔

اللہ کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو آج وی آئی پی جیل انک کی ہوا کھار ہے ہوتے طاقتو راجن کا سپینڈ و میٹر چند لمحوں میں اسی میں فی گھنٹے کو چھوٹے لگا۔ تعاقب میں سر کار بھی لپکی۔ مخالف سمت کی بلہ بولتی ہوانے پہلے تو سر پر اوڑھی نیبرٹ کیپ، کو ہوا میں اچھالا پھر دونوں آنکھوں کو رلا تے پانی سے لمبیز کر دیا۔ یہ پانی تند مخالف کی شدت سے بہتر رخساروں سے ہوتا کانوں اور گردن کو چھوٹے لگا۔ موڑ سائکل ایک بار پھر ڈال گئی۔

سے اضاف کار کے عقبی حصے سے جاگ کر آئی۔ ڈرائیور کے پیچھے بیٹھے سیاہ سوٹ میں ملبوس جس تحریک خپٹ سے میرا آمنا سامنا ہوا وہ جزل موئی تھے بعد مشکل موڑ سائکل کو سنبھالا دیا اور ایشن ہوتے ہوئے ساکت جسم کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ عام قواعد کے مطابق اگر کوئی جو نیز یا پیادہ ہو تو اس پر لازم ہے کہ سلیوٹ کرے اور اگر سواری پر سوار ہو یعنی سائکل یا موڑ سائکل پر تو سلیوٹ لازم نہیں، لیکن وہیں بیٹھے بیٹھے بازو اکڑا لیے جائیں۔

گندھیری کٹ پال فوجی جیکٹ اور فوری ایشن ہونے کے ایکشن نے میری اصلاحی عیاں کر دی۔ چند لمحوں کے ذلتی الجھاؤ کے دوران جزل صاحب نے ڈرائیور سے کچھ کہا پھر میری جانب دیکھتے خفیہ میگراہٹ لیے چل دیے۔ وی وی آتی پی کے حالتے ہی چیف ہاؤس کے پہلو والی سڑک پر جیسے خود کش حملہ ہو گیا باور دی کیا اور بے وروی کیا.....

تمام حضرات میں ایک کھلبی سی مج گنی۔ گشیدہ نیلے رنگ کی ایک جیپ بھی جانے کہاں سے لیا کیک نہ مودار ہو گئی۔ چیف کے ساتھ ٹکراؤ، غیر قانونی ہتھیار ڈرائیورگ اور موڑ سائکل کے کاغذات کی عدم موجودگی اور پھر..... جرم کا مرکب.....

زیر تربیت فوجی، ان گھبیر حالات کا ادارک کرتے ہی میں نے تھیہ کر لیا کہ بیباں سے فوراً بھاگ لیا جائے۔ لک شافت پر تقریباً کھڑا ہوتے اور وجود کا پورا پورا جھڈا لتے لک لگائی گئی لیکن بے جان انجنٹس سے مل نہ ہوا۔ سکیورٹی عملے کا فاصلہ ہم سے گھٹتے گھٹتے جب میں پچیس گزار رہ گیا تو میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

میں نے پہنچل بار کے دائیں جانب لے اکلوتے عقیل شمشے سے دیکھا۔ سید سعید حسن میری پیچھے کے ساتھ پیچھے ملا کر بینٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تسلسل پیچھے نظر کرنے کا نہایت عقائد ان اقدام تھا۔

”هم سے کتنی دور ہیں؟“ میں نے شاہ صاحب سے پوچھا؟ ”پانچ سے آٹھ سو گزر کا فاصلہ ہے ہمارے درمیان۔ موڑ سائیکل سوار تو کہیں نظر نہیں آ رہے لیکن جیپ خطرناک ہو سکتی ہے۔“ شاہ صاحب نے رنگ کشی دیتے صورت حال اور واضح کی۔

میں نے رفاقت بڑا کرسویل فی گھنٹہ کر دی۔ یہ ایک خطرناک اقدام تھا۔ بھاری بھرم میں پر قابو پانہ مشکل ہو رہا تھا۔ کھڑک رہا ہست سے تو پوس محوس ہو رہا تھا جیسے اس میں کسی ریکیٹ کا اجمن نصب کیا گیا ہو۔ مندرہ سے چند کوں پیشتر ایک پگڈنڈی بائی میں جانب نئے اترتی دکھائی دی۔ رفاقت آہست کرتے میں نے اپنی بھچل دنوں برلکیں ایک ساتھ لگائیں۔ پھر بھی ابھی کی حرکتی طاقت ہیں پگڈنڈی سے کہیں آگے لے آئی۔ شہر کے آفاق فلم The Great Escape ہیر و مکین Steve Macquin کی خاطر کیا کراس کشی پھٹ پھٹیا بھگکائی ہوئی جو میں نے دوڑائی، سڑک کے بائیں جانب ڈھلوان پر اترتے اور مختلف سمت میں کانتے پگڈنڈی کو جالیا۔ بوہڑ کے ایک قدیم درخت کے تنے گندے جوہڑ کے ساتھ نسلک، مندوش کوٹھے کے پہلو میں پناہ لیتے، سڑک کی جانب نظریں مرکوز کر دیں۔ چند لوگوں کے توقف کے بعد فرانٹ بھرتی سکیوڑی جیپ برق رفاقتی سے ہمارے پاس سے گزرنگی۔

”مالے کو زیادہ ہی سنجیدہ لیا جا رہا ہے، کیا خیال ہے؟“ سید سعید حسن نے جیپ کے پیچھے اڑتی دھول کو دیکھتے سگریٹ سلکا یا۔ ”شاہ صاحب واپس جانے کا یہ ہی موزوں وقت ہے تا خیر کی صورت میں مشکلات کا سامنا ہو سکتا ہے۔“

معاذ دائیں جانب کہیں نزدیک سے بھورے تیز تر کی دے درپے کا لائز نے ہمیں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے پر تجوہ کر دیا۔ سکراتے میں نے موڑ سائیکل اسٹارٹ کی۔ چند سو گزر کے فاصلے پر پگڈنڈی جب کھٹتے کھٹتے جھپڑ پر یوں میں گذہ ہو چکی تو گاڑی وہیں پارک کرتے پیدل چل دیے۔ مرگ آفات میں بمشکل ہیں پچیس منٹ پہنچے ہوں گے۔ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تیسم لانقدر ابازیوں کی بیری اور کیکر کے کامنوں نے قلعہ بندی کر رکھی تھی۔

تین چار فٹ اوپر جی اس پاڑ کا سلسلہ ہمیں ایک موڑ آڑ پیش کر رہا تھا۔ داہیں بائیں جائزہ لیتے میں نے ایک مخصوص جگہ پر بھگوہ نسب کیا اور جھاڑی کی آڑ لے کر پیشہ گئے۔

تین فٹ کا یہ رنگ کھردرا کپڑا تیز کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے کی پوشیدہ قوت رکھتا تھا۔ اس حکایت کے راوی جناب ثنا احمد چوہان تھے جو پڑوی اور عمر میں مجھ سے کہیں بڑے ہوئے کے باوجود نوجوانوں کی صحبت میں بہت خوش رہتے اب یہ محض اتفاق تھا یا بھگوے کی کرامات کھیتوں کے سامنے اور دائیں جانب واقع چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے تیروں کے ہوکے گو بنجے لگے، شکاری زبان میں ہوکا، اُس آواز کو کہا جاتا ہے جو کال دینے سے پہلے نکالی جاتی ہے۔ دل مودہ لینے والی اُس دلکش آواز کو قلب بند نہیں کیا

‘کورس’ کی صورت میں اس کا جواب آیا۔ کوشش کے باوجود موڑ سائکل کہیں نظر آئی۔ بے شک ہم بھٹک جھکتے تھے۔ دور بھی اُن روڑ پر رواں ٹریک کی پیاس جھلکتی نظر آئیں۔ اگر ہم جوہر والے کوٹھے کے پاس پہنچ جاتے تو دوبارہ ست کا تین کر سکتے تھے۔ قصہ مختراند میرے میں ادھر ادھر ٹاک ٹویاں مارتے بالآخر منزل پر پہنچ گئے۔ ہید محرز رفیق راجہ آف پولیس چوئی روات، صوبے دار غلام مرتفعی بھی اچھ کیوں فیلڈ سکیورٹی سیکشن اور ہمنونے بلند آواز سے ہینڈز اپ کا حکم صادر کیا۔ فوجی روایات کا پاس کرتے ہوئے ہم دونوں نے یکجنت تھیار اور تیتر و ہیں پھیلے اور ہاتھ آسان کی طرف بلند کر دیے۔

بھوہر کے پہلو میں کھڑے نورشن موڑ سائکل اور چیپ ہمارا منہ چڑا، ہی تھیں لال کرتی میں واقع سکیورٹی دفتر پہنچا دیا گیا۔ ایک نہایت لاغر اور قریب المرگ یمنحر صاحب نے بار بار ہمارے فوجی شناختی کارڈ ملاحظہ کیے اور پھر ایک ایسا منظر نام پیش کیا جس نے ہمارے چھکے چھڑا دیے۔ سارے جہاں میں کا لکر تے اور شناختی کاغذات کو اٹلتے پلتتے رات کے دس بجے گئے۔ اکتا ہٹ، جھنجلا ہٹ اور طیش میں نے سگریٹ پینے کی اجازت چاہی۔

”NO“ موت کے سہوار نے اپنا ساتواں وڈباہیں کا سگریٹ ایش نڑے میں نہایت بے دردی سے مسلتے ہوئے کہا۔

پھر ایک اور کال نہ جانے کہاں سے آئی۔

”رائٹ سر.....“

”سر.....!“

”سر.....!“

”سر رائٹ سر.....“

جا سکتا۔ پے در پے ’ہو کوؤں‘ کی کان پڑی سگت میں اکا ڈکا تیتر ہماری جانب یا پھر ولڈ عالم بھگوے کی جانب بڑھتا اور دادا نہ کا چھٹا نظر آیا۔ سعید حسن نے خاموشی سے میرا بازو دبانتے تیتر نہایت آزادی اور بے پرواہی کے انداز میں بخوبی سے زمین پھرو لئے نظر آئے۔ یہ ایک ناقال یقین صورت حال تھی۔ اتنی کثیر تعداد بھی چڑیا گھر میں بھی اکٹھی نہیں دیکھی جاسکتی۔ خیر صاحب بھگوہ نہ ہوا اوڈن سینما میں انگریزی فلم، باب اینڈ سیلی، ہو گئی جو مقتضیاً نے صرف بالغوں کے لیے لکھ کر پہنچ دی کی نالانچ اکٹھیت میں ایک اسی بھجانی کیفیت پیدا کر دی کہ ہر ’ترس‘ منہ اٹھائے سینما کی جانب چل دیا۔

میں نے بندوق کی نالی میں ’چار نمبر‘ کے دو کارتوں لوڑ کرتے سعید حسن کو شوت لینے کی دعوت دی۔ موصوف باقی چھ منٹ شست لیے بیٹھے رہے غالباً اپنے شکار گول روپ کی صورت میں اکٹھا ہونے کے منتظر تھے۔ پھر آپ نے ایک عجیب حرکت کی دونوں ’تالیاں‘ اکٹھی داغ دیں ایک ’کان پھاز‘ تم کا دھاکہ ہوا، بندوق چلنے کی پیس کشی (Re-Coil) کی وجہ سے بھائی صاحب برشکل تمام سنبھل پائے۔

سامنے چھ عذر دیتے اس طرح ساکت پڑے تھے گویا بے جان ہی پیدا ہوئے تھے۔ میری ذاتی رائے میں کسی بھی شکاری کا یہ ’ریکارڈ‘ شکار تھا۔ ہم تیتروں کو ذبح کرنے کے بعد موڑ سائکل کی طرف چل دیے۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ درختوں پر بسیرا کرنے والا لاتعداد پرندوں کی بولیاں ماحول کو زندہ رکھے ہوئے تھیں۔ باہمی جانب سے گیڈر نے ایک ’من ہاؤس‘ کاں دی فوراً ہی

کشت کے بعد کہیں جا کر میسے کی ریل پیل دیکھنے
میں آئی تھی، اسے یوں ون تو قھری ہوتا دیکھ کر اس
نے اقلیت برادری کے بانی، حکم چند اندازی شیر
ہفت روزہ بستنت سے رجوع کیا۔ صابر اس قسم کی
صورت حال کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ جن
بازاروں میں اُس کا طوطی بولتا تھا کیا جمال تھی جو
حکم عدالتی کی جاتی۔ کسی کے خواب و خیال میں بھی
یہ بات نہ آتی، اگر تالانی کے کسی مکالمہ کو شے سے
برآمد سر بریدہ لاش درحقیقت کرتیں یا انی کی ہوتی یا
ترنول ریلوے کرائیں پر نامعلوم پہلی لاش شری
رام دیو کی نکتی بدستی سے جہاں کہیں دل کا
معاملہ ہو وہاں بھی دل بھی دل کے بس میں رہا
ہے؟ یہی حقیقت صابر کا الیہ تھا، خیر صاحب اگلے
روز ٹھیک چار بجے شام صابر علی کی موڑ کارگر کے
سامنے زکی مختصری ہارن کی آواز سننے میں باہر آیا
اور ہم سعید حسن کی طرف چل دیے۔

شادہ صاحب گویا گھر کے چھانک کے پیچے
تیار ہی کھڑے تھے آہت پاتے فوراً ہی باہر
آگئے۔ شامت اعمال تعاقب میں اماں بھی چلی
آئیں۔ گاڑی میں ناپسندیدہ افراد پر نظر جو پڑی
تو غم و غصے کا اظہار کرتے چھانک زور سے دے
مارا۔

”ابے تیری اماں نالاں ہیں کیا ہم سے۔“
ڈکایا تھا میں نے وہی پر انارونا روایا۔

”بس چاہتی ہیں کہ گھٹنے کے ساتھ لگا بیٹھا
رہوں۔ کل ڈانٹ پلائی کہ اتنی دیر سے کوئی
لوٹے اب تم دونوں بے غیر توں کو دیکھا تو تملہ
اٹھیں۔“ شادہ صاحب نے حقیقت پر منی اپنا دکھرا
رو دیا۔ دوران سفر میں اور سعید حسن گزشتہ شب کی
مہم کے بارے میں نہنگو کرتے رہے جہاں شاہ
صاحب سکیورٹی کے قرب المگ ت مجرم صاحب کی

رسیور پنجھت موصوف نے پھونکوں سے
سگریٹ کی راکھ کو دیکھ لے گئے شے سے اڑانا
شروع کر دیا۔ پھر ہتھیلی سے شے پر صفائی کا آخری
کوٹ کرتے ہوئے بولے۔

”آپ لوگ جا سکتے ہیں۔“

☆.....☆.....☆

”صابر علی نے آج دو چکر لگائے۔ کہہ رہا
تھا کل شام پھر آئے گا۔“ والدہ محمرہ نے
اکڑے تیڑوں کے لاثے شکاری تھیلے سے نکال
باہر کرتے عنديہ دیا۔ میرا ما تھا ٹھنکا، پچھلے کئی ماہ
سے صابر اضطرابی کیفیت سے دوچار تھا۔ چھوٹی تا
کے ساتھ جون کی عدالت لگا جو جوانہ اپنام میں
 فقط گانے بنانے تک مدد و درہا اب عشق کی
صورت اختیار کر گیا، اس کا کوٹھے پر روزانہ
حاضری دینا، پتنتھیم کو ایک آنکھ نہ بھاتا، لیکن
صابر کے رعب اور بد بہ کی بدولت کرتوما سی اور
ہمتو خاموش رہتے۔ مقدس قسم کے اس عشق میں
بتلا یہ جوڑا شائکی اور شرافت کی بدولت اپنی
مشال آپ تھا۔ بقول سعید حسن عجیب عشق ہے
سالا، بس ایک دو بجے کے سامنے سر جھکائے بیٹھے
ہیں۔ بقیہ تماش میں جہاں میسے لاتے رہے وہاں
حاجی صاحب فری پاس پر عشق فرماتے رہے
لا جوں ولا قوۃ الا بالا شادی کر لے بھائی اور
گھر بسا، یہ کیسی پاک محبت ہے؟ نہ انگلیاں اٹھ
رہی ہیں نہ چپ گلوکیاں ہو رہی ہیں نہ لعن طعن اور نہ
ذلت اور نہ رسوانی۔

یہ بھی شنید تھا کہ چھوٹی تا کے ماتا پتا اور صابر
کے مابین شدید نویعت کی کشیدگی اُس وقت پیدا
ہوئی جب صابر نے اصرار کیا کہ لاتا کوٹھے پر مغل
سجانے سے روک دیا جائے۔ یہ سننا تھا کہ شری
رام یوکو روزی روٹی کے لالے پڑ گئے۔ اتنے

”وَذَهْقَصَائِيْ حَاجِي صَيْب۔“ (بِرَا قَصَائِيْ)
 ”اچھا.....ٹھیک اے۔“ (اچھا ٹھیک ہے)
 ”اساں جلے آں.....رب را کھا۔“ (ہم
 جار ہے ہیں اللہ حافظ)

ابے سی آئی اے کے ایجنت یہ کاہے کالین
 دین یہ کیسا سودا؟ حرام ہے جو سالے کوئی بات
 بھی پلے بڑی ہو۔ سعید حسن نے حب معمول
 ہائے ہائے کی۔

خاموش رہتے صابر نے گاڑی گھمائی اور رخ
 اندر وون شہر کر دیا۔ بازار کلاں کے کونے رگاڑی
 پارک کرتے صرف اتنا کہا کہ اتر اور قصائی گلی کی
 طرف چل دیا۔ دلالوں کی ٹولیاں ہماری پارکی کو
 بازار میں آتا دیکھ کر ادھر ادھر ہنکرنے لگیں۔

صابر کی کوہاٹ تلے والی چپل کی مخصوص
 چرچاہٹ، دایں بائیں کھوکھوں میں بیٹھے
 تاجریوں کو اس کی آمد کی پیشگوئی اطلاع کر دیتی۔
 خوش آمدیدی کلمات کو نظر انداز کرتے بازو
 اکڑائے ناک کی سیدھ میں چلتا صابر یکجنت
 کرتوماں کے کوئے کی سیر ہیاں چڑھنے لگا۔ سعید
 حسن نے میری جانب معنی خیر نظریں دوڑا میں۔
 چند سیر ہیاں چڑھتے ہی چھوٹی تا کی مہر آواز
 کانوں میں گونجنے لگی۔ سارگی ستار اور طبلے کی
 تھاپ کا سگنت نغمہ سراہی کو چار چاند گارہ تھا۔

یوں حرتوں کے داغ محبت میں دھولے
 خود دل سے دل کی بات کی اور رو لیے
 گھر سے چلے تھے، ہم تو خوشی کی تلاش میں
 غمِ راہ میں کھڑے تھے وہی ساتھ ہو لیے
 اُس دور کے مشہور و معروف نغمے کو چھوٹی تا
 کی آواز میں سنتے میرے ذہن میں دو باتیں
 آئیں۔

پہلی تو یہ کہ اگر کہیں تا ملکیکر اس آواز کوں

عجیب و غریب شفیقت کو یاد کر کے محفوظ ہوتے
 رہے وہاں بجھا بجھا سا صابر علی خاموش گاڑی چلاتا
 رہا۔ میری تشویش کے اظہار پر فقط اتنا کہا کوئی
 خاص بات نہیں۔ باتوں باتوں میں ہمیں یہ گمان
 بھی نہ رہا کہ اس وقت ہم دسہر اگر اؤڈنڈ کے قریب
 ایک بوسیدہ سی عمارت کے تلے کھڑے تھے۔ نہ
 جانے کہاں سے ایک مخصوص سیاہ کالا گردار یکجنت
 نمودار ہوا۔ دائبے ہاتھ کی پانچوں انگلیوں میں
 عقیق اور فیروزہ کی جزا اگلکو ٹھیاں کا لے دھاگے
 میں پر دیا گلے میں لٹکا چاندی کا تھویڈ، اور دنداسے
 زدہ سوزوں اور سیاہی مائل بلوں پر سرخ رنگ
 کے مستقل نشان..... یہ استاد پیڑو تھا۔ صابر کا
 سیکنڈ ان کمانڈ!“ کے حالات نے؟“

(کیا حالات ہیں؟)
 ” حاجی صیب دو پارٹیوں کے علاوہ آل
 کلیستر ہے۔“
 ”یہ پارٹیاں کیڑھیاں نے وائے؟“ (یہ
 کون سی پارٹیاں ہیں؟)
 ” حاجی صیب اعظم ملکوتے شہزادہ مہمی۔“
 (اعظم ملکو اور شہزادہ مہمی)
 ” کئے دیہاڑے اتے ہوئی گئے نے۔“
 (کتنے دن اوپر ہو چکے ہیں)

”تن چار بھتے۔“ (تین چار بھتے)
 ”ٹھیک“ وارنگ دے اناں کی جے کل بکر
 کلیستر نہ ہو یا تاں اڈے بند کری چھوڑ۔“ (ان کو
 وارنگ دیں ورنہ اڈے بند کر دیں)
 ” تاں اشاک اشقاۓ بچوی نے گھر
 شفت کری چھوڑ۔“ (اشاک اشقاۓ بچوی کے
 گھر شفت کر دو)
 ”یہ کہ شہزادہ مہمی کیڑا اے؟“ (یہ شہزادہ مہمی
 کون ہے؟)

نے نفی میں سر ہالا یا اور صابر کی طرف ہاتھ کرتے
اپنی بندھی کھولی۔

(غالباً تجاتکی کہ بس بھی کیجیے)

”سر کار بٹیا اجازت کی طلب گار ہیں۔“
چیف سازندے نے از خود نوش لیتے صابر سے
درخواست کی۔

بالآخر سرکی غفیف سی جنمش نے تا کے چہرے
پر اطمینان کی اک لہری دوڑا دی۔ کسی تماش بین
نے پچھے سے آواز لگائی۔

”میرکری.....“

کوٹھا جیسے چاگ اٹھا۔۔۔ سازندوں نے سر
چھپرے اور چھوٹی لانے گیت
یہ شام کی تھا بیاں ایسے میں تیرا غم
پتے کہیں کھڑکے، ہوا آئی تو چوکے، ہم
جس راہ پر تم آنے کو تھے
اس کے نشان بھی مشنے لگے
گانے کے دوران محفل عروج پر تھی تو صابر
نے سرگوشی کرتے مجھے اٹھنے کا مشورہ دیا۔

”یار گانا تو ختم ہونے دے۔“
”مجھے ماحول سے وحشت سی ہو رہی ہے۔
بس اٹھ چلو ورنہ میرا دل بند ہو جائے گا۔“ بادل
خواستہ نشست چھوڑی، چلتے چلتے میں نے اک
نظر تپڑا۔۔۔ دونوں ہاتھ اٹھاتے اس نے اپنی
بے بی کا اظہار کیا۔

میرے دل میں اس کے لیے ایک عجیب سی
ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ خاموش سے میر ہیاں
اترتے ہم پھر بازار میں آگئے۔

ماحول بے کیف اور سوگوار ہو گیا۔
”اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتا یا ر؟“
سعید نے صابر سے سوال کیا۔

کسی اور خیال میں کھوئے ہوئے کہنے لگا۔

لیتے تو شاید یہی سمجھتی کہ اسی کی آواز کاریکار ڈنچ
رہا ہے، اور دوسرے اس خاص وقت پر جبکہ صابر
آیا چاہتا تھا کیا یہ گیت سوچی بھی چال تھی یا
اتفاق؟ بہر کیف جو سمجھتی تھا گانے کے یہ چار
بند بہت معنی خیز تھے۔ جیران کن بات یہ تھی کہ آج
یہ دونوں ایک دوسرے پر نظریں جائے بیٹھے
تھے۔ غم راہ میں کھڑے تھے وہی ساتھ ہو یہی
کی فلاں جب سعید حسن کی سمجھ میں آئی تو کچھ
افر دہ ہو گئے۔ گیت کے خاتمے پر چھوٹی لانے
فردا فردا ہم تینوں کو آداب پیش کیا اور پھر اگلے
گانے کے پہلے بول دھیرے سے گن گناہتے
سازندوں کو خبردار کیا۔

تجھ بہ کار کار گروں نے چند ہی لمحوں میں سر
اور تال سیدھے کرتے آنکھوں ہی آنکھوں میں
اپنی تیاری کا عنڈن دیا۔

پندرہ بیس تماش بینوں میں سے تجسس زدہ
چند ایک گاہے بگاہے ہم تینوں پر اچھتی سی نظر
ڈالنے جانے کیا جانا چاہتے تھے۔

میں نے صابر کی جانب دیکھا۔
اس کے چہرے پر انتہائی اضطرابی کیفیت
دیکھتے پریشان ہو گیا۔

اجازت ہے؟
چھوٹی لانے دیاں ہاتھ دھیرے سے ماتھے
تک لے جاتے صابر سے نغمہ سرائی کی اجازت
چاہی۔

صابر شاید ایسی ادا کے لیے تیار نہ تھا۔
پس منظر کی موسمی نئے کی دھن والا پتی رہی۔
چھوٹی لانہ فریب مکان جائے صابر پر ٹکٹکی
باندھے بیٹھی تھی۔

”شروع کیجئے نا.....“ سعید حسن نے قطل کی
سی کیفیت کا جمود توڑنے کی ابتدا کی۔ مسکراتی تا

محسوس کر رہا ہوں۔ سعید کا اور اپنا پروگرام جلد از جلد واضح کریں کچھ فیصلے اور کچھ باتیں کرنا اشد ضروری ہیں۔

جہاں بھوچال بنیا فصیل درمیں رہتے ہیں
ہمارا حوصلہ دیکھو ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں
صاربعلیٰ

ایک ماہ بعد چار ہفتے کی ٹرم بریک ہونے والی تھی۔ سعید سے رابطہ تو نہ ہو سکا لیکن صابر کے حالات جان کر تشویش ضرور ہوئی۔ میرے مطابق صابر ایک نہایت خطرناک کھلیں کھلیں رہا تھا۔ دھندرے سے غسلک بے روزگار لوگوں کی مدد کرنا، ان لوگوں سے دشمنی مول لینے کے متادف تھا جو بطور پیشہ ان سے یہ کام کر رہا تھا۔ آخر روزی روٹی کا مسئلہ بھی تو تھا۔ نہ جانے کیوں صابر علی بلاوجہ خدائی خدمت کا رہا، گمراہ لے لفگنوں اور علاقہ غیر سے تعلق رکھنے والے جراحت پیشہ لوگوں سے لڑتا بھرتا رہا۔ اب چھوٹی تاکوہی لے لیجیے والدین کے لیے تو وہ سونے کی چیزیاں تھیں لیکن صابر علی کے نزدیک وہ اپنی مرضی کے خلاف قصائی گلی میں بھائی گتی تھی تھی کھلے عام اس بات کی نہ مت کرتے جب تاکے ماتا پتا پر مزید باوڈا لگا گیا تو ان کا بہت شدید ردعمل آیا۔ معاملہ اب سیاسی نویجت کا بن چکا تھا۔ ہندو چنگا بیت نے اسے اقتیوں سے نااصاف ڈیکھ لیکر کرتے ہوئے صابر اور اس کے حواریوں کے خلاف متحده محاذ قائم کر لیا۔

ایسے ہی جذبے سے سرشار لاوارث خواتین کو بردہ فروش مافیا کے چنگل سے آزاد کرنے کی پاداش میں صابر تین چار گروہوں کی بہت لست پر آگیا۔ موصوف تازی کتوں کی مدد سے خرگوش کے ٹکار کے بھی شوقیں تھے۔ ایسی ہی ایک ہم

” یہ اگرچہ بازار ہے لیکن یہاں سانس لیے کردار کسی نہ کسی طرح ان ہنگاموں سے جڑے ہیں جن کے پیچے ہزاروں کچی کہانیوں کا درد ہے۔ کچھ لوگ ان حادثوں کا شکار ہوتے ہیں کچھ حادثے برپا کرتے ہیں جبکہ اکثر یہ خاموش و مجبور رہ کر ناسا زگار حالات کا شکار ہو جاتی ہے۔ محبت دل گئی شادی بیاہ یہ سب افسانوی ٹھے کہانیاں ہیں، فقط سات سو گزر محظی عیش و عشرت کا یہ بازار بھی انکا ماضی میں گزرے لمحات، محرومیوں اور نامراد پوں کی وہ ہزار دا بیتان ہے جہاں پر ہر فرد پاپے زخمی ہے۔ یہاں بد نصیبی اور بدنالی آپ کے پیش پیش چلتی ہے۔“ صابر کی فلسفیانہ سوچ نے ہم دونوں کو ششدیر کر دیا۔

حالات کی تزاکت کو سمجھتے میں نے فوراً اپنے غیر سنجیدہ رویے پر معذرت چاہی اور کہیں مل پیٹھ کر حالات کا احاطہ کرنے کا مشورہ دیا۔ اگلے چند روز کسی قسم کی پیش رفت نہ ہوئی۔ نہ صابر آپا اور ہم نے کوشش کی۔ تعطیلات اختمام پن پیر ہوئیں۔ سعید مجھ سے تین دن پہلے رسالپور روانہ ہو گیا۔ اکیڈمی پنجنے کے ڈریہ دو ماہ بعد صابر کا ایک خط آپا جس کا متن کچھ یوں تھا۔

” توفیق بھائی۔“

آداب.....!“

آپ لوگوں کے جانے کے بعد حالات نے برا عجیب پٹا کھایا۔

چھوٹی لتا غائب کر دی گئی ہے۔ اُس کی گشادگی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ لگتا ہے اُس کے والدین اس سازش میں شریک ہیں۔ میری سرتوڑ کوشش کے باوجود کوئی سراغ یا کھون نہیں مل رہا۔ ایسے مشکل وقت میں آپ دونوں کی غیر موجودگی بڑی شدت سے

جوئی کے اختتام پر فتح گنگ کے قریب عیسیٰ خان آفریدی گینگ نے ٹکار پارٹی کو گھاٹات لکا کر جملہ کیا۔ دونوں جانب سے شدید فائز گنگ کے تباہے میں صابر کے تین آدمی گھاٹل ہو گئے جبکہ آفریدی اپنے ہتھیار چار جنگجو مردہ حالت میں چھوڑ کر بھاگ لکا۔ اس گینگ وار کو میڈیا نے بہت اچھالا۔ انگریزی روزنامہ دی پاکستان نائمنر نے تو صابر کو ماڈرن راہ بن ہڈ کا درجہ دیتے آدھے صفحے کا ادارہ یونیکل لکھا ہوا۔

پاکستان نائمنر کے اسی ادارے کے آخر میں یہ خدش ظاہر کیا گیا کہ گینگ وار کے باہمی تصادم میں محمد خان گینگ نے صابر کو بھرپور سپورٹ کیا کیونکہ انہی کی دعوت پر تو وہ ٹکار کھیلے آیا تھا۔

ملٹری اکیڈمی ایک ماہ کے لیے بند کردی گئی سعید گھر سے چند روز پہلے کے آپکے تھے۔ صابر علی سے رابطہ کیا گما۔ ”توپی را کھٹیں میننگ طے پائی۔ میں اور سعید چھلی تالاپ کے بائیں جانب سڑک سے مسلک ایک پلی پر بیٹھ کر سکریٹ نوشی کرنے لگے۔ زردرنگ کی اوپر ریکارڈ کی وقت بھی آیا چاہتی تھی کہ سڑک کی چھلکی جا ب ایک مورس ٹیکسی نے عجیب خیہ انداز میں پہلے ہمیں تیزی سے پاس کیا، پھر چند منٹ کے وقفے سے واپس لوٹتے ہمارے نزدیک زور سے بریک لگائی، گھاڑی کی اڑائی دھول نے ایک سموک اسکرین کی بنا دی؛ جس کے بیٹھنے سے پہلے چھلکی سیٹ سے صابر نہ مودار ہوا۔ سرخ افغانی توپی جسم پر لوٹی اور ہاتھ میں شین گن جس کی فٹ روڑ کی طرح سیدھی دو میکرین ڈوری کی مدد سے اک دو بے کے ساتھ نصی کر دی گئی تھیں۔ نہ جانے کیوں صابر کے تیوار اور حلیہ دیکھ کر ایک انجانے سے خوف نے مجھے بھی اندازہ بھی نہ تھا کہ وہ میری محبت میں اتنی بڑی طرح گرفتار ہو جگی ہوگی۔ مسلسل آنسو بھاتے

اوٹ میں چھپاتے صابر سکم ہتھیار لیا اور جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ یہ بیٹھی ہے، کرٹی جا چا محمد خان، مختصر ساتھ اکار کرواتے صابر نے شکرے کی طرح چھوڑنے نظر دوڑائی اور پکی کے ہوم بیک کی طرف اشارے کرتے بیٹھنے کو کہا۔ میری چھٹی حس بیدار ہو گئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ میرے چہرے کو بغور دیکھتے لگا۔

”گھبراو نہیں حفظ ماقدم کے طور پر کبھی معمول سے ہٹ کر بھی قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ تمہاری گھبراہٹ ایک فطری امر ہے اگر آپ دونوں تھوڑے سبڑا مظاہرہ کریں تو آپ لوگوں کے جانے کے بعد اب تک جو کچھ ہوتا رہا وہ بتائے دیتا ہوں۔“

ای اشاعہ میں ہمارے عقب میں بھورے تھے نے ”ہو گا“ لکایا۔ پھر جوابی ”ہو کے“ دائیں بائیں سے ایک ساتھ لگے۔

اور پھر نقطہ عرضہ، ”کہ کہ کہ..... کہ کہ کی پے درے میں موٹی یلا غار ماند پڑی تو صابر بولا۔“ ”تم لوگوں کے جانے کے بعد احساس تھائی شدت سے تھک کرنے لگا۔ دل جیسے اچاٹ سا ہو گیا ہو۔ شام ڈھلتے ہی نہ جانے کیوں میرے قدم اُس بازار کی جانب اٹھنے لگتے۔ چھوٹی لٹا کو یوں کوٹھے پر بیٹھا دیکھ کر میرا خون اندر ہی اندر گھونو لے گلتا۔

ایک دن میں نے اُس سے تھائی میں ملنے کا ارادہ کیا۔ کرتونے حامی بھرتے سٹی صدر روڈ پر واقع اپنی ماہی کی بیٹھک میں یہ ملاقات کرواتی مجھے بھی اندازہ بھی نہ تھا کہ وہ میری محبت میں اتنی بڑی طرح گرفتار ہو جگی ہوگی۔ مسلسل آنسو بھاتے

کو افسردا کر ڈالا، بازار کی رونقیں بے رونق ہو گئیں۔ رنگ برلنگے پیشوں سے تعلق رکھنے والے پھیری پاڑ، زیرِ گھی بان، دکانوں اور گھوکھوں کے سامانوں نتھے دیکے کھڑے رہتے۔ ‘پار موسیٰ میے دے’ کی تیز چھٹتی لکاریں نہ جانے کیا ہو میں؟

تیزی سے میرھیاں چڑھتے میں تماش بینی کے مرکزی ہال میں آگیا۔ میرے بالکل سامنے نیٹھنی اداں تاکھڑی تھیں۔

ویران کوٹھے کا سرسری جائزہ لیتے میں نے کرتو کی جانب دیکھا؟ ”سرکار..... پچھلے کئی دنوں سے بی بی آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ مُغفل بھی لگنے نہ دی۔ دھنہ چوپٹ ہو کے رہ گیا سرکار!“

میں نے سوسو کے دس نوٹ نکالے اور مای کے ہاتھ میں دے دیے۔ کرتو کی باچھیں کھل گئیں۔

بے ڈھنگے پن سے میری پلاسیں لیتے اس نے روپیہ و صولا اور زنان خانہ نکل گئی۔ ایک بیماری سکراہٹ ڈالتے تا نے سازندوں کو چند ہدایات دیں۔ پھر میری طرف دیکھتے یوں۔

”اب یہاں کوئی نہیں آئے گا!“ سازندوں نے ساز چھٹرے اور نغمہ سرانے نغمہ.....!

خیام کی موسیقی میں فلم، ٹھکون، کامشہر گیت گلوکارہ بجھت کرنے گایا تھا۔ بہت کم مدت میں اس کی نغماتی شاعری نے بے انتہا شہرت پائی۔

تم اپنے رنگ دعم
اپنی پریشانی مجھے دے دو

اور ہاتھ جوڑتے ایک ہی التجا، بس مجھے یہاں سے کسی طرح نکال لے چلو۔ آخر بحکمت میں آؤ گے جب نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا؟ اس کی جگہ سوز نیفیت کے باوجود کوئی فیصلہ نہ کریا۔

جاتے ہوئے صرف اتنا ضرور کہا کہ مجھے چھوڑا وقت چاہیے۔ آئندہ کئی روز سخت پریشانی میں گزرے۔ احساس جنم تھا اپنی بے نی مجھے خود سے وحشت سی ہونے لگی۔ کئی مرتبہ بے تو جی میں بازار کی جانب ہو لیتا۔ پھر اسے تصویر میں تماش بینوں کے چکھٹے میں بیٹھا دیکھ کر..... اُنکے پاؤں لوٹ آتا۔ یہ عجیب صورتی حال تھی۔ پوری زندگی اس طرح کی خرافات سے دور رہا اور اب دل و دماغ میں اس کی سوچ کے علاوہ اور کچھ بھائی نہیں دیتا۔“

یہ سب کچھ کہتے صابر یکدم خاموش ہو گیا۔ تینروں کی ہاہا کارماند پڑ گئی۔

تحکما ناندہ نہ حوال آفتاں ڈوبنے کی تاری پکڑنے لگا۔ بد نما کمر وہ چنگاڑیں سورج کی تکش موت سے لاخٹنے پنچی پرواز کرنی ماں محل کو مزید سو گوار کرنے لگیں۔ معا پکشی چند لمحوں کے لیے جھاڑپوں سے باہر نکلا، صابر کی طرف سے کسی قسم کا رد عمل نہ پا کر دوبارہ میں گاہ میں چھپ گیا۔ صابر نے سر سے ٹوپی اتاری اور بالوں کو سنوارتے کہنے لگا۔

”میں نے بازار کا رخ کرنا چھوڑ دیا۔“ دو ماہ گزر گئے۔

ایک دن کھدو میراثی نے چھوٹی تاکا پیغام دیا کہ ملنے کی آزو کر رہی ہیں۔

میں سوچ میں پڑ گیا، پھر نہ جانے کیوں شام کو ’بازار‘ جانکلا۔

چار پانچ روز سے مسلسل گرتی بر کھانے ہر چیز

غزل

سائے میں تیرے حسن کے جب تک میں جیوں گا
 وعدہ ہے مرا تمھ سے ، تمھے پیار کروں گا

اے جانِ غزل ! اور ذرا دیرِ شہر جا
میں دکھ کے تمھ کو ابھی کچھ اور لکھوں گا

ربنے دے ابھی چہرے کو تو سامنے میرے
میں حسنِ بجم کی کتاب اور پڑھوں گا

اے جانِ ترنم ! میرے کچھ شعر نادے
خود اپنا ہی میں سازِ نفس آج سنوں گا

تو ، اے ورقی زیست ابھی ختم نہ ہوتا
کچھ اور لکھوں گا ابھی کچھ اور لکھوں گا

انھوں تیری محفل سے کہاں مجھ میں ہے جرأت
ہاں تو جو اٹھائے تو بصد شوق انھوں گا

باتیں ہیں بہت کہنے کو اس سے مجھے ناچُل
جب سامنے پہنچوں گا تو کچھ بھی نہ کہوں گا

نازشِ رضوی

تمہیں اس غم کی تسمیہ
اس دل کی یاری میں مجھے دے دو
پر ما نا میں کی قابل نہیں ہوں ان نگاہوں میں
تمہور اسما ہے اگر یہ دکھ یہ حیرانی مجھے دے دو
میں دیکھوں تو کہی دنیا تمہیں کیسے ستاتی ہے
کوئی دن کے لیے اپنی تکہیانی مجھے دے دو
وہ دل جو میں نے ما نا تھا مگر غیروں نے پایا
تحا
اس نئے کی ادائیگی کے دوران میں بار بار
اس کا معصوم چہرہ دکھر رہا تھا۔ دکھر اُنم کی کیفیت
میں شدت آتی چل گئی۔ ضبط کا بند ٹوٹ گیا اور
آنکھوں میں آنسو آئے۔
میں نے تھیہ کر لیا اسے اب یہاں ہر گز رہنے
نہیں دوں گا۔

پھر غیرِ حق طریقے کا مظاہرہ کرتے اعلانیہ
میں نے چھوٹی لتا کو دو کھنے کا نام فریم دیا اور
انتظام و انصرام کی خاطر نکل گیا۔

میری اس فاشِ غلطی کا فائدہ اٹھاتے میرے
واپس لوٹنے سے کہیں پہلے چھوٹی لتا کسی نامعلوم
جگہ پر منتقل کر دی گئی۔

چند یونھے خوب ہاتھ یاؤں مارے اللہ جانے
زمیں کھا گئی یا آسان نگل گیا۔ بہت کھوچ نکالی
کوئی نشان نہ لابد لے میں لا تھاد لوگ اٹھائے
گئے۔ ظلم و تشدد بھی ہوا۔ لیکن کوئی سن گئی نہیں۔
دل کا معاملہ تو اپنی جگہ لیکن جس طریقے سے
میری بدمعاشی میری قدر اور ترقی کو دھبہ لگا، اس
نے مجھے ذلیل اور شرمسار کر دیا۔

چند روز پہلے استاد پیدرو نے ایک Lead
فرانسیس کی جس کے مطابق غائب ہونے سے اب
تک چھوٹی لتا کو کم از کم چھ مختلف مقامات پر رکھا
گیا۔

حالات کچھ یوں بن رہے ہیں کہ آپ دونوں حضرات اُس سے رابط کریں گے۔ پہلی ملاقات میں اُسے ہدایات پہنچائی جائیں۔ علاوہ ازیں اُس کی نگہداشت پر مامور لوگ اور ان کی تعداد اور لوگوں کی معلوم کی جائے۔ دوسری ملاقات میں اُس کا روئیل اور رضا مندی۔ اختیاطی مذاہیر یا کوئی اور معلومات حاصل کی جائیں۔ اور آخری ملاقات میں ہدایات کو دھرانا اور ذہن شفیع کرنے والے ہو گا۔

آخري اطلاعات کے مطابق کل شام اسے
 محلہ وارث میں شفٹ کیا گیا ہے۔ پیرو کے
 ہر کاروں نے وہ گھر بھی دیکھ لیا ہے لیکن تصدیق
 کل ہو گی۔

ہماری ایکم کا خاکہ ہے اگر آپ لوگوں کے کوئی تھنھات ہیں تو ان پر بحث کی جاسکتی ہے لیکن پر خیال رکھیں کہ بہت سی باتوں کا جواب فی الوقت نہیں دیا جاسکتا۔ صورت حال اس وقت واضح ہوگی جب اس سے رابطہ ہو جائے گا۔

ہم بارہ دری سے اتر کر گاڑی کے پاس آگئے۔ صابر نے ڈگی کھولتے ہیک سے ایک بیرج نکالا۔

”دیکھو بھائی اسے ہر صورت اس فضا سے الگ کرنا ہے جو چیز مجھے پریشان کیے دے رہی ہے وہ اُس کی سیفی ہے۔“ تا کے انگواء کے بعد ”کرتو، مای کو ہم نے اخالیا تھا تین چار روز کی مسلسل پٹائی کے بعد اس نے بالا خرد چیزوں کی نشاندہی کر دی۔

”منٹے گھر کا باتھ“

”اٹھائے جانے کی صورت میں خلاص۔“
سر پر ٹوپی اور ہاتھے صابر نے حلق سے عجیب
کی آواز نکالی جس طرح گیدڑ بھونکنے سے پہلے
کھانتا ہے۔

”کل صحیح گھر رہنا ہے وہ بچے تمہیں لینے آؤں گا۔“ صابر نے گاڑی میں بیٹھتے ہدایت کی۔
اگلی صحیح عین وقت پر صابر نے ہم دونوں کو ساتھ لیا اور لیافت باعث کی طرف چل دیا۔ بارہ دری کے قریب گاڑی روکی اور سیرھیاں چڑھتے چھپتے رکھنے لگیا۔

”نبیں آپ میں پچھس قدم چل کر ہماری طرف آئیں۔“
سابر نے ایک مخفی ہدایت کار کی طرح سنجیدگی سے سعید کے چلنے کے انداز کو ملاحظہ کرتے ہدایت دی۔

چار سو نظر دوڑاتے بولا۔
”لتا کا سراغ مل گیا ہے اُس سے رابطہ کرنا
نہایت ضروری ہے۔“
میرے ذہن میں ایک ایکسیم ہے۔ اُسے خفیہ
طریقے سے ملا جائے۔

بار بار چلے کا یہ مظاہرہ دیکھتے اور ہر بار فتحی میں سر ہلاتے صابر نے بالا خرشاہ صاحب کی کیٹ داک، مسٹر دکر دی۔

لہیات ضروری ہے۔“
میرے ذہن میں ایک ایکسٹم ہے۔ اُسے خفیہ
طریقے سے ملا جائے۔

فراہم کرتی، اُس کی سیئر ھیاں چڑھتے صابر ایک چھوٹے سے کمرہ میں داخل ہو گیا۔ یہ غالباً دفتر تھا جہاں بیٹھ کر آپ راجہ بازارِ ڈی اے وی کالج روڈ، لیاقت روڈ اور گواہنڈی تک گرانی کر سکتے تھے۔

حس عادت چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور پھر اگلے دن کا ایکش پلان واضح کر دیا گیا۔ آدھا پون گھنٹہ خوب بخش و مباحثہ ہوا اور موقع کی مناسبت سے ہر مرحلہ اور ہر کارروائی کا طریقہ کار جب عیاں ہو گیا تو میٹنگ برخاست کر دی گئی۔

جاتے جاتے کہنے لگا۔

”اپنا خیال رکھیں اور خدارا کوئی چوک نہ ہونے پائے۔“

رات بھر عجیب سا خوف ذہن پر سوار رہا۔ ایک اندریشہ ایک غیر معمین کیفیت یا پھر موچھیں منڈوانے کا دکھ اگلے روز سید سائز ہے نوبجے صح ویسا اسکوڑ پر سوار گھر کے سامنے آن پہنچا۔ ہارن کی آواز سنتے ہی میں نے شستے میں اپنے وجود پر فائل نظر ڈالی اب لے ہوئے چھلے اٹھتے کا سا چہرہ دیکھ کر بڑی کراہیت آئی۔ پیدائش سے لے کر ملٹری اکیڈمی میں شمولیت تک بھی موچھیں نہ منڈوانیں۔ آج اندازہ ہوا کہ ہناموچھ میرا پچھہ کتنا خوب سرائی ہو جاتا ہے۔

”تحله“ کے اشارے سے چہرے پر لعنت بھیجتے، بر قعہ کے تج بن بند کیے چہرے پر نقاب ڈالتے گلی سے باہر نکل آیا۔ چند پڑوی لائقی سے پیرے پاس سے گزر گئے۔

خش انداز میں تاگک اٹھا کر اسکوڑ پر بیٹھنے والا ہی تھا کہ یاد پڑا میں عورت ہوں فوراً لا حلول پڑ گئی۔

لہذا آپ کو اسی تناظر میں دیکھنے پر مجبور ہوں۔“ ”ہاں بھی..... فوجی جوان اب ذرا تو صغار بی بی بن کر دکھا۔“ صابر نے مسکراتے میری جانب دیکھا۔

سعید کی کوتاہی سے سبق لیتے میں نے پوری کوشش کی کہ صابر کی توقعات پر پورا اتر دیں۔

ایسے لگا جیسے فیصلہ محفوظ کر لیا گیا ہو۔ خاصی دیر ادھر ادھر بے مقصد وقت ضائع کرتے کہنے لگا۔

”تمہک ہے لیکن بر قعہ میں تمہارا ذیلی ڈول ایک دم ڈوٹکنا ہو گیا ہے۔ راہ گیروں میں یہ جس پیدا کرنے کے علاوہ خطرناک صورت اختیار کر سکتا ہے۔ بہر کیف ہمارے پاس کوئی اور چارہ بھی تو نہیں۔ لیکن تم لوگوں کے بازوؤں کی حرکت کافوئی انداز بہت پریشان کرنے ہے، اُس کو قابو میں رکھنا نہایت ضروری ہے۔“

لیاقت روڈ اور ڈی اے وی کالج روڈ کے عغم پر واقع علی بابا ہوٹل کے سامنے رکتے کہنے لگا۔

”آؤ کھانا کھالیں۔“ ”آن رونی دال مفت“ کی مشہوری کا ”بل بورڈ“، ہوٹل کی چھت پر کچھ ایسے زاویے سے لگایا گیا تھا کہ دور سے گاکوں کی توجہ مبذول کرائی جاسکتی تھی۔ اچھے وقت تھے۔ غریب آدمی تین آنے یومیہ میں پیٹ بھر کر کھانا کھا سکتا تھا۔

چکا نیکس، شراب کی ڈشری یوشن کا وسیع نیٹ درک اور بھتے سے وصول شدہ آمدی کے باوجود صابر عموماً بیہیں کھانا کھاتا، یاد رہے تا جائز زرائع سے کمائی دولت تھم رسیدہ خواتین اور بچوں کی فلاں و بہوں پر خرچ کی جاتی۔ ہوٹل کے اوپر والی منزل شام کو چار آنے فی یومیہ بھی بسترا، بھی

اسکوڑ کے ایک جانب بیٹھنے پر خاصی دقت پیش آئی۔
”لیسی ہوڈا رانگ؟“ سعید حسن نے اسکوڑ
گیر میں ڈالتے پوچھا۔

بالکل اچنچا نہ ہوا۔ میرے کوٹھری میں گھستے اُس
نے خط و صول کیا اور کل اسی وقت دوبارہ آنے کا
کہا۔ باہر ایک بڑھیا نکلے پر برتن مانجھ رہی تھی۔
حرام ہے جو میرے آنے جانے کا اُس نے نوش
تک لیا ہو۔

میری واپسی ایک دوسرے راستے سے تھی۔
گھوڑا اپستال کے سامنے سعید اسکوڑ پر بیٹھا میرا
انتظار کر رہا تھا۔

”Mission Accomplished“
میں نے اسکوڑ پر بیٹھتے کہا۔
صابر سے رابط کیا گیا۔

بناولہ خیال کے دوران میں نے خدشہ ظاہر کیا
کہ وہ تاکے بارے میں کچھ زیادہ ہی مبالغے
کام لے رہا ہے۔ جب کہ اُس کو آسانی اس گھر
سے لے جایا جاسکتا ہے۔ کیونکہ میرے نزدیک
اُس کی خفاقت یا پابندی والا کوئی عضر نظر نہیں
آیا۔ الہذا مزید وقت ضائع کیے بغیر جلد سے جلد
ایکشن کر لیا جائے۔

مسکراتے صابر نے کل ٹک سبکرنے کی
تلقین کی اور صرف اتنا کہا۔

”یہاں ایکشن بالکل نہیں کیا جاسکتا کیونکہ
اغوا کرنا ہمارے لیے مزید پریشانی کا موجب
ہو گا۔“

دوسرے دن بھی وہی عمل دہرا لے گیا۔ ماں کی
سفید ساشن کی شلوار زیب تن کی۔ ٹیکن کا سائز
کیونکہ بہت چھوٹا تھا الہذا کل کی طرح آخر بھی
میں نے بنیان پر اکٹھا کیا۔ باقی رہائی نزل کا مسئلہ
تو ’10 سائز‘ کا زنانہ جوتا تو شاید عجائب گھر میں
بھی مستیاب نہ ہوتا، اس لیے ہوائی پچل منظور کی
گئی۔

مری روڈ پر چڑھتے ہی بادل امنڈتے نظر

”ابے نکل لے سالے یہاں سے..... کیوں
بدنامی کو دعوت دے رہا ہے یا ر؟“ شارٹ کش
مارتے سعید براست تقشیدی گلی مری روڈ پر جانکلا۔
اسکیم کے مطابق مجھے شاہ کی ٹالیاں قبرستان کے
نزدیک اُتار دیا گیا۔ یہاں سے پیدل تاکے
ٹھکانے کا فاصلہ آٹھ سے دس منٹ کا تھا۔
پلانک کی ڈوری سے بھی تو کری جس میں پیاز،
آلو اور ٹماڑوں اور کچھ تھامیں تھا میں تھا میں
آگے بڑھا۔

میرا غیر معمولی جٹ کسی راہ چلتے کے لیے
باعث کشش نہ تھا اور یا بھر سارے لوگ مولوی ہی
تھے۔ جنہوں نے عورت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ
دیکھا۔ پیاز اور آلو اور ٹماڑوں کے لیے
رکھے تھے۔ پیازوں کی غیر معمولی حرکت کو نکھنی
رکھنے کی چال تھی۔ آدھے نقاب کے باوجود کسی
نے میری طرف دیکھنا بھی گوارانہ کیا۔ یہ کیا بے
غیرت مخلک تھا؟

تقریباً آٹھ منٹ بعد لکڑی کے ٹال کے
بالقابل اُس چھوٹی سی حولی کے سامنے پہنچا جس
کے مرکزی دروازے کے ساتھ ٹھیلے والا شکر قدری
تھا رہا تھا۔ دو تین کنگلے بچے لچائی نظر وہ سے شکر
قدی پر نظریں جھائے کھڑے تھے۔ اندر داخل
ہوتے ہی ہدایت کے مطابق میں با میں جانب
مرد گیا سامنے اٹکو کیتیں سے متصل ایک کوٹھری
کے کواڑ سے لٹکتے پھرے میں میاں مشکوکوتا کچھ
کھلا رہی تھی۔

حیران کن بات یہی کہ میرا چہرہ دیکھ کر اس کو

طرف چل دیا۔ میر اندازہ درست نکلا۔ حفاظتی
ٹولہ اور ادھر گلیوں کی خاک چھان رہا تھا۔ لیکن
واباں میری توقع نہیں کی جا رہی تھی جہاں سے میں
نے اب واپس اختیار کی تھی۔

اللہ کی طرف سے یہ ایک نیبی امداد تھی کہ میں
نکلا۔

کم سے کم ایک سو ڈر کی خاطر میں نے ایک
تائگہ پکڑا اور گھر پہنچ گیا۔ میری پہلی ترجیح صابر کو
حالات سے آگاہی دینا تھی۔ خوش تھتی سے وہ
بدات خود خط و صولت گھر پہنچ گیا۔
لتا کا خط پڑھا۔

میری رو داد نہیں بولا۔

”اس حداثے کے بعد اُس کو آج یقینی طور پر
وہاں سے منتقل کر دیا جائے گا۔“
”میرے پاس وقت بہت کم ہے۔“
”میں اب چلتا ہوں۔“

”دعا کرو سب ٹھیک ہو جائے۔“
”اُس وقت یہ آخری بات تھی جو صابر نے مجھ
سے کی۔ دیگر تفصیلات کا علم تو نہ ہو سکا البتہ اتنا
ضرور یہاں چلا تھا کہ صابر نے چھوٹی تاں کونجات
دلواہی تھی۔“

وقت کے بے رحم دھارے نے ہم دونوں کو
 جدا کر دیا فوج کی نوکری نے گھر سے دور کیا تھا
رفتہ رفتہ یار دوست بھی چھوٹے۔ پھر ایک وقت
آیا جب پنڈی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیر باد کہتے
لا ہو رہاں بسا۔

بھی کبھار پنڈی آنا ہوتا تو مرحوم منیر نیازی
کا وہ شعر کا نوں میں گونجتا ہے۔

واپس نہ جانا وہاں کہ تیرے شہر میں منیر
جو جس جگہ پ تھا وہ وہاں پر نہیں رہا
☆.....☆☆☆

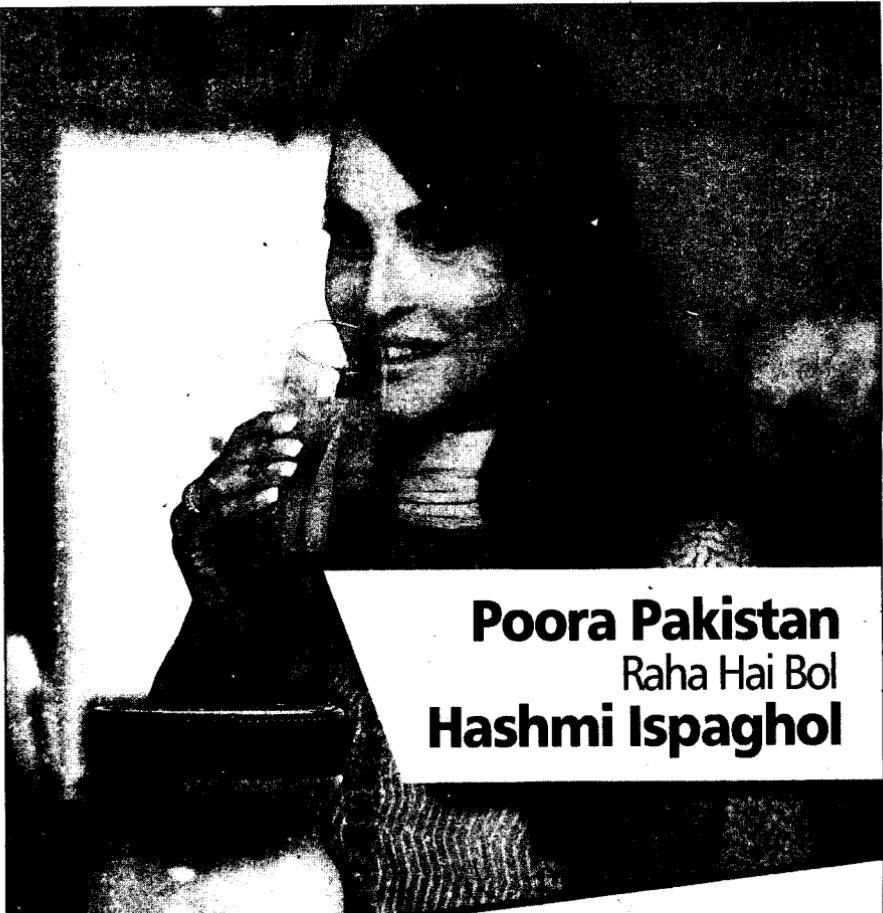
آئے۔ ہوا کی شدت بارش کا عندیدہ دے رہی
تھی۔ اُس روز تا پچھے گھبرائی ہوئی تھی۔ رقعہ
دیتے کہنے لگی۔

”بپر ہوشیار ہی،“ گلی کے درمیان لگے پتھر
پر بیٹھا شخص اُن کا تیسے اور شاید لکڑی کی نال پر بھی
دو آدمی اسی کے ساتھی ہیں۔ (دو سے تین فٹ
اوپر ایک پتھر گاڑیوں کی آمدورفت کو روکنے کے
لیے نصب کیا جاتا تھا) میری مشکل یہ تھی کہ آج کا
”روٹ آؤٹ“ وہی گلی تھی جس کے سرے پر
چوکیدار بھایا گیا تھا۔ وہاں سے گزر کر میں نے
ایک اور دوسرا گلی میں سے نکلا تھا جس کے
سرے پر سعید میر انتظر تھا۔

تاتا کے رقعے کو شلوار کے نیچے میں اڑتے میں
باہر نکل آیا۔ پتھر پر بیٹھا شخص نے مجھ پر نظریں گاڑ
دیں۔ سڑک عبور کرتے میں نہایت اعتماد سے اُس
کے پاس سے ہوتے گلی میں داخل ہو گیا۔ ہر گلی
چالیس پچاس گز کے دائیں بائیں اور سامنے نکل
جائی، اچانک ہوا کا ایک سند جھونکا کاغذ کے نکلنے
اور کچھے کوڑا ادا اس شدت سے ٹکرایا کہ بر قع
بیٹھنے کے بعد پیر اشوٹ بن گیا۔

میرا بہر ڈوب انشاں ہو چکا تھا میں نے تیزی
سے پچھے دیکھا تکرانی پر مامور شخص ہکا بکا منہ
کھو لے گھر رہا، پھر بھلی کی مانند میری طرف لپکا
بزری کی نوکری پھیکتے میں نے دوڑ گاڑی۔ تی
جنش سے باسیں جانب مڑتے ہی میں نے ایک
گھر کی چھوٹی سی ڈیورڈھی سے غسلک زینہ اور
جاتا دیکھ کر اُس پر چڑھ گیا آٹھوں سیڑھیوں کے
بعد لینڈنگ ایریا پر میں نے بر قع اٹار کر گول کیا
اور وہاں پڑے کوڑے دان میں ڈال دیا۔

باہر گلی میں ایک ہاہا کار پھی تھی۔ دو تین منٹ
کے تو قف کے بعد نیچے اترا اور دوبارہ نال کی



Poora Pakistan Raha Hai Bol **Hashmi Ispaghul**

Hashmi
Ispaghul

- ✓ روزانہ پاشی اسپیگول
قدرتی فائیر کا استعمال رکھے
- ✓ معدے کے کو صاف
- ✓ بلٹشوگر کالیل برقرار
- ✓ کولیسٹرول کو کم اور دل کو صحت مند
- ✓ قبض سے دور اور نظام بضم کو درست

Daily Life • Fit Rishq

www.hashmisurma.com HashmiSince1794

جیتی جاتی کہانیاں

اُن جیتے چاگئے کرداروں کی کہانیاں جو ہمارے ارادگرد آج بھی سائس لے رہے ہیں

مہہٹ مکھی میں بھی غزال

ٹپی آڑ کا خیال

غزال شب نے مجھے ایک بات بتلائی
کہ تیرگی کو کسی حال میں دوام نہیں

بیجبلی میجلو

میں امریکہ پیسلوانیا اپنے بیٹھ اور بھوکے سامنے روزانہ واک کے لیے نکل جایا کرتی تھی پاس رہا ش پر تیرتی اور وہاں اپارٹمنٹس کے اور سوچتی رہتی تھی کاش کوئی پاکستانی یا انگریز میں



”میں ایم تھری میں رہتی ہوں آئیں میرا
ہائل ساتھ تھی تو یہ میں والمارٹ اسٹور سے کچھ
گروسری لینے کی تھی۔ میں نے آپ کو کل بھی
دیکھا تھا۔ آپ یہاں روزواک کرتی ہیں؟“

”ہاں جب میں فارغ ہوتی ہوں تو واک
کرتی ہوں مگر نام مقرر نہیں ہے.....“ میں نے
اُسے بتایا۔

”ویسے تم نے تو اپنا نام بتایا ہی نہیں۔“

”میرا نام میرین تھا، اب مریم ہے۔“ اُس نے
نے بتایا۔ اتنے میں یونڈا باندی شروع ہوئی۔

”اچھا اب میں چلتی ہوں شاید بارش ہونے
والی ہے پھر میں گئے۔“

”اچھا..... بائے..... بائے۔“

اس طرح ہمارا ملنا جانا شروع ہو گیا کبھی وہ
آجاتی بھی میں اس کے ہائل چلی جاتی ایں ایم
دونوں اپارٹمنٹ آئنے سامنے ہی تھے اور ہر لائن
میں 20-20 ٹیکٹ تھے ایک روز میں میرین یا
مریم کے ہائل گئی ہوئی تھی اس نے میرے
پوچھنے پر مجھے اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے
حوالے سے جو کہاںی سنائی، آپ وہ کہاںی اُسی کی
زبانی سن لیں۔

☆.....☆.....☆

”میرا نام پہلے میرین تھا، اب مریم ہے میں
اپنی ماں کے پہلے شوہر کی بیٹی ہوں میں نافی کے
فیکٹ میں رہتی تھی میری نافی ماں بہت خوبصورت
اور مہربان طبیعت کی مالک تھیں، انہوں نے مجھے
بہت پیار سے پالا، میرے نانا بھی بہت اچھے تھے
مگر وہ بھی میری ماں کی طرح بگڑے ہوئے تھے
گھر میں نہیں لکھتے تھے کچھ دن نافی کے ساتھ
رہتے پھر نہیں ٹلے جاتے۔ وہ اپنی طبیعت سے
محجور تھے ورنہ نافی ماں سے محبت بہت کرتے تھے۔

جائے جس سے اردو میں بات کر سکوں، کیونکہ
میں پہنچلو ایسا میں اردو بولنے کو ترس گئی تھی ویسے
بھی جب پردویں میں زیادہ عرصہ رہنا پڑ جائے تو
دل اپنوں کے لیے اداس ہوئی جاتا ہے۔

اس روز بھی میں یہ ہی سب سوچتے ہوئے
واک کر رہی تھی کہ کسی نے مجھے سلام کیا۔

میں حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگی کیونکہ
میرے سامنے ایک انگریز لڑکی کھڑی تھی، اُس نے
پھر مجھے سلام کیا..... ایک خوشنگ حیرت کے ساتھ
میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے سلام کا
جواب دیا اور اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے آپ کو دیکھ کر۔“
”اور مجھے بھی.....“ اُس نے جواب دیا۔

”آپ کہاں سے آئی ہیں؟“ اُس نے
پوچھا۔

”میں پاکستان سے آئی ہوں۔“ میں نے
اُسے بتایا۔

”مجھے پاکستانی بہت اچھے لگتے ہیں اور اب
ایک پاکستانی کے ساتھ ہی شاید ہمیشہ کے لیے
پاکستان چل جاؤں گی۔“ اُس کے لمحے میں گرم
جوئی تھی۔

”اچھا..... اچھا..... بہت اچھا۔“ میں نے
مزید خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”آپ کا نام کیا ہے..... آپ کون سے فیکٹ
میں رہتی ہیں؟“ اُس نے دو تین سوال ایک ساتھ
پوچھ لیے۔

”میں نے کہا۔
”میرا نام نجیل ہے اور میں ایں 12 میں رہتی
ہوں۔“

”اوہ..... واو.....“ وہ بچوں کی طرح خوش
ہوئی۔

دنوں تک اداس رہیں۔ گھر میں خاموشی کی چھاگنی
تھی، جب میں بھی چلی مرتبہ دکھ سے دوچار ہوئی
نانا میرے بھی تو دوست تھے ہم دنوں ہی اپنے
بیٹھ فریڈز سے محروم ہو گئے تھے اس لئے دکھ تو
ہوتا ہی تھا، می کا وہ ہی اصول، آئیں نانی کو تسلی
دی ایسے جیسے غیر دیتے ہیں کچھ دن رہیں اور چلی
چکنیں۔

میں نے نانی سے کہا۔
”می کو کچھ دن رہنا چاہیے تھا آپ کے
پاس۔“

”اب مجھے دکھنیں ہوتا۔“ نانی نے کہا۔
”مگر جب وو پہلی مرتبہ ہمیں چھوڑ کر گئی تھی،
تب میں بہت روئی تھی، لیکن کیا کریں ہمارا کچھ ہی
ایسا ہے، اخبارہ سال عمر ہونے کے بعد اولاد کی
مرضی ہے کہ وہ والدین کے ساتھ رہے یا نہ رہے
اُسے کوئی رہنے کو مجبور نہیں کر سکتا پانیں یہ قانون
کس نے کیا سوچ کر بنایا تھا، یہ ہی وجہ ہے کہ
ہماری نسل بھلک رہی ہے، جن کو سمجھانے والے
نہیں ہوں گے وہ تو بھکیں گے ہی نا۔“ نانی نے
تفصیل سے باتِ مکمل کی۔

”لیکن نانی میں آپ کو اکیلا چھوڑ کر نہیں
جاوں گی زندگی بھر۔“ میں نے نانی کے گلے میں
پانیں ڈال دیں۔

”پرام..... تم بہت اچھی ہو میری بیگی۔“
نانی نے مجھے محبت سے چوتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے تم پڑھنا پھر اپنی میلی بناتا، میں
بہت پیار سے تمہاری شادی بناوں گی کسی اچھے
لڑکے کے ساتھ خدا نے چاہا تو تم بہت خوش رہو
گی۔“

زندگی اسی طرح بہت مزے میں گزر رہی تھی
میں نے اسکول پورا کر لیا تھا اور کافی شیست کی

کیونکہ نانی ماں کی اور اپنی شادی کی سالگرہ بھی
نہیں بھولتے تھے، وہ اس دن ضرور کوئی نہ کوئی تختہ
لے کر گھر پہنچ جاتے تھے۔
اس لیے نانی ماں بھی ان کا انتظار کرتیں، ان
کی پسند کے کھانے باتیں، ان کے کپڑے پر لیں
کرتیں اور پھر وہ دنوں شام کو اپنی سالگرہ کر
مناتے خوب گھوٹتے پھرتے، اور رات کو تھک ہار
کے واپس آتے، نانی یہ باتیں مجھے روزانہ ہی
رات کو سوتے وقت باتیں، انیں یہ سب بتانا اچھا
لگتا تھا، اسکوں سے آنے کے بعد وہ مجھے
پڑھاتیں، میرے ڈریس کا خیال رکھتیں وہ بہت
سلیقہ مند ہیں۔

میری بھی بس مینے دو مینے بعد آتیں، مجھ سے
پیار کرتیں کچھ دن رہیں اور چلی جاتیں، مجھے ان
کے آنے جانے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا
میری اور نانی کی دنیا ساتھ ساتھ تھی۔ اور نانا بھی
پانچ سال تک ہمارے ساتھ تھے، پھر وہ اس دنیا
سے چلے گئے تھے۔

اُن دنوں نانا مسلسل چچہ ماہ تک ہمارے
ساتھ رہنے شاید ان کو پریتھا کر موت اب ان
کے تعاقب میں ہے۔ بھی بھی نانی ہنستیں اور
کہتیں۔

”کیا اب تمہاری مزگشتی ختم ہو گئی ہے؟“ تو
وہ نانی کی طرف دیکھ کر کہتے۔

”میں اب کچھ دن تمہارے ساتھ رہنا چاہتا
ہوں۔ تمہارے جسمی عورت مجھے کہیں نہیں ملی۔“
اور نانی محبت سے شرم جاتیں..... حالانکہ شرمانا
لما نانا ہمارے مغربی معاشرے میں ہے ہی نہیں
لیکن نانی کے چہرے پر عجیب سی سرفی آجائی جو
مجھے بہت اچھی لکھتی تھی۔

نانی کے دنیا سے چلنے کے بعد نانی بہت

تیاری کر رہی تھی انہی دنوں نافی کوکھانی رہنے لگی اور برف باری بھی ہو رہی تھی موسم سرما پورے عروج پر تھا۔

پل کی یادیں انسان کو ادھ موادرور کر دیتیں ہیں، میں بھی بس جی رہی تھی اسی جینے کے لیے مجھے می کے ساتھ آنا پڑا اب میں ان کے ساتھ رہی رہنے لگی، رہنا کیا تھا وہ میری ماں تو بھی بن ہی نہیں سکیں انہوں نے کہہ دیا۔

”تمہاری زندگی ہے جیسے چاہے اپنی مرضی سے جیو پا ہر نکلو اور لاکف انجوائے کر دیجیے میں دوستوں میں جیتی ہوں تم بھی جیو۔“

اگر رات کو نالی خواب میں آگئیں اور کہا۔

”خبردار..... اتنی ماں کی طرح مت رہنا، محنت کرنا..... پڑھانی کرنا اور فیلی بناتا۔“

میری آنکھ حلی تو ایسا محسوس ہوا کہ نافی حقیقت میں میرے پاس ہیں اور مجھے پیار کر رہی ہیں، صح کو میں نے می کے کہا۔

”میں پڑھنا چاہتی ہوں۔“

”اچھا.....“ می کو مجھے فکر ہوتی۔

”تم شیش کی تیاری کرو میں کوشش کرتی ہوں۔“ اور وہ تو کری پر چلی گئیں میں تو کری میں نہیں کر سکتی تھی کہ ابھی میرا کارڈ بنتے میں دو سال دیر تھی۔ اور میں یہ دو سال پڑھنا چاہتی تھی۔

می کا فلیٹ دبیڈ رومن کا تھا، جس میں ایک میں، میں تھی دوسرے میں میری می، رات کو میں دری تک بڑھتی رہتی، اُس روز بھی پڑھ رہی تھی کہ می آگئیں، گیکن وہ کسی مرد کے ساتھ بات کر رہی تھیں۔

جب سے میں آئی تھی یہ پہلا موقع تھا کہ می کسی کو ساتھ لائی تھیں۔ میں حیرت و بحسر کے باعث کرے سے پا ہر آئی۔

مجھے نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

”میری..... یہ مائیکل ہے..... یہ قلیٹ اسی

تیاری کر رہی تھی انہی دنوں نافی کوکھانی رہنے لگی اور برف باری بھی ہو رہی تھی موسم سرما پا بندی سے کھلا بھی تھا، لیکن کھانی میں کچھ خاص فرق نہیں آ رہا تھا۔ نافی نے می کو بھی کاں کر کے بلایا تھا، وہ دو تین دن سے ہمارے ساتھ ہی تھیں میں اور نافی ساتھ ہی سوتے تھے..... نافی منج بھی کرتیں کہ تم اگل سو، لیکن میں نہیں مانتی تھی وہ کہتیں۔

”تمہیں بھی یہ کھانی نہ لگ جائے۔“ پھر بھی میں دوسرے بیڈ پر نہ سوتی۔

اُس دن بہت ٹھنڈی بہر طرف برف ہی برف تھی اور ہر پڑھل رہے تھے، لیکن گھر گرم ہی نہیں ہو رہے تھے، میں اچانک سوتے سے جاکی تو مجھے کچھ عجیب سامنے ہوا جیسے نافی پھر کی ہو چکی ہوں، میں نے گردن گھما کر دیکھا، می ساتھ والے بیڈ پر سو رہی تھیں۔

میں نے اٹھ کر نافی کو ہلا کیا..... جلایا..... اک خاموشی سی تھی مجھے ہر طرف پھر میں نے می کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا..... وہ ہر بڑا کر اٹھ گئیں۔

”کیا ہوا؟ ڈاؤن خواب دیکھا کیا؟“ انہوں نے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ..... وہ..... نافی.....“ میں بیکھل اتنا ہی بول پائی..... می جلدی سے اٹھ کے نافی کے پاس آیں۔ انہیں ہلا جلا کے دیکھا پھر سینے سے کان لگایا۔

”اوہ..... شی از ڈیڈ۔“ یہ سنتے ہی میں جیخ پڑی اور بے ہوش ہو کر گئی۔

مرنے والے کتنے ہی پیارے کیوں نہ ہوں

اب مائیکل تقریباً روزہ ہی آنے لگا تھا اور مجھ سے قریب ہونے کی کوشش بھی کرتا تھا وہ میرے لیے تھے اور چاکلیٹ بھی لاتا تھا میرے میں کچھ نہ یقین بلکہ وہ آجاتا تو میں وہاں سے چلی جاتی۔

ایک دن میں نے مجھے کہا۔
”زیکھو ماں مائیکل کے ساتھ ہنا کر رکھو رونہ؟“ وہ چپ ہو گئیں۔

”ورشہ وہ میرا خون پی جائے گا، وہ ذریکولا ہے کیا؟ ویسے لگتا تو بالکل دیا ہی ہے۔“ میں نے غصے اور نفرت سے کہا۔

”غمی آپ اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟“
”نہیں چھوڑ سکتی۔“ گمی کی آواز میں اک بے کی تھی۔

”وہ مجھے پسند ہے۔“
”اچھا آپ کو پسند ہے تو اسے میرے سر پر متسلط گریں۔“ مجھے اس کے پیسوں سے پڑھنا ہے نہ اس کی کوئی مدد لینی ہے۔ یہ بات آپ آج اچھی طرح سن لیں۔“

”اگر تم میری بات نہیں مانو گی تو ہم دونوں کے لیے مشکل ہو سکتی ہے۔“
”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ میں حیران ہوئی۔

”میں پولیس کے پاس جاؤں گی۔“ میں نے کہا۔

”پولیس بھوت مانگے گی کیا کوئی نشان ہے کہ اس نے تم پر تشدد کیا ہے۔ وہ تمہیں بچوں کے ہاٹل چھوڑ آئے گا (ایک قسم کی بچوں کی جیل) جہاں لاوارث بچے ہوتے ہیں اور بہت خطرناک جگد ہے وہاں بچوں کو سخت سزا میں دی جاتی ہیں، تم تو بہت نازک ہو۔“

غمی نے مجھے گلے لگایا اور ان کے آنسو بہر

نے مجھے لے کر دیا ہے، کبھی بھی آ جاتا ہے یہ میرا بہترین دوست ہے۔“

مائیکل ایک لمسا ترزاً موٹا سخت چہرے والا آدمی تھا مجھے تو وہ بالکل ہی اچھا نہیں لگا..... اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا جب میں نے اس کے ساتھ ہاتھ ملایا تو اس کا ہاتھ مجھے بہت سخت محوس ہوا یا پھر اس نے خود کی سے میرا ہاتھ پکڑا تھا، میں دل ہی دل میں مائیکل سے ڈری تھی تھی، اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

”مجھے مائیکل بالکل اچھا نہیں لگا آپ کو اس سے برا آدمی نہیں ملا دوست بنانے کے لیے۔“
میں نے مائیکل کے جانے کے بعد گمی سے کہا۔

”اچھائی برائی میں کیا رکھا ہے دولت مند ہے مجھ پر بہت خرچ کرتا ہے دیکھو یہ فلیٹ اس کا کراچی میں اپنی بیماری سے بھلا دے سکتی ہوں؟“
”ساری زندگی آپ خوشیوں کے پیچھے بھاگی ہیں کیا سب خوشیاں میں گلے گئیں آپ کو؟“ مجھے گمی پر غصہ آ رہا تھا۔

”جو میں چاہتی ہوں وہ تو مل جاتا ہے نا۔“
غمی نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”میری طرف دیکھیں.....“ گمی نے میری طرف دیکھا۔
اپ میں گمی کو کیا بتاتی کہ مجھے ان کے چہرے اور آنکھوں میں مایوسی کے سوا کچھ نہیں نظر آ رہا تھا۔

”چلواب تم اپنے ٹیکسٹ کی تیاری کرو اور یہ بڑی بڑی باتیں مت سوچا کرو مائیکل نے کہا ہے کہ وہ تمہارا سب خرچ اٹھائے گا ہاٹل کی فیس سیست۔“

”مائیکل..... مائی فٹ.....“ یہ کہتی ہوئی میں غصے سے اپنے کرے میں آ گئی تھی۔

ایکدم کرے کا دروازہ کھلا وہ مائیکل ہی تھا میں
نے اُس کے جو تے دیکھ لیے تھے۔

”ٹھیک ہے میری آج میں تمہارا بیہن
انتظار کرتا ہوں، بہت تڑپا یا ہے تم نے مجھے.....“ وہ
میری تصویر سے جو میرے بیڈ کے سر ہانے کی
سمی پاتیں کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ میرے
بیڈ پر بیٹھ گیا۔ میں یہ سب بیڈ کے نیچے دیکھ لی ہوئی
اپنی الماری کے شنیش میں دیکھ رہی تھی کیونکہ وہ مکمل
لیپ کی روشنی میں تھا۔

”اے گاؤ میری مددگار اے میری نانی کی
نیک روح تو میری بددکر مجھے اس خالم سے بچا۔“
میں سانسی روکے جھٹی دھائیں یاد چیس وہ سب
ماگ رہی تھی۔

”میں روشنی کی طرف جاتا چاہتی ہوں۔ اے
گاؤ مجھے بچا لے..... اگر ماگیکل میری ہلکی ہی بھی
آہست سن لے گا تو وہ مجھیڈ کے نیچے سے نکال کر
کسی چیز پا کی طرح دیوچ لے گا۔“ میں نے پھر
سے دعا میں ماگنا شروع کیں، اتنے میں میرے
باتھروم کا دروازہ تھوا اس کھلا اور پھر بند ہو گیا
میں نے فوراً مائیکل کی طرف دیکھا، وہ بھی اُسی
طرف دیکھ رہا تھا کہ اندر سے کسی چیز کے گرنے کی
ہلکی ہی آواز آئی، چند ثانیے اس نے کان آواز کی
طرف لگائے اور پھر وہ انہ کر با تھرودم کی طرف
چلا گیا۔ جیسے ہی وہ با تھرودم کا دروازہ کھول کر اندر
 داخل ہوا.....

میں چھاک سے بیڈ کے نیچے سے نکلی اور
ایک ہی چھلانگ میں بغیر آواز کیے کرے سے
پاہر نکل آئی، باہر نکلتے ہی میں نے کرے کو لاک
کیا تھا جو کہ چابی لاک میں ہلکی ہوئی تھی۔ میں
سیدھی بھی کے کرے میں گئی بھی کا کوٹ اور پس لیا
جو گزر ہاتھ میں لیے اور باہر کی طرف بھاگتے

لکھ۔ ہجے اُس وقت مجھے بھی کی محبت کا احساس ہوا
تھا۔

میں اُس روز صحیح سے اپنے اسکول کی ایک
سینیلی کی طرف گئی ہوئی تھی، جیسے ہی گھر میں داخل
ہوئی تو بھی کے کرے سے مائیکل کے تیز تیز
بولنے کی آواز آرہی تھی۔ میں نے آہستہ سے
قہوڑا سا پر دہ ہٹا کر دیکھا تو اف میرے خدا۔
مائیکل نے بھی کے بال اپنی مٹھی میں جکڑے ہوئے
تھے اور اڑاٹت سے امی کا جھرہ لال ہو رہا تھا۔ میں
تجھیسے خوف سے جم سی کی تھی۔

”پولیس کے پاس جاؤ گی، جاؤ جاؤ شوق سے
جب پولیس کو تمہاری ڈرگ سپلائی والی دیوار یوزلمیں
گی تب تمہیں پتہ چلے گا کہ کیسے پولیس کے پاس
جاتے ہیں۔“ مائیکل نے بھی کو جھکا دیا۔

”وہ تو تم نے مجھے پھنسایا ہے۔“ بھی نے
کراچے ہوئے کہا تھا۔

”میں نے پھنسایا ہے کہیا..... بہت بھولی
ہے تو۔“ اُس نے بھی کو دھکا دیا۔

”اپنی بیٹی کو سمجھا لے آج آخری بار کہہ رہا
ہوں..... کیتا ہی بیٹی بھی کہتا ہی ہے، لیکن میں بھی
شکاری ہوں شکاری..... ایسا دیوچوں گا کہ وہ
ساری اکڑ بھول جائے گی تیری طرح۔“ وہ ہٹا
اور میں جھمر جھری لے کر اپنے کرے میں بھاگ
آئی۔ اب یہ کرہ میرے لیے بھی خطرہ بن چکا
تھا۔ اُف ایسا نشدود میں نے زندگی میں نہیں دیکھا
تھا۔

”مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ میں یہ سوچ رہی
تھی اور جب میں یہ سب سوچ رہی تھی تب میں
اپنے بیڈ کے تقریباً نیچے کی طرف تھی، اس طرح
لیپ کی روشنی بھر پڑیں آرہی تھی۔ میں سوچ رہی
تھی کہ اب یہ گھر قہوڑا دینا چاہیے گر کہاں جاؤ؟

جہاں بس رکی وہ آخری اشتاب تھا سب
اترنے لگے میں بھی اتر گئی اور یہ دیکھ کر تو میری
خوشی کی انتہا نہ رہی کہ یہ تو وہ علاقوں تھا جہاں میرا
بچپن گزر اتھا مجھے اپنی نانی اور بچپن یاد آئے لگے
کتنا محفوظ بچپن تھا میرا..... نانی نے مجھے زمانے
کی ہوا تک نہ لگنے دی تھی، انہیں یہ قانون بالکل
پسند نہیں تھا کہ بچپن مال باپ کو چھوڑ کر جلتے بنیں۔
اسی لیے تو مغرب میں نوجوان نسل کے راه
روی کا شکار ہے، اخلاقی قدریں دن بد دن غرقتی
جاری ہیں، یہ سب نانی کہتی رہتی تھیں۔

”دیکھو میری! خود کو ہر قسم کے حالات کے
لیے تیار رکھنا ہمت نہیں ہارتا۔“ یہ سب سوچتے
ہوئے میرے آنسو گالوں پر بہنے لگے جن کو صاف
کرتے ہوئے میں نے اپنی ایک اسکول کے
زمانے کی سیلی کے گھر جانے کا سوچا اور جب
اسے میں نے فون ملایا تو اول گیا۔

”ہیلوڑی کی.....“

”ہیلو..... ہیلو..... کون؟“ دوسرا طرف
ثریی ہی تھی۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔
”ارے..... میں میری..... ہوں..... تم سے
ٹھنکو جی چاہر باتھا۔“

”اچھا چلی آؤ.....“ پھر اس نے مجھے اپنا

ایڈر لیں سینڈ کیا تھا۔
میں جب فریی کے پاس پہنچی تو وہ مجھ سے
بہت گرم جوشی سے ملی ہم بہت دیر باتیں کرتے
رہے اسکول کے زمانے کی باتیں، میں نے ثریی
کو بتا دیا کہ میں اب اس کے ساتھ رہنے کے لیے
آئی ہوں، اور گھر سے بھاگنے کی وجہ بھی بتا دی
اُسے بھی میرا حال جان کر بہت دکھ ہوا اُس نے
مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

”جب تک چاہو..... رہو..... تم میری

ہوئے میں نے می کو دیکھا کہ وہ بے ہوش پڑی
تھیں، انہوں نے ہاتھ میں گلاں تھاما ہوا تھا، میں
دوڑ کر باہر آ گئی اور لگلی میں بھاگتی چلی گئی پھر کچھ
دیر بعد میں سانس لئنے کو رکی تو میں نے طاروں
طرف دیکھا میں اپنے گھر سے کافی دور آ پچھل چھٹی۔

اُف میرے پیر گندے اور ہندے ہو چکے
تھے کیونکہ باہر بہت ہندہ تھی۔ پارہ منقی ڈگری پر
جارہا تھا۔ ایسے موسم میں گھروں میں تو آٹو میک
ہیئت چلتے رہتے ہیں اس لیے بس ہلکی ہندہ محسوس
ہوئی تھی، ویسے بھی اب برف باری شروع ہونے
والی تھی، میں نے ایک تاریک سے کونے میں بیٹھ
کر اپنے سوکس اتارے جو گندے ہو چکے تھے، میں
کے جو گر ز جو کہ میرے ہاتھ میں تھے وہ پہنچے اور
سوکس اپنے پر پرس میں رکھ لیے جو کہ می کا تھا، اُسی
پرس میں ایک ٹوپی بھی رکھی تھی وہ بھی میں نے سر
پر اس طرح پہن لی کہ میرا چہرہ کافی حد تک اُس
میں چھپ گیا، اب میں تیزی سے بس اشتاب کی
طرف چلے گئی بس اشتاب پر پہنچ کر جو بھی بس آئی
میں اس میں بنا دیکھے سوار ہو گئی، میں جلد از جلد
یہاں سے دور نکل جانا چاہتی تھی، بس کے ساتھ
ساتھ میرا دماغ بھی حالات کے دھارے پر چلنے
لگا۔

اُس وقت مجھے اپنی نانی بہت یاد آ رہی تھیں
ہاں یاد آیا آج بھی تو میری مدد میری نانی کی نیک
روح نے ہی کی تھی نا..... مجھے یقین تھا کہ اُن کی
روح ہی باหر روم میں داخل ہوئی تھی، اور ماں یکل کو
بھی اسی نے اندر آنے پر مجبور کیا تھا، ورنہ بند
باہر روم میں کون تھا، یقیناً وہ نانی کی روح تھی۔
جو مجھے ماں یکل جیسے شیطان سے بجائے آ گئی تھی۔
نانی کا لاؤڑ پیار یاد کر کے میری آنکھوں میں آنسو
آگئے تھے۔

بہترین فریڈز ہوا اور اچھے فریڈز بیشہ برے وقت میں کام آتے ہیں۔ ”ٹریسی نے مجھے تسلی دی۔
”کیا ہوا طبیعت تو ٹھیک ہے ناتمہاری؟“
اس نے میری پہلی رنگت دیکھتے ہوئے کہا۔
میں نے اسے کہا۔

”خاموشی سے میری بات سنوا بھی جو لوگ آئے ہیں ناؤں میں براؤں بالوں والا ماں یکل ہے تم بھی اس سے ہوشیار ہنا..... میں تواب یہاں سے جا رہی ہوں۔“

”کہاں جاؤ گی؟“ اس نے پوچھا۔

”بس اس وقت تو جانا ہو گا زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔ اپنا خیال رکھنا خدا تمہاری بھی حفاظت کرے بائے۔“

میں نے وہاں سے تیزی کے ساتھ نکلتے ہی گلیوں میں بھاگنا شروع کر دیا۔ ہر طرف رش تھا، لوگ مختلف کاشیوں پہنے گھوم رہے تھے سنو فال شروع ہو گئی تھی تو لوگوں نے بارو مز کارخ کیا تھا، گلیاں رستے سنان ہونے لگے تھے ٹھنڈی ہوا جلنے کی ٹھنڈی اور خوف کی وجہ سے میرے سر کا درد بھی بڑھنے لگا، یا شاید پھر مجھے بخار ہو رہا تھا کیونکہ مجھ سے قدم اٹھانا دو بھر ہو گیا تھا۔ اور پھر لیکا یک میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک زم گرم بستر میں تھی، میں نے ملنے جلنے کی کوشش کی لیکن بدن تو جیسے پھر کا ہو چکا تھا، میں نے اپنی کیفیت سمجھنے کی کوشش کی، لیکن ذہن بن مجھے لگا تھا اور میں پھر اندر ہیروں میں ڈوب گئی میری آنکھ دوبارہ کسی کی آواز پر ٹھلی گئی میں نے جب آواز کی طرف دھیان دیا تو پتہ چلا کہ وہ الیکٹرک بیٹری تھا جو کرہ گرم کرنے کے لیے چالا یا جاتا ہے، گرم کرہ نرم آرام دہ بستر یہ سب مجھے ایک خواب لگ رہا تھا جی چاہ رہا تھا کہ میں اسی طرح آرام سے میٹی

بہترین فریڈز ہوا اور اچھے فریڈز بیشہ برے وقت میں کام آتے ہیں۔ ”ٹریسی نے مجھے تسلی دی۔
اب میں ٹریسی کے فلیٹ میں رہنے لگی میرے پاس گی کے پیسے تھے، لیکن ایک دن تو وہ ختم ہو جاتے، اسی لیے میرے کہنے پر ٹریسی نے جہاں وہ کام کرتی تھی اور ہیں اپنی صفائح پر مجھے بھی کام پر لگادیا، پیسے تھے لیکن اس طرح میں مصروف ہوئی تھی اور میں ٹریسی پر بوجہ بھی نہیں بننا چاہتی تھی۔
کام بھی نہایت آسان تھا بلکہ کے گرد اوتھر فلور پر رکھ کر رکھ کھول کر ان میں سے مختلف اشیاء نکال کر رہا تھا میں رکھتی ہے دوسرا لڑکی اور پر استور میں رکھتا۔

سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا لیکن اس کے باوجود مجھے ایسا لگتا کہ کہیں سے ماں یکل آجائے گا، اس خدشے کا اظہار میں نے ٹریسی سے بھی کیا تھا..... تو اس نے کہا تھا۔

”ایسے ڈرتی رہو گی تو زندگی کیسے گزرے گی تمہاری، میں مختاطر رہو کسی کو لیکا پتہ کرتم یہاں ہو۔“
لیکن میرا دل خدشوں میں ہی ڈوبا رہتا۔

اُس روز میرا آفس سے آف تھا۔ ٹریسی کے فلیٹ پر اُس کی فریڈز اور بواۓ فریڈز جمع تھے مجھے بخار چڑھا ہوا تھا، میں نے دو ایسے تھے لیکن پھر بھی سر میں ہلاکا ہلاکا درد تھا، لڑکوں نے مختلف کاشیوں اور ماسک لگائے ہوئے تھے خوب ہلا گلا ہو رہا تھا، میں بھی ماسک چڑھائے ہوئے بیدر روم میں بیٹھی تھی کہ اُنی وہی لاڈنچ میں شور کچھ زیادہ ہی ہو گیا تو میں نے جھاٹک کر دیکھا۔ میری تو جان نکلتے نکلتے رہ گئی کیونکہ ابھی جن لوگوں کی وہاں اندری ہوئی تھی ان میں ماں یکل بھی تھا۔

”آف میرے خدا یہ یہاں بھی چھنج گیا۔“
میں نے فوراً ٹریسی کو ایسیں ایسیں کر کے بیدر روم

رو نے گئی تھی۔

”اچھا..... اچھا..... اب میں نہیں پوچھوں گا
جب تک تم خود نہیں بتاؤ گی، تم بہت اچھی لڑکی ہو
نکھلیں ایسا نہ ہو کہ تم پھر سے بیمار ہو جاؤ، اپنی انرجی
رو نے میں ضائع مت کرو۔“ ڈاکٹر نے مجھے پانی
کا گلاں دیتے ہوئے کہا۔

میں نے پانی غنا غاث پیا، اور گلاں اسے
لوٹا دیا، گلاں للتے ہوئے وہ مُسٹرار پا تھا جبکہ میں
کافی گھرائی ہو گئی تھی، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا
کافی گھرائی ہو گئی تھی، میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہا

کہ کیا کہوں اور کیا کروں۔

ڈاکٹر نے ڈرپ کی طرف دیکھا وہ خالی
ہو چکی تھی وہ ڈرپ اتارتے ہوئے بولا۔

”میں یونیورسٹی جا رہا ہوں، رات دیر سے
آؤں گا سامنے واش روم ہے اور کچن میں فرج
رکھاے جو سمجھ میں آئے کھایا، اودون بھی موجود
ہے اگر بھوک گلی ہے تو اس وقت میں جھینیں چاۓ
بستک دے سکتا ہوں۔“ وہ سوالیہ نظر وہ سے مجھے
دیکھنے لگا۔

میں نے جلدی سے نہیں میں گردن ہلا دی
کیونکہ میری زبان اور گلا میرا ساتھ نہیں دے رہا
تھا۔ چاہنے کے باوجود میرے منہ سے آواز نہیں
نکلی تھی۔

”جیسی تھاری مرضی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ چلا
گیا تھا۔ اور میں پھر بستر میں دبک گئی تھی اور
سوچنے لگی تھی کہ اسے کہوں گی کہ مجھے کچھ دن اپنے
گھر میں رہنے دے تاکہ میں اچھی طرح سوچ
سمجھ کر کوئی فیصلہ کر سکوں، وہ بہت مہربان اور خدا
ترس لگ رہا ہے۔ ضرور میری بات مان لے گا۔
میں نے بیٹھ پر بیٹھنے بیٹھنے فلیٹ کا جائزہ لیا۔ یہ ایک
بیڑر ورم کا فلیٹ تھا، لیکن تھا کافی خوبصورت میں تھی
وی لاؤخ میں بستر پر تھی، شاید یہ میرے لیے

رہوں۔ اور ہر طرف سکون ہی سکون ہو۔ میں خود
کو بہت ہلکا چھکا محسوس کر رہی تھی۔

”اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“ ایک دیسی
کی مردانہ آواز میرے کانوں میں آئی تھی میں
نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں سامنے گورا رنگ
کا لے بال بکھی کالی داڑھی، موچھے ہونوں پر
مُسکراہت نظر کے جھٹے میں سے جھاتی شفیق کالی
آنکھیں موجود تھیں۔ سامنے والا بہت متاثر کن
شخصیت کا مالک تھا۔

”زیادہ حیران مت ہوں میں آپ کا ڈاکٹر
ہوں..... آپ آج سے دو دن قبل برف پر بے
ہوشی کی حالت میں ملی تھیں، ڈاکٹر ہونے کے
ناٹے میں آپ کو اس طرح چھوڑ کر نہیں آ سکتا
تھا۔ اسی لیے آپ کو یہاں لے آیا۔“ اس نے
بات مکمل کی۔

میرے بازو میں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ میں
نے اطمینان کی گھری سانس خارج کی، کیونکہ
سامنے جو ڈاکٹر تھا وہ بہت مہربان لگ رہا تھا۔
میں خاموش رہی تب وہ پھر بولا۔

”دیکھو اچھی لڑکی! اب یہ ڈرپ ختم ہو جائے
گی تو تم میں اتنی انرجی ضرور آ جائے گی کہ تم مجھ
سے بات کر سکو اور اپنے گھر جاسکو۔“ ڈاکٹر نے
مُسکرا کر میری طرف دیکھا۔

”گھر.....“ یہ لفظ سنتے ہی میرے آنسو خود
بنو دلکھنے شروع ہو گئے حالانکہ میں روتا نہیں چاہتی
تھی۔ مگر شاید میں بھاگتے بھاگتے ہمت ہار چکی
تھی۔

”ارے ارے..... روکیوں رہی ہو؟ تم مجھے
اپنا پتہ بتاؤ میں تھارے والدین کو خود ہی لے
آؤں گا۔“ وہ مجھے روتے دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔
والدین کا نام سنتے ہی میں اور زور زور سے

ایک رات میں خواب میں پری طرح ڈرگنی،
میں اکثر خواب میں ڈرجاتی تھی اُس رات بھی
میں اسی طرح ڈرگنی، چیزیں ہی آنکھیں بند کرتی گلتا
کوئی میرے سر ہانے کھڑا ہے اور میرا گلاد بانے
کی کوشش کر رہا ہے، میری سائنس بند ہونے کو تھی
کہ میری آنکھ مغلب تھی، میری سر ہانے کی طرف
دیکھتے کی ہوت بھی نہ ہوئی میں نے جو جو کے بیٹھ
روم کی طرف دوڑ لگا دی اور اُس کا کبل اوپر
کر کے اسی کے کبل میں حصہ تھی جو جو کی میری
طرف پیٹھ تھی وہ بیدار نہیں ہوا گھری نیند میں تھا۔
پھر اُس کی طرف دیکھتے دیکھتے نہ جانے کب میری
بھی آنکھ لگ گئی۔

مجھے پتا ہی نہیں چلا صبح جب میں جا گی تو وہ
چائے بنارہا تھا۔ میں شرمende تھی کہ وہ سوچ رہا
ہو گا کہ شاید میں بھی کوئی بری لڑکی ہوں جو بغیر
اجازت اُس کے بستر میں حصہ تھی، میری آنکھوں
میں آنسو تیرنے لگے۔

”رات کو کوئی ڈراوٹا خواب دیکھا تھا کیا؟“
جو جو نے پوچھا۔

میں نے ”ہاں“ میں گردون ہلا دی۔

”اس میں ڈرنے والی کیا بات ہے۔ میں
ہوں تا اچھا کیا جو میرے پاس آنکھیں۔“ وہ
مکراتے ہوئے کھڑا رہا تھا۔

”میرا چھوٹا بھائی بھی رات میں جب ڈرجاتا
ہے تو وہ بھی میرے بستر میں آ جاتا ہے اور میرے
ساتھ لپٹ کرسوجاتا ہے۔ تم نے آج مجھے گھر کی
یاد دلادی۔“ اس کے شفاف چہرے پر پا کیزہ سی
مکرا پاٹ اور لبچے میں گھر والوں کی محبت نظر
آ رہی تھی۔ میں بھی مکرا دی۔ میرے دل کا بوجھ
پلکا ہو چکا تھا۔ وہ مجھے بھی پچھے ہی سمجھتا تھا، حالانکہ
اُس کی اور میری عمر میں انتاز یادہ فرق تو نہیں ہو گا

عارضی بستر لگایا گیا تھا۔ تاکہ گرم بستر میں بیٹھ کر ثی
وی دیکھا جائے کے۔ ساتھ ہی ایک جانب سنگل
صوفہ اور میرہ کھی تھی، شاید ڈاکٹر یہاں اکیلا ہی رہتا
تھا۔

جب ڈاکٹر کی واپسی ہوئی تو میں نے اسے
ساری بات بتا دی تھی اور یہ الجا کی تھی کہ مجھے کچھ
دن اپنے یہاں رہنے کی اجازت دے دے۔
اس دوران وہ میری آنکھوں میں آئے ہوئے
آنسوں کو بار بار ٹشوپپر سے صاف کرتا رہا۔
اُس کا نام ڈیشان وقار تھا جبکہ اس کے نام کی طرح
اس کی شخصیت بھی بردبار اور پُر وقار تھی، اس نے
میری درخواست کو منظور کرتے ہوئے اپنے گھر
میں رہنے کی اجازت دے دی جس کے بعد میں
وہاں رہنے لگی، ہمارے مغربی معاشرے میں ناگھم
کوئی لفڑی نہیں ہے اگر کوئی لڑکی لڑکا ساتھ رہے تو
اُسے فرینڈشپ کہا جاتا ہے۔

میں وقار کے ساتھ رہتے ہوئے اسے جو جو
کے نام سے پکارنے لگی تھی، جب سے میں نے جو
جو کے ساتھ رہنا شروع کیا، تب سے میں اُس
سے کافی متاثر ہو چکی تھی، وہ روزانہ صبح سویرے
میٹھی آواز میں قرآن کی تلاوت کرتا تو ماحول پر
ایک سحر ساطاری ہو جاتا، مجھے یہ جو جو نے ہی بتایا
تھا کہ اس مقدس کتاب کو قرآن یاک اور اس کو
قرأت کے ساتھ پڑھنے کو تلاوت لختے ہیں، پھر وہ
ترجس پڑھتا تب میں کھوسی جاتی، وہ پانچ وقت کا
نمazı تھا میں اُسے دیکھ کر حیران ہوتی کہ اس کے
چہرے پر ایک نور کا ہالہ سامحسوس ہوتا ہے جو اسے
اور پُر وقار بنادیتا ہے۔

وہ مجھے بہت عزت و پیار سے مخاطب کرتا
جس کی وجہ سے میں اس کے ساتھ بہت سکون
سے رہ رہی تھی۔

جو جو کے جانے کے بعد میں نے بہت سوچا کہ کہیں چلی جاؤں کسی ادارے یا کسی ہاٹ میں جا کر رہوں اور اپنے کاغذات، کارڈ وغیرہ بنالوں کیونکہ اب میں اخبارہ سال کی کافی پیداوار لڑکی تھی میں نے اپنے مستقبل کے حوالے سے کافی سوچا اور فیصلہ کیا کہ جب جو جاؤئے گا تب اپنے اسکوں سے متعلقیت لے کر اس کے ساتھ جاؤں گی اور کاغذات بناؤں گی۔

جو جو ایک دن بالکل اچاک و اپس آگیا۔ وہ شادی کر کے آیا تھا اس نے آتے ہی مجھے اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کی تصویریں دکھائیں، شادی کی ویڈیو زور فوٹوز دکھائے۔ ان تصویریں اور ویڈیو زور میں وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔

وہ اپنی بہن کے بچوں کے ساتھ بھی بہت فریب تھا تصویریوں میں کہیں بچے اسے گھوڑا بنا کر سواری کر رہے تھے تو کہیں وہ اُن کے ساتھ قیلی یا کرکٹ کھیل رہا تھا، بہت خوشی اور آسودگی تھی جو جو کے چہرے پر آخر میں اس نے اپنی دہن کے فوٹو دکھائے واقعی وہ سادہ ہی لڑکی بہت پیاری لگ رہی تھی جو جو بھی بہت بچے رہا تھا دلوہا بن کر میرے لیے پاکستانی شادی کے فوٹو بہت ایمیزنگ تھے ان کی شادی میں مایوس، مہندی، بُرأت، کی رسکیں بہت اچھی اور مختلف لگ رہی تھیں اور وہ پورے خاندان کا مل کر ناچتا گانا، مذاق وغیرہ خوشیوں کو چار چاند لگا رہا تھا۔ وہ تصویریں اور ویڈیو زور دکھاتے ہوئے تفصیل بھی بتاتا جا رہا تھا اُس کے چہرے پر روشنی کا ایک ہالا سادکھائی دے رہا تھا۔

اگلی صبح جو جو یونیورسٹی جانے لگا تو میں نے اُس سے کہا۔
”جو جو تم بھی کیا سوچ رہے ہو گے کہ میں تو

وہ یہاں ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے آیا تھا اور اب اُس کی تعلیم کامل ہونے والی تھی۔

ایک دن جو جو نے بتایا کہ اُس کی دوستخت کی چھٹی ہوئی ہے۔ وہ اپنے گھر جانے والا ہے۔ تب میں نے کہا۔

”مت جاؤ جو جو! میرے ساتھ رہو۔“ میری بات سن کروہ پہن پڑا۔

”میں یہاں کیسے رہ سکتا ہوں، مجھ پر تو میرے پیاروں کے اتنے قرض ہیں کہ جنہیں میں مر کر بھی سیب اُتار سکتا۔“ اُس نے بتایا کہ وہ اپنے والدین کا سب سے بڑا بیٹا ہے، ایک بہن ہے پھر چھوٹا بھائی ہے وہ سب مجھے بہت چاہتے ہیں اس کے علاوہ میری ملکیت بھی ہے جس کے ساتھ اب میری شادی ہو جائے گی۔

”وہ تمہیں پسند ہے؟ کیا وہ بہت خوبصورت ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں وہ بھی تمہاری طرح معصوم ہی سے اور مجھے پسند بھی۔“ وہ اطمینان کے ساتھ سب پچھہ بتا رہا تھا جبکہ اس کی اس بات سے میرے دل میں دھکنی اترنے لگی تھی۔

میں نے ایسا شخص زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا اس کے ساتھ رہتے ہوئے میں مضبوط اور پیداوار ہو رہی تھی، وہ میری نوٹی پھوٹی شخصیت کی تعمیر کر رہا تھا، وہ مجھے زمانے میں زندگی گزارنے کے اصول بتاتا اور ہر طرح کی اوپنی بچے سمجھاتا تھا اب مجھے اُس کی عادت ہی پڑ گئی تھی لیکن.....؟ اس سے آگے میں سوچتا بھی نہیں چاہتی تھی جاتے ہوئے وہ اپنے فلیٹ کی چاپی مجھے دیتے ہوئے بولا تھا کہ جب میں جاؤں تو چاپی فلیٹ کے مالک کو دے جاؤں۔

تہارے گلے پر گئی ہوں۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ اس

کی پشت میری طرف تھی، میری آنکھوں میں آنسو
تیرنے لگے، میں جو تمہوڑی دیر پہلے چپک رہی تھی
بالکل خاموش ہو گئی۔ تو وہ مڑا۔

”ارے..... میں تو مذاق کر رہا تھا..... مجھے
یقین تھا کہ تم کہیں نہیں جاؤ گی اسی لیے تو میں نے
تم سے جانے نہ جانے کا پوچھا تک نہیں..... اور
مجھے خوشی ہوئی تھیں موجود پا کر کچ.....“
میں روٹی ہوئی آنکھوں سے مکرا دی اس
نے مجھے کسی بچی کی طرح ہینے سے لگا کرتلی دیتے
ہوئے کہا۔

”جب تک میں یہاں ہوں تم بے فکر ہو کر
رہو میں تھیں کبھی جانے نہیں کہوں گا۔“
جو جو کسی مدد سے ہی میں نے اپنے ڈاکو منش

اور این آئی سی وغیرہ بنوائے اور اسی کی مدد سے
اس چھوٹی سے قصھے میں ایک اسٹور پر مجھے
نوکری پیل گئی تھی، اب میں آزاد و خود اختار اور برسر
روزگار تھی، اس کے ساتھ ہی میں نے جو جو کی
اجازت سے یہاں پنسلوایا میں اس ہائل میں
رہائش اختیار کر لی۔ اپنی پڑھائی دوبارہ شروع
کرنے کے لیے بھی میں نے جو جو سے مشورہ کیا تو
اس نے کہا۔

”پر تو بڑی خوشی کی بات ہے..... مجھ سے جو
مد چاہو گی میں حاضر ہوں۔“

”بوجو مجھے شرمندہ مت کرو..... تم ہی نے تو
مجھ کو مجھ سے ملایا ہے میرے اندر یہ اعتماد تہاری
ہی وجہ سے تو ہے۔“ میں بچ بچ آس کی منون ہی۔

”مابدلت تم سے خوش ہوئے تہاری خوشنام
ہمیں پسند آئی۔“ جو جو کسی آنکھوں میں شرارت
تھی، اور میں مکراتی آنکھوں سے اسے دیکھتے

غزل

محفل کا ایک رنگ مرے دل میں رہ گیا
پھر دل کہاں کہ دل اسی محفل میں رہ گیا

خوش تھا بہت خیال کی وسعت میں دل مرا
جو آج صرف تیرے مقابل میں رہ گیا

وہ درد جو قرار کی صورت نہ پاس کا
وہ خواب جو خیال کی منزل میں رہ گیا

مت پوچھ اختیار کی بے اختیاریاں
شور فقاں بھی شور سلاسل میں رہ گیا

ایسا ہی بے ہنر ہے کہ دل را عشق کی
مشکل میں آگیا تھا سو مشکل میں رہ گیا

دنیا کی دست مدد سے جو نجگیا تھا دل
وہ بھی نواح کوچہ قاتل میں رہ گیا

معروف تھا کبھی جو تنا کے باب میں
وہ دل، وہ دل بھی حریت حاصل میں رہ گیا

اجمل سراح

ہوئے سوچ رہی تھی۔ اس دوران میں دل

سے مسلمان ہو چکی تھی، بس ظاہری طور پر انہار کرنا

باقی تھا، میں نے حجاب بھی لینا شروع کر دیا تھا،

مجھے اپنے معاشرے کی روشن بالکل پسند نہیں تھی یہ

کیسی آزادی تھی کہ جس میں گھر، خاندان، ماں

باپ کچھ بھی نہ تھا، اس انفرادی طور پر ہر کوئی اپنی

زندگی جی رہا تھا حالانکہ انسان اس طرح جی نہیں

سلتا اسے دکھ سکھے باشنا کے لیے دوسروں کے

سہارے اور مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی سب

سوچتے سوچتے پھر میرے اندر چکن اتنے لگی

تھی۔ اور ساتھ ہی اداہی بھی کہ جو جو نے مجھے جلد

ہی اپنی پاکستان و اپسی کے بارے میں بتا دیا تھا۔

اُس روز دو یک اینڈ تھا اور میں صحیح سے اُس کا

انتظار کر رہی تھی، جب وہ آیا تو میں اداہی میں

گھری ہوئی تھی، اس نے مجھے بہت سیر کروائی، پھر

ہم ڈز کرنے حب عادت ریٹورنٹ میں آگئے

وہ بھی حب ساتھا۔

”تم کیوں چپ ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”تم جو چپ ہو تو میں خوش کیسے ہو سکتا ہوں۔

ویسے کیا کوئی مسئلہ ہے؟“ جو جونے پوچھا۔

”ہاں..... کیا تم میرا یہ مسئلہ حل کر سکو گے؟“

”کیا بہت مشکل مسئلہ ہے؟“ جو جونے لہکے

چکلے انداز میں پوچھا۔

”پہنچیں میں تذبذب کا شکار تھی۔

”کیا تم میرے ساتھ شادی کرو گے؟“ میں

نے سمجھیدگی سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال

کیا۔

چند تائیں وہ میری طرف دیکھتا ہا پھر بولا۔

”دو باتیں ہیں..... ایک تو تم یہاں جن

آسائشوں کی عادی ہو وہ میرے گھر میں بالکل

نہیں ہیں، کیونکہ ہم دیہاتی لوگ ہیں، وہاں کیا

ہوئے سوچ رہی تھی۔

”کتنا اچھا ہے میرا یہ دوست.....“

اس کے بعد میں نے بڑھائی کے ساتھ ساتھ

اسلام کی تھانیت سے متعلق ساتا ہیں بھی پڑھنا

شروع کر دیں، کلام یاک کا انگریزی ترجمہ بھی

پڑھنا شروع کیا۔ جس تھی پر دولت میرے دل میں

ایک سکون کا دریا بنتے لگا اب میں نے اسلامی

درس بھی لینا شروع کر دیا۔ بڑھائی، جاب اور

اسلامی درس مجھے سر کھجانے کی تھی فرست نہیں تھی،

ہر ہفتے کی شام کو جو جو واٹکٹن سے چار گھنٹے کی

ڈرائیور کے مجھے یہاں لینے آ جاتا تھا میں

فرست کے چند گھنٹے تکال کر اس کے ساتھ کہیں

گھونے چلی جاتی ہم ڈنز ساتھ کرتے اور لیٹ

نائٹ اپس لونٹے بھی بھی وہ میرے ساتھ درس

سننے بھی چلا جاتا۔

تو اوار کو میں اپنے بہت سے چھوٹے موٹے

کام نہیا کر تی پیٹنیں کیوں ان دونوں مجھے می

بہت یاد آتی ہیں، بھی بھی تو میرے آنسو نکل

آتے، کاش ایک بار میں می کو دیکھ لوں، ان

گزرے سالوں میں می کا نہ معلوم کیا حال ہوا

ہو گا۔ وہ نیویارک میں نہ معلوم کہاں ہوں گی۔

پنسلوانیا آنے سے پہلے میں نے اُن کو ایک

بوٹھ سے فون کیا تھا، انہوں نے شکر ادا کیا کہ میں

زندہ اور خوش تھی، انہوں نے مجھے ملنے اور فون

کرنے سے منع کر دیا تھا کہا تھا کہ اب میں مائیکل

کے ساتھ نیویارک میں ہوں، تم اپنا بہت خیال

رکھو اور مجھے بھول جاؤ خدا حافظ۔“ انہوں نے

جلدی سے فون رکھ دیا تھا اور میں حسرت و افسوس

سے فون کو دیکھتی رہ گئی تھی جو کہ کب کا بند ہو چکا

تھا۔

میں نے آخری بار جب می کی آواز سنی تھی

مطابق خود اپنی براوری کے سامنے کر سے گے۔“
 یہ بخشن کر میں بہت خوش ہوئی تھی اور خوشی سے رونے لگی تھی۔ اس رونے دھونے کے دوران ہی شدت جذبات سے مغلوب ہو کر جو جو کوئی نے گلے لگایا تھا۔ اور خود ہی شرما گئی تھی جو جو کی آنکھوں میں بھی محبت کے جگنو جگنا گار ہے تھے۔ اسی بھفت میں نے درس والی مسجد میں جو جو کے ساتھ جا کر دین اسلام قبول کر لیا تھا۔ اور میرا نام میرین سے مریم رکھ دیا گیا جب جو مجھے مریم کہتا تو میں خوشی سے پھولی نہ ساتی، اور اب کچھ روز بعد میں اور جو جو پاکستان چلے جائیں گے۔

کوئی ایک ماہ بعد مجھے پاکستان سے مریم وقار کی میل موصول ہوئی تھی۔ جو جو کے والدین اور عزیزیوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا، اور بڑے دھوم دھام سے میں مریم وقار بن گئی، اس سارے کام میں وقار کی پہلی بیوی مہربانو کا سب سے بڑا پاتھر تھا، اسی کی کوششوں سے ہماری یہ شادی ہوئی تھی۔ اس نے ہی وقار کے والدین سے میری اور وقار کی شادی کی پات متوائی تھی۔

وہ بہت محبت کرنے والی خاتون ہے۔ گاؤں میں وقار اور اس کے والدین کی بے انتہا عزت تو قیر کی جاتی ہے اُن کی کافی زمینیں اور باغات ہیں نوکر چاکر بھی ہیں لیکن چھوٹے موٹے کام ہم عورتیں اپنی مرضی سے کر لیتی ہیں۔ ہم سب نہایت عزت و احترام اور محبت سے رہتے ہیں، میں انتہائی خوش ہوں کیونکہ یہ میری آئینڈیل زندگی ہے۔ میرا اور وقار کا عہد ہے کہ ہم اپنے گاؤں کو ایک جدید اور ترقی یافتہ گاؤں بنائیں گے اور اس جدوجہد میں..... میں جو جو کے شانہ بشانہ رہوں گی۔

☆☆☆

کر گھر کے تمام کام سب ہماری عورتوں کو کرنے پڑتے ہیں، ہمارے ہاں مرد گھر کے کام نہیں کرتے صرف کماتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ مجھے اپنے گھر والوں سے خصوصاً اپنی بیوی سے جو کہ اب میرے بچے کی ماں بھی ہے، اجازت لینی پڑے گی، اگر انہوں نے اجازت دی تب یہ شادی ہو سکے گی ورنہ نہیں، میں تمہیں اندر ہیروں میں رکھنا نہیں چاہتا۔“ اُس نے صاف گوئی سے کہا تھا اور مجھے بھی اُس کی یہ صاف گوئی بہت پسند آئی تھی۔

”مجھے سب مظہور ہے بُس تم اجازت لے لو، آئندہ ویک اینڈ تک میں انتظار کروں گی۔“

”اللہ بہتر کرے گا۔“ جو جو نے کہا تھا۔ دوسال آپ کسی کے ساتھ رہ لیں تو ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں۔ جو جو کے لیے میرے خیالات بیکی تھے کہ وہ بہت سچا اور اچھا بندہ ہے اب اس کے اور اچھے بندے کے ساتھ شادی کر کے میں اپنی فیلی بنانا چاہتی تھی، مسلم معاشرے کی یہ ہی بات مجھے بہت پسند تھی کہ اس میں خاندان و برادری سُسمُمے کیونکہ گھر چاہے کتنا ہی پُر آسائش اور بڑا ہو لیکن اگر اس میں رشتہ نہ ہوں تو وہ ایک سرانے لگتا ہے جہاں صرف رات گزاری جاسکتی ہے۔ اب میں اپنے خدا سے یہ ہی دعاء مانگ رہی تھی کہ جو جو کی فیلی والے مان جائیں اور میری زندگی میں سکون آجائے۔

بعد ازاں ایک ماہ تک جو جو کے گھر والے مجھ سے اور جو جو سے بات چیت کرتے رہے اور پھر انہوں نے جو جو سے کہا۔

”جب تم پاکستان آؤ تو اسے بھی ساتھ لے آنا، ہم تمہاری دوسری شادی اپنی رسم درواج کے

جنتی جائی گہانیاں

چھپ وطنی سے دوسری جنتی جائی کہانی

چھپ وطنی کی کہانی

جن لیلی کی نظر

تھی کسی آدمی کی تلاش مجھے
میں نے خود کو ہی اختیار کیا

عبدالغفار عابد

انسانوں کی غالب اکیلیت عدلی اور خواہشات کو پورا کرنے میں لگی رہتی ہے۔ انسان گناہوں سے بے پرواہ کر وقی مفادات اور اپنے تینیں یہ گمان کرتا ہے کہ وہ شاید اس دنیا میں



میں نشانِ عبرت بنتا ہوا ہے۔
پاک کتاب میں مذکورہ قوموں اور افراد کے
برے انجام کو پڑھ کر اس حقیقت کو سمجھنا کچھ مشکل
نہیں کہ کوئی بھی فرد یا قوم اپنے آپ کو اس وقت
جانبی کے لحاظات اتنا رہنے پر تیار گر لیتی ہے جب وہ
کسی بھی صورت اپنی اصلاح یا اپنے معاملات کو
درست کرنے پر آمادہ نہیں ہوتیں نفسانی کے اس
دور میں بہت کم لوگ اپنے ہیں جو اس عارضی دنیا میں
آنے کے عظیم مقصد کو سمجھتے ہیں زیادہ تر لوگ اس
مقصد کو بھول چکے ہیں ان کا مقصد اپنی عارضی زندگی
کو حسین اور علیٰ بننا ہوتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کی
ایک حد مقرر کر کی ہے اس حد کو پا کرنے والے لوگ
اللہ کے عذاب کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ حضرت
محمد ﷺ کی حدیث مبارکہ ہے۔

”تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن
نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنی خواہشات بھی اس
دین کے تابع نہ کر دے جو دین میں لا یا ہوں۔“
ہر ضرورت سے لے نیاز ہو کر عاجزی و انکساری
سے دنیا اور آخرت کی کامیابی مل سکتی ہے، دولت
اور اقتدار پر گھمنڈ کرنے والوں کو ذلت آمیز
انجام سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

☆.....☆

حاجی نور احمد ہمارے ساتھ والے گاؤں
رنگ پور میں رہتا تھا۔ چار مرلیں زمین کا مالک
حاجی نور احمد ایک خدا تر اس آدمی تھا، دولت ہونے
کے باوجود وہ سادہ زندگی بسر کرتا اور فرش سمجھ کر
ضرورت مندوں کی مدد کرتا تھا۔ اخخارہ سال کی عمر
تمھی جب والد ساتھ چھوڑ گئے۔ مرحوم والد کا غم
ابھی تازہ تھا کہ ایک سال بعد والدہ بھی وفات
پا گئی، ان دکھوں اور غموں نے اس کی زندگی کو بے
ترتیب کر کے رکھ دیا۔ جب آدمی اللہ کی رضا پر

ہمیشہ رہے گا اور اس عارضی دنیا کی تمام نعمتیں اور
عروج سدا اس کے ساتھ رہے گا۔ بے خبر انسان کو
خبر نہیں کہ پروردگار نے اسے کس عظیم مقصد کے
لئے اس دنیا میں بھیجا۔ سماں ہے تو سوال حضرت
نوح نے اپنی قوم کو مقصد بتانے کے لیے تبلیغ کی
پر وہ قوم نہ مانی۔ اللہ تعالیٰ نے نافرمان قوم کو پانی
میں ڈبو کر ہلاک کر دیا۔ قوم عاد کے لوگ اپنی
طاقت اور صلاحیتوں پر گھمنڈ کرتے تھے۔ انہوں
نے حضرت ہود کی بامقصد باتوں کو مانتے سے
انکار کر دیا۔ پھر یہ لوگ بھی اللہ کے غضب کا نشانہ
بن گئے۔ حضرت صالح نے اپنی قوم کو سمجھانے کی
بہت کوشش کی پر اصل پات ان کی بکھمیں نہ آئی
اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک چلکھاڑ کو مسلط کر دیا اور وہ
قوم اس کے نیتیجے میں تباہی و بر بادی کا نشانہ بن
گئی۔ اسی طرح حضرت لوط نے اپنی قوم کے
لوگوں کی اصلاح کرنے کی بہت کوشش کی۔
بد قسمی سے وہ لوگ بھی حضرت لوط کی بات کو نہ
سمجھ سکے وہ ہم جنیت یہیں فتح فعل پر اسرار کرتے
رہے پھر اللہ نے بد کرداروں کی پوری بستی کو الٹا
دیا۔ حضرت شیعہ اپنی قوم کو بڑے خلوص اور جعل
کے ساتھ اللہ کا پیغام سناتے رہے گمراحت کی قوم
کے لوگ نصیحت نہ پکڑ سکے پھر رب تعالیٰ نے ان کو
بھی قوم نمودی کی طرح بر باد کر دیا۔ حضرت ابراہیم
نے نافرمان بادشاہ نمرود کو حق کی دعوت دی تو وہ
حضرت ابراہیم کا دشن بن گیا پھر جب نمرود اللہ
کی پکڑ میں آیا تو اس کا وقتی عروج اس کو عذاب
اللہی سے نہ بچا کا۔ اسی طرح فرعون کو بھی اپنے
اقدار اور اپنی طاقت پر گھمنڈ تھا۔ حضرت موسیٰ
نے جب اس کی عظیم مقصد کی طرف توجہ دلائی تو وہ
نافرمانی کر بیٹھا اللہ نے پھر اسے دریائے نیل کے
حوالے کر دیا اور وہ آج تک مصر کے عجائب گھر

بھی ہوتا تھا، ان میں کئی بھیگ مانگ کر بھی گزارہ کرتی تھیں۔ اب خانہ بدوسوں کو روشنی کی فکر نہیں تھی سال بھر کے لیے ان کو گندم ملی جاتی تھی۔ حاجی نور احمد کی جوز میں غیر آباد پڑی تھی مختن اور غریب لوگوں کی دعاؤں سے تیزی سے زرخیز ہو رہی تھی، اب گاؤں کے غریب لوگوں کے دینے کے بعد بھی گندم فتح جاتی تھی، یہ گندم نہ ڈیکی دیہاتوں کے ضرورت مند لوگوں میں برابر قیمت کر دی جاتی۔

☆.....☆

حاجی نور احمد نہیں سال کے ہوئے تو شادی کا خیال آیا، پھر جلد ہی انہوں نے اپنے گاؤں کے ایک چھوٹے زمیندار کی بیٹی نجمہ سے شادی کر لی۔ نجمہ، بہت اچھی عادت کی ماں ک اور سبھی ہوئی لڑکی تھی۔ نماز پابندی سے پڑھتی اور اپنا ہر کام وقت پر انجام دیتی۔ اپنے جیون ساتھی کی ہر بات مانتی اور ہر کام بجالاتی، وہ جہاں اپنے شوہر کے ساتھ مخلص تھی۔ وہاں اس کارویہ اپنے رشتہ داروں سے بھی اپنا نیت بھرا اور دستاں تھا، غرض وہ ایسی مثالی پیوں تھی جس کا تصور ہی کیا جاسکتا ہے، حقیقی زندگی میں ایسی عورتیں بہت کم ہوتی ہیں، حاجی صاحب اپنی بیوی کو بہت اہمیت دیتے تھے، کوئی بھی مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ اس سے مشورہ کرتے۔ نجمہ کی زندگی کسی جنت سے کم نہیں تھی۔ اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک دیہاتی لڑکی کو ہر طرح کی سہولت میسر کی۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہا تھا، شادی کو چھ سال کا عرصہ ہو گیا، مگر ابھی تک وہ اولاد جیسی نعمت اور رحمت سے محروم تھے حاجی صاحب اولاد کا معاملہ اللہ کے پرست کر کے بے فکر تھے، نجمہ بھی کبھار اولاد کی کمی کو محسوں کر کے پریشان

راضی ہو جائے تو پروردگار صبر کی طاقت دے ہی دیتا ہے، حاجی صاحب نے والدین کی جداگانہ کو اللہ کی رضا سمجھ کر برداشت کیا۔ اپنے آپ کو سنبھالا اور عملی زندگی کی طرف لوٹ آئے۔ اپنی زمینوں پر توجہ دینی شروع کی۔ ایک دن زمینوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو اکٹھا کر کے کہا۔ ”آج سے آپ مزدور نہیں بلکہ میرے بھائی ہو، ہم سب مل کر مختن کریں گے انشاء اللہ اس کا پہلی میں ضرور ملے گا۔“

اللہ تعالیٰ کسی کی مختن رایگاں نہیں کرتا، جب روزی حلال کی ہوتی رکت ڈال دیتا ہے، مختن اور ایمانداری سے حاجی نور احمد کا کاروبار دوسری رات چوگنی ترقی کرنے لگا، اب اناج سے گودام بھرنے لگے، جب بھی کوئی فصل گھر آتی تو گاؤں کی مسجد میں اعلان کرایا جاتا۔

”جو بھی غریب ہو یا جس کے گھر اناج نہ ہو وہ آ کر سال بھر کا اناج مفت لے جائے۔“ ضرورت مند لوگ آتے ان کو ضرورت کے مطابق گندم دی جاتی، کسی کو ایک بوری، کسی کو دو کسی کو چار..... غرض ہر کسی کی ضرورت کا تخفیض نہ کرائے اس حساب سے گندم ملتی تھی۔

حاجی صاحب کی کافی زمین غیر آباد پڑی تھی، جس کو آباد کرنے کی کوشش جاری تھی۔ گاؤں کے جنوب کی طرف جو بھر زمین تھیں وہاں خانہ بدوسوں نے اپنی جھونپڑیاں ڈال رکھی تھیں یہ عجیب لوگ تھے مرد سارا دن یکار رہتے یا پھر تاش وغیرہ کھلنے میں مشغول رہتے اور فارغ اوقات میں سوئے رہتے، ان میں پیشتر کا مشغله مرغ یا پھر کتے پالا تھا، عورتیں گھر بیلوں کا ج کے علاوہ مختن مزدوری بھی کرتی تھیں، ان کے ذمہ معاشی حالات کو درست رکھنا اور گھر والوں کا پیٹ پالنا

حاجی نور احمد اب بہت خوش تھے جس نعمت کی دونوں میاں بیوی کی محبوس کر رہے تھے وہ اللہ تعالیٰ نے بیٹے کی صورت میں پوری کردی تھی۔ بیٹے کی پیدائش پر انہوں نے دل گھول کر خیرات باختی گاؤں کے اروگرد بیٹھے خانہ بدوسوں کو مالکانہ حقوق پر پانچ پانچ مرلے زمین تقسیم کی گئی تھی۔

اس بار بھی حاجی صاحب کی فصل پہلے کی نسبت کئی گناہ زیادہ ہوئی تھی، حب معقول انہوں نے اپنے گاؤں کے علاوہ نزدیکی دیہاتوں میں بھی اعلان کرایا کہ جس کے گھر اناج نہیں جوانا ج خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا ہو وہ آ کر اپنے حصے کی گندم لے جائے..... اسی روز حاجی صاحب ضرورت مندوں میں گندم تقسیم کر رہے تھے، ایک آدمی نے چار بوری گندم کا مطالبا کیا، اس کے گھر کے افراد کی تعداد اور کام کے بارے میں پوچھا۔ تسلی کرنے کے بعد جب حاجی صاحب اسے گندم دینے لگے تو مشی خالق نے کہا۔

”اسے گندم نہ دو یہ آدمی دوسرا بار آیا ہے صحیح چھ سے بھی چار بوری گندم لے گیا تھا، مجھ شک پڑا کہ یہ آدمی ضرورت مند نہیں ہے، میں اس کے بارے میں معلومات لینے اس کے گاؤں گیا تھا، ابھی میں وہاں سے ہی آ رہا ہوں، گاؤں کے لوگوں نے بتایا یہ آدمی مستری ہے شہر جا کر اچھی روزی کمالیتا پسے۔“

مشی خالق کی بات سن کر حاجی صاحب نے اسے گندم دینے سے انکار کر دیا اور کہا۔

”تم جو گندم پہلے لے گئے ہو وہ کل تک واپس کر دو تاکہ اصل ضرورت مند کو دی جائے۔“ آدمی نے منت ساجت کی۔

”بھلی والی گندم واپس نہ لو وہ واقعی ہی میری ضرورت ہے میں ماتھا ہوں دوبارہ آ کر میں نے

ہو جاتی تھی ایک دن نجمہ کی ماں اُسے ملنے آئی تو اُس نے اپنی بیٹی کی پریشانی کو محبوس کر لیا، اُس نے اپنی بیٹی کو اپک دربار کے بارے میں بتایا کہ آپ دہاں جا میں اس دربار پر جا کر خیرات کرنے والے بہت سے لوگوں کی مرادیں پوری ہو چکی ہیں، باپا مراد علی شاہ کی دعا کے صدقے اللہ میاں آپ کی بھی گود ہری کر دیں گے۔

نجہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی رات کو حاجی صاحب سے دربار پر جانے کی اجازت مانگی، خدا ہونے کی بجائے بڑے پیار سے حاجی صاحب نے نجمہ کو سمجھایا۔

”نجہ! پچھے جتنی بھی آہتہ آواز میں روئے وہ آواز ماں کو فوراً جگادیتی ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ رب جو اپنے بندوں سے ستر ماوں سے زیادہ محبت کرتا ہے وہ اپنے بندے کی فریاد نہ سنے اور اپنے بندے کی حاجت پوری نہ کرنے اللہ نے ہمیں اولاد کی نعمت کے علاوہ ہر نعمت سے نواز رکھا ہے، دن بدن ہمارا رزق بڑھ رہا ہے، جو بن مانگے ہمیں سب کچھ دے رہا ہے اس کی ذات تم پر ضرور مہربان ہو گی۔ تم اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کریں رہا کرو ایک نعمت کا شکر دوسرا نعمت کا ذریعہ بتا ہے، ما بیوی کو اپنے دل میں جگہ نہ دو، پروردگار ہمیں اولاد کی نعمت سے بھی ضرور نواز دے گا۔“

اس بات کے کچھ عرضے بعد دونوں میاں بیوی نے شہر کے ایک قابل ڈاکٹر کے مشورے پر اپنے ثیسٹ کروائے اور نخے کے مطابق میدیں کھانا شروع کر دی، ٹھیک ایک ماہ بعد نجمہ نے اپنے شوہر کو خوشخبری سنادی، یہ خوشخبری سنتے ہی حاجی صاحب نجمہ کو ساتھ لے کر عرہ ادا کرنے سعودی عرب روانہ ہو گئے تھے۔

قرض دار تھا انہوں نے اپنی جیب سے قرض کی رقم ادا کر دی تھی۔

☆.....☆

رُنگ پور گاؤں اور اس کے ارد گرد کا علاقہ بنیادی سہولتوں سے محروم تھا۔ دور دور تک کوئی اپستال نہیں تھا۔ لوگوں کو علاج کے لیے کوئوں دور شہر جانا پڑتا تھا، یہی حال تعلیم کا تھا، پانچ بیس کے بعد پہنچے مفت تعلیم سے محروم تھے۔ سیاست ایک جا گیر دار خاندان کے گرد گھومتی تھی، وہ ایکشن کے دوران اس علاقے میں نظر آئتے، کامیابی کے بعد اگلے ایکشن تک پھر دوبارہ بھی اوصہر کا رخ نہ کرتے، ان کو عوامی مسائل سے کوئی دیکھنی نہیں تھی۔ علاقے کے لوگ حاجی نور الحمد کی عزت کرتے تھے، وہ عوام نواز اور لوگوں کے دکھ درد کے ساتھی تھے، لوگ ان کو اپنا سیجا سمجھنے لگے وہ حاجتے تھے کہ اس سال کے آخر میں ہونے والے ایکشن میں حاجی صاحب حصہ لیں، اور جیتنے کے بعد اس علاقے کی محرومیوں کو دور کر دیں۔

لوگوں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے حاجی نور محمد نے ایکشن لڑنے کا فیصلہ کر لیا جا گیر داروں نے اس فیصلے کا نماق اڑایا، چند بزرگوں نے حاجی نور الحمد کو مشورہ دیا کہ آپ ایکشن میں حصہ نہیں، جا گیر دار سیاست کی آڑ میں غنڈہ گردی بھی کرتے ہیں۔

تحانے کچھری میں انہوں نے اپنے آدمی بھائے ہوئے ہیں۔ لوگ خوف کے مارے ان کو ووٹ دیتے ہیں۔ اگر کوئی انکار کرتا ہے تو ان کو طرح طرح سے نکل کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کے گھر کے کسی فرد کو اخواء کر لیتے ہیں اور اس وقت تک نہیں چھوڑتے جب تک ان کے مطالبات کو نہ مان لیں، علاقے میں ان کی اجارہ داری قائم ہے، ہماری مانیں تو آپ ایکشن میں حصہ نہیں، اپنا فیصلہ واہیں لے

غلطی کی ہے، مگر ایک مجبوری تھی جس نے مجھے یہ غلطی کرنے پر مجبور کیا۔ حاجی صاحب نے اس آدمی کی ایک نسی اور کہا۔

”تم دھوکے باز ہوتھاری کسی بات پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا، جاؤ جا کر گندم واپس لے گر آؤ، اگر تم کل تک گندم واپس نہ لائے تو میرے آدمی خود آ کر گندم لے آئیں گے اور تمہارے خلاف دھوکا دہی کا لیکس درج کر کے حوالہ پولیس کیا جائے گا۔“ وہ آدمی ڈر کے مارے گندم واپس لینے چلا گیا، مگر جا کر اس نے سارا واقعہ اپنی بیوی کو سنایا۔ بیوی نے کہا۔

”آپ پریشان نہ ہوں، میں ابھی جا کر نجم کو اصل صورت حال سے آگاہ کرتی ہوں۔“

”نجمہ میرا شوہر مستری ہے، اس کی محنت سے گھر کا گزارا چل رہا ہے، پچھلے سال روڑ ایکیڈنٹ میں میری بیٹی کی دونوں ٹالکیں ٹوٹ گئی تھیں، آپ پریشان کے لیے ہم نے ہمسائے سے کچھ رقم ادھار لی تھی۔ واپسی کے وعدے والا نام گزرے کافی دن ہو چکے ہیں، وہ بہت نکل کر رہا تھا۔ صح اس نے گھر آ کر گہا۔

”اگر شام تک میرے پیسے واپس نہ کیے تو تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا۔“ اس کے ڈر سے میرا شوہر دوبارہ گندم لینے گیا تھا تاکہ وہ گندم فروخت کر کے اس کا قرض ادا کر دے۔“

جمہنے اس کی بات سن کر اسے تسلی دی۔ پھر حاجی صاحب کو گھر بلکہ ان کی اصل پریشانی سے آگاہ کیا۔ حاجی صاحب نے وعدہ کیا کہ میں خود جا کر تصدیق کروں گا اگر یہ لوگ قرض دار ہوئے تو میں خود قرض کی رقم ادا کروں گا۔ حاجی صاحب نے جا کر تصدیق کی تو پہنچ چلا کہ واقعی وہ آدمی

لیں اللہ نہ کرے اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو ہمارا کیا بنے گے۔“
چاہتے ہیں تو ایکشن سے دستبردار ہونے کا اعلان کرو۔“ حاجی صاحب نے اُن کی بات مانے سے انکار کر دیا اور کہا۔

”آپ کچھ بھی کر لیں میں جا گیرداروں کے آگے سرنیس جھکاؤں گا۔ آپ میرے بیٹے کا کچھ نہیں بکاڑ سکتے جس نے دیا ہے وہ واپس بھی کرے گا۔“

حاجی صاحب نے بیٹے کے معاملے کو اللہ کے سپرد کر کے اپنی توجہ ایکشن مہم پر مرکوز رکھی ایکشن کے دن انہوں نے منج کی نماز پڑھ رپاپی کامیابی اور بیٹے کی بحفاظت واپسی کی دعا مانگی جب مسجد سے گزر آئے تو موبائل فون کی بلنر ہی کھی کال ریسمیکو تو کال کرنے والا کہر ہاتھا۔

”آپ کا بیٹا میرے پاس ہے، میں شام تک اُسے آپ کے پاس لے آؤں گا۔“ شام کو جس آدمی کے ساتھ راحیل ھر آیا سے دیکھ کر حاجی صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے یہ وہی مستری تھا جس کا قرض حاجی صاحب نے اپنی جیب سے ادا کیا تھا۔
تفصیل بتاتے ہوئے اُس نے کہا۔

”راتوں رات امیر ہونے کا لائق مجھے اخواء کاروں کے گروہ میں لے گیا، اس گروہ کا سربراہ جا گیردار کا بیٹا تھا،“ میں آرڈر ملتا کہ فلاں آدمی کو اخواء کرتا ہے ہم اسے اخواء کر لیتے اس کی رہائی پر بھاری رقم لی جائی، اس رقم کا آدھا حصہ جا گیردار کے بیٹے کا ہوتا باقی رقم ہم برابر قیمت کر لیتے، جس دن آپ کا بیٹا اخواء ہو گئیں گھر گیا ہوا تھا، واپس آیا تو پہنچ چلا کہ میرے ساتھی جا گیردار کے حکم پر آپ کا بیٹا اخواء لائے ہیں۔ میں نے اُس وقت ناراضی کا اظہار مناسب نہیں سمجھا۔ پر میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ راحیل کو آپ تک ضرور پہنچاؤں گا۔ جب آپ نے ان لوگوں کی بات نہ مانی تو انہوں نے آپ کے بیٹے

بزرگوں کی باتیں سن کر حاجی صاحب بولے۔

”اُن کا عروج ختم ہونے والا ہے۔ تکبیر اور غرور اللہ کو پسند نہیں، اُن کا تکبیر ہی اُن کی موت ثابت ہو گا۔ تکبیر چاہے دولت کا ہو دوسروں پر آئی مصیبت کو سزا اور اپنے پر آئی مصیبت کو آزمائش بھکھنا ہو طاقت کا ہو رجتے کا ہو حسن کا ہو علم کا ہو حسب و نسب کا ہو یا تقویٰ اور پارسائی کا ہی کیوں نہ ہو آخر آدمی کو مار ڈالتا ہے۔“ ایک لمحہ توقف کے بعد پھر بولے۔

”وقت کے بادشاہوں نے غریب لوگوں سے چینے کا ہی نہیں اپنی موت آپ مرنے کا حق بھی خپیں لیا ہے، میں نے جا گیرداروں کے اقتدار کو پہنچ کرنے کا جو فیصلہ کیا ہے اُن کے خوف سے واپس نہیں لوں گا،“ آپ دعا کریں انسانیت کے ان دشمنوں کی عارضی جیت اس بار نکلت میں تبدیل ہونے والی ہے۔ لوگ اُن کی مخفی سیاست سے نگ آپکے ہیں اب کوئی اُن کے جھوٹے وعدوں پر اعتبار نہیں کرے گا۔“

جا گیرداروں کے ظلم و ختم سے نکل لوگ حاجی نور احمد کی انتسابی ہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے، حاجی صاحب کے ساتھ لوگوں کی محبت دیکھ کر وقت کے خداوں کو اپنی نمائی خطرے میں محسوس ہونے لگی۔ اپنی چوہرہ اہب اور عزت بچانے کے لیے انہوں نے ہر حرہ بہ آزمایا لیکن کامیاب نہ ہو سکے، پہلے میں کا لائق دے کر حاجی نور احمد کو اپنے حق میں دسپردار کرنے کی کوشش کی، جب وہ اس لائق میں نہ آئے تو پھر ان کے بیٹے راحیل کا اخواء کر دیا جو ابھی پانچویں کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ دوسرے دن اخواء کاروں سے فون کرایا کہ اگر اپنے بیٹے کی بحفاظت واپسی

بنیادی مسائل کافی حد تک کم ہو چکے تھے۔ یہی وجہ حمی کہ حاجی نور احمد اپنے حلقات سے مسلسل تین بار قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔

راحیل نے گاؤں کے ایک ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تو اعلیٰ تعلیم کے لیے شہر کے کالج میں داخلہ لے لیا، ادھر فرشی خالق کی بیٹی عابدہ نے بھی امتیازی نمبروں میں میٹرک پاس کر لیا تھا سے بھی شہر کے کالج میں داخل کر دیا۔ جس کا سارا خرچہ حاجی صاحب دیتے تھے۔ گاؤں سے شہر بہت دور تھا لہذا دونوں کی رہائش کا بندوبست ہوٹل میں کیا گیا۔ راجیل اور عابدہ کو ڈاکٹری شعبہ بہت پسند تھا وہ ڈاکٹر بن کر لوگوں کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ پھر وہ دونوں ڈاکٹری کے امتحان میں اعلیٰ پوزیشن سے کامیاب ہو کر ڈاکٹر بن گئے تھے۔

ایک روز حاجی نور احمد اور ان کا سابقہ مشی اور حالیہ پی اے خالق اسلام آباد سے واپس آ رہے تھے کہ ان کی گاڑی سامنے سے آنے والی گاڑی سے نکر گئی، خادشا تناشدید تھا کہ دونوں موقع پر ہی دم توڑ گئے تھے۔

☆.....☆

راجیل عابدہ سے شادی کر کے اپنے والد مرحوم کی روح کو تکییں پہنچانا چاہتا تھا۔ مگر تجھے اس کی شادی کسی اعلیٰ گھرانے کی لڑکی سے کرانا چاہتی تھی۔ اس نے راجیل کو بہت سمجھایا۔

”بیٹا عابدہ سے شادی کا خیال اپنے دل سے نکال دو کسی بڑے خاندان کی لائق لڑکی کو اپنی شریک حیات بناؤ جو آپ کے کیریئر میں آپ کا ساتھ دے۔“

راجیل نے اپنی والدہ کی باتیں سن کر کہا۔

”آپ کے شوہر، میرے والد کی سوچ کیا

راجیل کو ہمارے ملک افغانستان کے ایک ایجنسٹ کو فروخت کرنے کا فیصلہ کر لیا، بارڈر پار کرانے کی ذیولی میری لگادی۔ میں راجیل کو بارڈر پار کرانے کے بعد آپ کے پاس لے آیا ہوں، آپ نے مشکل وقت میں میری مدد کی تھی آج اس کا بدلہ چکا دیا ہے۔“

☆.....☆

لوگوں نے کسی ڈر اور خوف کے بغیر حاجی نور احمد کو دوست دیے لہذا وہ اکثریتی دونوں سے ایکشن جیت کر قومی اسمبلی کے ممبر بن گئے۔ ہر عروج کو زوال آتا ہے جا کیردار خاندان کے اقتدار کا سورج اب ڈوب چکا تھا۔ انسانیت کے دشمنوں کی رسوانی ابھی باقی تھی۔ حاجی صاحب نے راجیل کے اغواء کا مقدمہ جا کیردار اور اس کے بیٹے کے خلاف درج کرایا تھا۔ دوسرا پیشی پر ہی دونوں باپ بیٹا جیل چلے گئے تھے۔

لوگوں کی خوش قسمتی تھی کہ ایکشن جیتنے کے بعد بھی حاجی نور احمد نے ان کی خدمت جاری رکھی بلکہ پہلے سے بھی زیادہ لوگوں کی خدمت کرنے لگے۔ سب سے پہلے انہوں نے اسپتال کی

حکومت سے منظوری لی۔ جلد ہی اس کی تعمیر شروع ہو گئی۔ اس تعمیراتی کام کا ایک اور بھی فائدہ ہوا کہ بہت سے بے روza گاروں کو مزدوری کے لیے کام مل گیا۔ حاجی صاحب نے اس تعمیراتی کام میں ذاتی دچکپی لی۔ بہت جلد اسپتال بن گیا اب لوگوں کو علاج کے لیے شہر بیس جانا پڑتا تھا۔

رنگ پور گاؤں میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ ہائی اسکول بنوائے۔ اسی طرح دوسرے دیہات میں بھی اسکول اور کالج بنائے گئے اب میٹرک تک بچوں کی مفت تعلیم کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ اگلے ایک من سے پہلے علاقے کے

کرتا، اس کی یہی بات لوگوں کو اچھی لگتی تھی اور لوگ اس کے اتنے گرویدہ تھے کہ اسے سلام کرتے نہ تھکتے تھے۔

چھٹی کا دن تھا دونوں میاں یوں نے شہر جانے کا پروگرام بنایا وہ تیار ہو کر گھر سے نکلنے ہی والے تھے کہ اپتال سے فون آیا کہ آپ جلدی اپتال پہنچیں ایک ایر خسی کیس آیا ہے۔“ دونوں نے شہر جانے کا پروگرام کیسٹل کیا اور سیدھے اپتال پہنچ گئے۔

راجیل نے مریضہ کو چیک کیا تو اُسے فوری آپریشن کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر راجیل نے کہا۔

”اُس کا شوہر فارم پر دستخط کرے۔“
”ڈاکٹر صاحب اس کا شوہر تو اس وقت موجود نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے وہ نہیں تو اس کا بینٹا کر دے۔“
”جی وہ بھی نہیں ہے دونوں باپ بینٹا اخوااء کے ایک کیس میں جیل میں ہیں۔“

”اچھا تو یہ جا گیردار کی یوں ہے؟“
اور پھر پتہ لگا تھا کہ وہ مریضہ اُس جا گیردار کی یوں اور بیٹھی کی ماں تھی، جنہوں نے راجیل کو بھی اخوااء کرایا تھا۔

ڈاکٹر راجیل کے ذہن میں اچانک ماضی کی بجلی کو ندی بھی اپنے اخوااء کا منظر نمایاں ہو گیا تھا، بس ایک لمحے میں شیطان نے اس کے دل میں نق卜 لگانی چاہی تھی، لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے مرحوم والد حاجی نور احمد کے خون نے جوش مارا تھا اور ڈاکٹر راجیل نے اپنی تربیت اور فرض کے سامنے شیطان کو مات دیتے ہوئے اپنے دشمن کی یوں اور ماں کی زندگی بچانے کے لیے آپریشن تھیز کی طرف قدم بڑھادیے تھے۔

☆☆.....☆

تمی؟ اور آپ کی سوچ کیا ہے؟ انہوں نے تو بڑے خاندان میں شادی نہیں کی تھی، آپ کا خاندان بڑا تھا، دولت ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے ہی گاؤں کے چھوٹے گھرانے میں شادی کی، میرے والد مرحوم نے ہمیشہ غریب لوگوں کو گلے لگایا، اُن کو اہمیت دی، آپ بتا میں عابدہ میں کیا کمی ہے؟ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی ہے اور میرے ہی شےبے سے ملک ہے میرے کیریئر میں میرا ساتھ دے گی۔ اُس کے والد نوت ہو چکے ہیں اور اس کی والدہ بیمار ہتھی ہیں، وہ اپنی والدہ کا علاج کرائے گی یا اپنی شادی کے لیے جائز ہنائے گی۔ اس وقت اسے ملکص دوست کی ضرورت ہے جو اسے سہارا دے۔ میں نے اس کا ساتھ نہ یا تو اور کون دے گا؟ میری شادی صرف اور صرف عابدہ سے ہو گی کیونکہ اس وقت اُسے میری اشد ضرورت ہے۔“

راجیل کی صدر رنگ لائی نجrhne اپنے بیٹے کی مریضی کا احترام کیا، یوں راجیل اور عابدہ کی شادی ہو گئی، یہ زبردستی کی شادی نہیں تھی بلکہ دونوں کی پسند کی شادی تھی، جس کو خاندان بھر میں نکاپ و رنگ سے دیکھا جا رہا تھا۔ عابدہ سے شادی ہو گئی تو لگتا تھا راجیل کو دو چہناؤں کی مسٹریں مل گئی ہیں وہ بہت خوش تھے، عابدہ بھی راجیل کو پاکر بہت خوش تھی، راجیل کی والدہ بھی مطمئن تھیں کہ بینٹا مسروڑے اُن کی ازدواجی زندگی میں خوشیوں کے گلاب مہک رہے تھے۔

☆.....☆

راجیل اور عابدہ رنگ پور گاؤں کے سرکاری اپتال میں ڈیوٹی کر رہے تھے راجیل اپنے باپ کی طرح سادہ زندگی گزار رہا تھا اور وہ اکثر غریب اور نادار مریضوں کی اپنی جیب سے مدد

حین آپکے قیسری جیتی جاتی کہانی

حی زندگی

ذکر نزہت عبادی کی تکمیل

زندگی کا ہو کوئی تو مقصود
زیست یونہی بہر نہ ہو جائے

فیضان حسین عثمانی

"اسلام و علیکم کیمی ہو ماشاء اللہ بہت اسارت پاک نظر بد سے بجائے (آمین)"۔ "میرے اس طرح ایک ہی سانس میں سوالات کی بوچھاڑ اور پہلے سے زیادہ خوبصورت نظر آ رہی ہو اللہ



دونوں نے ساتھ کی ہے، بس پوئیں بھیش ماہین جہاں ہوتی وہاں میں ہوتی تھی۔ ماہین ایک نہ کہہ لنسار، خوش گفتار اور خوش بس لڑکی تھی، ہر وقت کسی نہ کسی کی دل بجوتی کرنے والوں کی پریشانی دور کرنے کے لیے سوچتا، دوسروں کی باتوں اور مسائل کو چھرے پر بھر پور مسکان سمجھ کر سنتا اور سمجھنا، ماہین کی ہر وقت یہ تو کوش رہتی تھی کہ اس کی بات سے کسی کی بھی دل آزاری نہ ہو جائے، کوئی اُس سے ناراض نہ ہو جائے، ہر وقت اپنے کام میں مکن، گھر کو جانا، چکانا، اونچھے سے اونچھے کھانے پکا کر گھر والوں کو کھلانا ان کی ہر چھوٹی چھوٹی کی بات اور خوشی کا خیال رکھنا اُس کی زندگی کا مقصود رہا۔

ماہین پورے گھر میں اپنے پاپا بہر و ز احمد سے بہت زیادہ فریب تھی۔ ان کا خیال رکھنا، ان کے کپڑے استری کر کے رکھنا، جوتے موزے، نائی ضرورت کی ہر چیز کو سلیقے اور قرینے سے رکھنا ان کی پسندیدہ ڈشز بنا بنا کر ان کو کھلانا.....

بہر و ز صاحب بہت اچھی اور نہایت اہم سرکاری پوسٹ پر موجود تھے۔ گرانہوں نے اپنے بھجوں کی پروش حال کے لئے سے ہی کی تھی۔ بھی حرام کا نوالہ منہ میں جانے نہیں دیا تھا اور یہ ہی وجہ تھی کہ ان کی اولاد نیک سیرت اور اخلاقی تربیت سے آرستہ تھی۔ جبکہ ماہین کی خوبیوں کی تو بات ہی الگ تھی۔

گرجو یشن مکمل کرنے کے بعد ماہین نے ٹریننگ کے ساتھ دوڑ حاضر کے مطابق پچھے ڈپوے بھی کے اور پھر اسے پایا سے جاب کی اجازت بھی مل گئی اور وہ ایک اسکول میں جا ب کر نے لگی۔ وہاں بھی وہ اپنی عادت کے مطابق اپنے ساتھ موجود اساف کا ہر دم خیال رکھتی بچوں

کرنے پر ماہین نے صرف اپنی مخصوص اور دُن موہ لئے والی پیار بھری مسکان ہی چھرے پر جائے رہتی اور مسکرا سکر اکر مجھے دیکھتی رہی۔ ”یار ساتھا کہ تمہاری شادی ہو گئی ہے تم نے تو ہمیں بلانے کی بھی زحمت گوارہ نہیں کی، ہمیں تو کسی کے ذریعے پتہ لگا کہ ہماری پیاری ہر دل ہر یہ دوست اپنے پیارے گھر چلی گئی ہے تو ہمارے دل سے دعا نہیں ہی دعا نہیں لکھیں۔“

”ہم ہمیں بیٹھ کر بات کریں، اس طرح تو مناسب نہیں ہے یا پھر کسی دن تو چکر لگا میرے گھر پہنچنے کا تفصیل سے بات ہو گی۔“ ماہین پہلی بار اپنے ہونٹوں پر نے تسلی الفاظ کے ساتھ جس طرح وہ بولتی تھی اُسی طرح مجھ سے مخاطب ہوئی۔ تو میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں یار ٹھیک ہے، میں چکر لگاؤں گی۔ کچھ پرانی یادیں تازہ کریں گے،“ اور یہ کہتے ہوئے اُس سے اجازت لی گئی۔

گھر آ کر میں ماہین کے بارے میں سوچتی رہی تھی کہ ماشاء اللہ وہ شادی کے بعد اچھی ہو رہی ہے، اللہ پاک اُس کی یہ شادی کامیاب کرئے آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ یہ شادی سے میری کیا مراد ہے، تو میں نے یہ شادی کا لفظ اس لیے لکھا ہے کہ یہ ماہین کی دوسری شادی ہوئی ہے، دو سال پہلے بھی اُس کی شادی ہوئی تھی مگر..... ہو سکتا ہے کہ بات آپ کی بحاجت میں نہ آ سکے۔ میں آپ کو شروع سے بتائی ہوں۔

میں اور ماہین بہت اچھی دوست ہیں، گھر قریب قریب ہونے کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کے بیمیش قریب سے قریب تر رہے ہیں، اسکول کا، ”ٹریننگ سینٹر“، میاں تک کہ جاب تک ہم

میر سے ہو گئی تھی۔ شادی کے بعد ماہین اور شاہ میر کافی نوں تک تو دعویٰ تھی اڑاتے رہے تھے اس دوران میں وہ دنوں جب بھی نظر آتے سکراتے ہوئے نظر آتے، مگر جانے کیوں شاہ میر کے چہرے پر آنے والی مسکراہٹ مجھے مصنوعی لکھتی تھی۔ وہ بات کرتے کرتے خاموش ہو جاتا، کہیں کھوسا جاتا، دوسری طرف ماہین کو دیکھ کر بھی یوں لگتا تھا جیسے وہ اندر ہی اندر گھٹ رہی ہے، کوئی ایسی بات ہے جس کو وہ چھپا رہی ہے۔

لوگ خوبصورت چہروں کو دیکھ کر اکثر دھوکا کھا جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خوبصورت چہرہ ہے تو دل بھی خوبصورت ہو گا مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ خوبصورت چہروں کے پیچھے کوئی خوبصورت لوگوں کی تکالیف دور کرنے والا دل چھپا ہوا ہو، مگر یہاں تو معاملہ بالکل الٹ تھا، شاہ میر جتنا خوبصورت تھا، اُس کا دل اُس سے بالکل الٹ تھا جبکہ ماہین اپنی خوبصورتی کے ساتھ ایک دردمند اور احساس کرنے والا دل بھی رکھتی تھی، اُس کے اندر کی خوبصورتی اُس کے چہرے اُس کی باتوں سے ظاہر ہوتی تھی۔ کسی کا دل دکھانا اُس کی سرشت میں شامل ہی نہیں تھا، مگر ماہین کو کیا معلوم تھا کہ اُس کی تقدیر یہ میں کیا لکھا ہے اُس کے پاپا بہرہ ز صاحب کو بھی کیا پیچھے تھا کہ وہ اپنی ہر دل عزیز بیٹی کے لیے جس خوبصورت پڑھے لکھے بہرہ ز صاحب خاندانی لڑکے کا اختیاب کر رہے ہیں وہ اُن کی بیٹی کے ساتھ کیا سلوک کرے گا، اُن کو کیا معلوم تھا اُن کی اتنی پیاری بیٹی کو کسی کے دل کو شہیں پہنچانے کا تصور بھی نہیں ترسکتی، اُس کے اپنے ہی دل کو بہت بڑی شہیں لکھنے والی ہے۔

شادی کے دو ماہ کے بعد میری ماہین سے ملاقات ہوئی تو مجھے اُس کی مسکراہٹ کچھ بھی بھیجی

کا تو حد سے زیادہ خیال رکھتی، اُن کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت بھی کرتی تھی۔ ماہین کے والدین تو اپنی بیٹی پر جان چھڑکتے تھے۔ قبض جلدی اٹھنا، نماز اور تلاوت قرآن سے فارغ ہو کر اسکول کی تیاری کرنا، وہاں مصروف رہنا وہاں سے آکر اپنی ماں کا امور خانہ داری میں ہاتھ بیٹانا اور بہن بھائیوں کی ضرورتوں کا خیال رکھنا۔ ماہین کے والدین اپنی بیٹی پر مشک کرتے تھے مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ کاپ تقدیر نے اُنکی بیٹی کے نصیب میں کیا لکھا ہے۔ اور اُس کو مستقبل میں کس آزمائش اور تکلیف سے گزرنا ہے۔ وہ تو بس اپنی بیٹی کو دیکھ کر جیتے تھے، اسی دوران ماہین کا ایک بہت اچھا شرمند آ گیا تھا۔

شاہ میر دیکھا بھala اچھا خوبصورت رہا لکھا نوجوان تھا، خاندان کا ہی لڑکا تھا، اس لیے زیادہ چھان بیٹیں کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی، ویسے بھی ماہین کے پاپا بہرہ ز صاحب زیادہ چھانے کے قائل نہیں تھے، ان کا کہنا تھا کہ جتنا چھانیں گے اتنے ہی نکل آئیں گے، اس لیے رشتہ منظور کر لیا گیا تھا۔ ویسے انہوں نے بیٹی سے اس رشتے کے بارے میں رائے ضرور لی تھی، تو اُس نے باپ کے سامنے سعادت مندی سے سری یہ کہہ کر جھکا دیا۔

”ابو جی آپ نے میرے لیے جو بھی کیا اور سوچا ہے ہمیشہ اچھا ہی کیا ہے، اب بھی آپ نے اچھا ہی سوچا ہو گا۔“

شاہ میر اچھا پڑھا لکھا لڑکا تھا وہ بہترین حاب کر رہا تھا۔ قریب کی رشتے داری بھی تھی، مگر کسی کو یہ کب معلوم ہوتا ہے کہ جب نصیب اور تقدیر پلانا کھاتے ہیں تو پھر قریب والے بھی دوڑ ہو جاتے ہیں۔ قصہ تختصر جلد ہی ماہین کی شادی شاہ

سی نظر آئی ایسا لگا کہ جیسے وہ مجھ سے ہی کیا سب سے کچھ چھماری ہے ماہین بہت گہری لڑکی تھی اپنے دکھنگی بھی کسی پر عیان نہیں کرتی تھی ہاں یہ دیگر بات تھی کہ بھی بھی اس کا چہرا اس کی بات کی نعمتی کر دے تو سامنے والا کچھ جانے مگر وہ خود سے کبھی نہیں بتاتی تھی، اور اب بھی وہ یہی کر رہی تھی، مگر اس کا چہرا اس کے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اس کی پھیلی پھیلی مسکراہٹ اور غم اور تکلیف کو ظاہر کرتی اس کی آنکھوں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر موجود کرب اور دکھ کو محسوس کرتے ہوئے اس سے بہت محبت کے ساتھ کہا تھا۔

”ماہین میں اور تم بچپن کے دوست ہیں تم مجھ سے اور میں تم سے اپنی دکھ تکلیف خوشی سب شیر کرتے چلے آئے ہیں تو اب ایسا کیا ہے جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو اور اندر رہی اندر گھٹ رہی ہو، تم نے حالت کیا بنا رکھی ہے میری دوست میری جان اب بتا بھی دو کہ آخر تھمارے ساتھ کیا مسلسلہ ہے؟“

”میری اور شاہ میر کی علیحدگی ہو گئی ہے، مصباح۔“ ماہین نے میرے سامنے جیسے ایک دھماکہ کر دیا تھا۔ مجھے اس کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

”کیا کہہ رہی ہو تم؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ ابھی تھماری شادی کو دو ماہ ہی تو ہوئے ہیں۔“

”جو حقیقت ہے وہ ہی تھیں بتاتی ہے۔“

ماہین نے پھیلی پھیلی کی آواز میں کہا تھا۔

مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میرے کانوں کی ساعت ختم ہو چکی ہے، میری پیاری سی خوبصورت اور ہر کسی کا دل موہ لینے والی میری دوست جس کو میں نے اپنے ہاتھ سے دلان بنایا تھا وہ دو ماہ کے

دل کو نہیں نہیں پہنچانی ہے، مصباح میں نے بھی یہ
ہی سوچا تھا کہ میں ایک وفا پرست، شوہر پرست
بیوی بنوں گی۔ میں نے جوزعت اور مقام اپنے
گھر میں بنایا ہے وہ سرال میں برقرار رکھوں گی
مگر میرے سارے ارمان شاہ میر نے بڑی بے
دردی سے پلٹ دیے مجھے اپنی آنکھوں میں موجود
سینکڑوں خوابوں کی اتنی بھیاںک تغیری ملے گی میں
نے سوچا بھی نہیں تھا۔“

اس نے میری بات کا بڑی ڈھنائی سے
جواب دیا تھا۔
”تم خود بتا دو اپنے اور میرے گھروں کے
کو۔“ اس کے بعد شاہ میر نے مجھے چار روز کے
لیے میرے پاپا کے گھر بھیجا مگر پھر پلٹ کر جرنہ لی
تو میں نے ایک ایک بات اپنے گھروں کو
بتادی کہ میں اب تک کس اذیت سے گزری
ہوں۔

پاپا اور امی کا صدمے سے براحال تھا ان کو کیا
پتھر تھا کہ وہ اپنی لاڈلی چیزی بیٹی کو کس جہنم میں بھیج
چکے ہیں۔

”بس اب یہ وہاں نہیں جائے گی، بلاو شاہ
میر اور اس کے گھروں کو جلد از جلد بلاو میں
اس مسئلے کا فیصلہ چاہتا ہوں۔“ پاپا کی آواز میں
دکھ صاف محسوس ہو رہا تھا۔

شاہ میر کے گھروں لے آئے وہ خوندنا آیا اس
کے ماں باپ نے کہا۔

”ہم اپنے بیٹے کے آگے مجبور ہیں۔“

”تو پھر آپ نے ہم سے اور ہماری بیٹی سے
کس دشمنی کا بدله لیا ہے؟“ پاپا کے غصے سے
بھرے اس سوال کا جواب اُن کے پاس نہیں تھا۔
وہ خاموشی سے چلے گئے اور اس کے بعد میرے
طلاق کے کاغذات آگئے اس طرح یہ دو ماہ کی
محقر شادی اپنے انعام کو پہنچی۔

”مصطفیٰ! مصباح! میں نے علیحدگی سے پہلے بہت
کوشش کی کہ اس کو اپنی فطرت اور عادت سے
بدل لوں اس کے دل میں کسی اور کی محبت کا جلتا
دیا بجھا کر اپنے خلوص اور محبت کی شمع روشن کروں
میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے باپ، میرے گھر
والوں کو یہ بات پتہ چلے اور وہ دکھ اور تکلیف میں
بیٹلا ہوں، میں ان کو اپنے سامنے اس فیملے پر
شرمندہ ہوتے نہیں دیکھتا چاہتی تھی اس لیے
سر جھائے ہوئے دل اور بجھے ہوئے چہرے کو
روشن رکھنے کی بھرپور کوشش کی میں نے ہر ممکن شاہ
میر کا ساتھ بھانا چاہا مگر وہ شس سے سس نہ ہوا، میں
نے اس کو بہت سمجھایا کہ جو ہونا تھا ہو گیا، اب میں
اللہ کی طرف سے آپ کے مقدار میں ہوں، آپ
سب بھول کر میرے ساتھ اپنی زندگی ہستے
مکراتے ہوئے گزاریں، مگر اس کی زبان پر تو
بس کشف کا لکھہ ہوتا تھا، میں اپنے اللہ سے شکوہ
کرتی کرتے تو نے میرا نصیب میرا مقدر کیسا لکھ دیا،
مگر پھر تو بہ کرتی کہ نہیں وہ ہمارا رب ہے ہمیں ستر
ماوں سے زیادہ پیار کرتا ہے، وہ ہماری شہرگ
سے زیادہ قریب ہے وہ ہمیں کیسے مشکلات میں
ڈال سکتا ہے، اُس کی طرف سے یہ میری آزمائش

میرا رب بڑا کرم والا ہے۔“ ماہین کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہوئی تھی اور میں اپنی چان سے عزیز دوست کی تمام کہانی سن کر خوش بھی تھی اور رنجیدہ بھی۔

اس ملاقات کے کچھ عرصے بعد میرا رشت آگیا اور میری شادی ہو گئی میں اپنے سرال آگئی تھی اور اب دوسال بعد میری اور ماہین کی ملاقات ہوئی تھی میں نے ساتھا کہ اُس کی دوسری شادی ہو گئی ہے اور آج اُس کو اس طرح خوش خرم دیکھا تو دل سے ہزاروں دعا میں لکھیں۔ ماہین کی دوسری شادی کا احوال مجھے اُس سے اگلی ملاقات میں معلوم ہوا تھا۔ وہ آپ ماہین کی زبانی ہی نہیں۔

”مصباح! زندگی اپنی مخصوص ڈگر پروائی تھی۔ میں نے صبر اور شکر کے ساتھ جینا سیکھ لیا تھا۔ بھی جب میں اپنا ماضی شادی وغیرہ کو داد کر کے اچاک اداس ہو جاتی تو پاپا کہتے تھے۔

”بیٹا! پھسا بولا کرو زندگی اسی کا نام ہے، دکھ تکلیف، خوشی اور غم ساتھ ساتھ چلتے ہیں، ہو سکتا ہے اللہ پاک نے آنے والے وقت میں تمہارے نصیب میں بہت سی خوشیاں لکھی ہوں، بیٹا! ہر اندر ہیری رات کے بعد روشن صح ضرور ہوتی ہے اور پھر اسی دوران کی کے تو سط سے میرے لیے فائز کا رشتہ آیا۔ فائز اچھے پڑھے لکھے اور جاذب نظر تھے۔ اُن کا اشیٹ پر اپنی کا اپنا بڑن تھا۔ جو کہ وہ بہت اچھے طریقے سے چلا رہے تھے بہنوں کی شادی ہو چکی تھی اور بھائی بھی شادی شدہ تھے، اچھا بڑھا لکھا مہذب خاندان تھا، پاپا ای بھائی سب نے سرجو لے، فائز کے رشتے کے حوالے سے تمام باتیں اچھی تھیں مگر ساتھ میں ایک بات یہ بھی تھی کہ اُن کی بھی بھی شادی ناکام

میرے آنسو خشک ہو چکے تھے میں خاموش بیٹھی تھی۔ مجھے اپنی قسم سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ مصباح یا ربس میں تو اپنے رب کی شکر گزار ہوں کہ وہ مجھے جس حال میں رکھے طلاق کے بعد جو نام میں نے گرا را ہے وہ بہت مشکل اور کھنڈن تھا۔ اُس وقت صرف مال باپ نے ہی میرا ساتھ دیا اور کسی نے نہیں لوگوں کی طرف سے بہت باتیں بنائی گئیں، کیونکہ یہ معاشرہ جس میں ہم رہ رہے ہیں، قصور و اصرف عورت کو ہی تھہراتا ہے۔ میں بہت ڈسٹرپ ہو چکی تھی، لیکن میرے پاپا نے مجھے بہت بہت دی اور بہت سمجھایا، دوبارہ زمانے کے ساتھ چلانا سمجھایا، انہوں نے کہا۔

”بیٹا! دوبارہ ایڈمیشن لو اپنی تعلیم کو آگے جاری رکھو۔“ پھر باما کے ہمت دلانے پر میں نے داخلہ لیا، اپنا گرینجوئن مکمل کیا، پیچر زرینگ کیس اُس کے ساتھ ساتھ میڈیکل فیلڈ کا تین سالہ ڈپلومہ کیا، پاپا کے حوصلہ دینے اور کہنے پر سب کی مخالفت کے باوجود جاب اسٹارٹ کی۔ پاپا نے مجھے ہر قدم پر حوصلہ اور ہمت کے ساتھ آگے بڑھایا، پاپا جو کہتے گئے میں کرفی گئی بڑے بھائی وکیل، دوسرے ایجیسٹر، تیرسے بھائی کو پاپا ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے، کگر ان کی فیلڈ دوسری ہو گئی تو ہیری طرف توجہ ہوئی کہ میں ڈاکٹری والے شعبے میں کچھ بہوں۔ پاپا کا یہ خواب کسی حد تک اس وقت پورا ہوا جب میں ڈپلومہ کر کے ڈاکٹر کے ساتھ کام کرنے لگی۔ مریضوں کو دیکھنا وہ سوچنا تھا، تین سال تک یہ کام کیا، میں ہر وقت اپنے رب کا شکر ادا کرتی تھی، اطاعت گزار بندی، بن گر رہنا چاہتی تھی، میرا رب میرے ساتھ ہر معاملے میں اچھا کرتا ہے، جو میرے حق میں بہتر ہو گا وہ کرے گا۔

ہو چکی تھی، مگر اس بات کو نوٹس میں لائے بغیر پاپا امی نے اللہ پر بھروسہ کر کے اپنی رضا مندی ظاہر کر دی۔ کہ ہماری بیٹی کے نصیب میں جو ہو گا وہ ملے گا اور پھر میں دوبارہ ولہن بن کر اپنے پاپا کے ہاتھوں رخصت ہوتی، اب کی بار میرا سر اسال فائز کا گھر تھا اور ایک نئی زندگی کے لیے میرے ساتھ پرے ماں باپ کی دعائیں اور ہزاروں صحیحیں چھیس۔

فائز ایک سنبھیدہ اور کم بولنے والے انسان یہ مگر بہت خیال رکھتے والے اور محبت کرنے والے ہیں۔ انہوں نے بھی مجھ سے میری پچھلی زندگی پر بات نہیں کی، بلکہ اتنا کہا۔

”ماہین ہم دونوں اپنا اپنا ماضی بھول کر اپنے حال پر توجہ دیتے ہوئے اپنے مستقبل کو اچھا اور خوبگوار بنا میں گئے، بلکہ تم مجھے بھی شکایت کا موقع نہ دینا، میں بھی تمہارا ہر طرح سے خیال رکھوں گا، مجھے اپنے ماں باپ سے بہت محبت ہے، اُن کی ذات پر گوئی سمجھو ہوئیں ہوگا، اُن کا خیال رکھنا اور اُن کو شکایت کا موقع نہ دینا۔“

میں نے فائز کی سچی باتیں اپنے دماغ میں بھالیں، اور میں یہ مذکون کوشش کرتی ہوں کہ فائز کو یا اُن کے امی ابو کو بھی بھی شکایت کا موقع نہ دوں، میں اپنی عادت کے مطابق ہر کسی کا خیال رکھتی ہوں اور اپنے فرائض اور ذمہ داریاں خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کرنے کی کوشش کرتی ہوں، بھی وجہ ہے کہ ساس سر، میری نندیں دیور سب میرے گرد پیدہ ہیں اور میری تعریفیں کرتے ہیں میرے سے فائز تو بہت زیادہ خوش ہیں اگر بھی کسی بات پر اُن کو غصہ آ بھی جاتا ہے تو میں تھل اور پیار کے ساتھ اُن کو سچھا کر اُن کے غصے کو ختم کر دیتی ہوں، ہم اکثر ہمیں خون منے پلے جاتے

صبح! تم یقین کر دو و سروں کے لیے اپنے دل میں محبت اور احترام رکھتے کی وجہ سے مجھے فائز کے ابوکی شکل میں پاپا نظر آتے ہیں، فائز کی ایسی مجھے بالکل اپنی بیٹی کی بھگر ہر بات سمجھاتی اور بتاتی ہیں، جو زخم میرے دل پر لگے ہیں وہ فائز کی محبت سے آہست آہست پھرتے چارے ہیں، فائز کی باتیں اور احساس کو دیکھتے ہوئے لگتا ہے کہ شاید اللہ پاک کو میرا کوئی عمل پسند آیا ہے جو مجھے اس طرح دوبارہ سے خوشیاں عطا کر دیں۔ تعلیم یافتہ ہونے سے لازم نہیں کہ کردار اور سوچ بھی بلند اور اچھی ہو یا کم تعلیم ہونے سے ضروری نہیں کہ کردار اور سوچ بھی سطحی ہوئی سب تربیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔

لب کے اللہ پاک مجھے ہر آزمائش میں پورا ارتلنے کی بہت اور طاقت عطا کرے آمیں۔

قارئین! میں نے ماہین کی کہانی سن کر اُس کے لیے دل سے دعا کی تھی کہ اب اُس کی زندگی میں کوئی دکھ تکلیف اور غم نہ آئے اللہ یا ک وہ بہیشہ ایسے ہی خوش رہے آمیں۔ آپ لوگ بھی میری دوست کے لیے دعا کریں، گریں گے تاں!.....

☆☆.....☆☆

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

سفیر داع اقبال علاج مرکز ہے

پہلوی

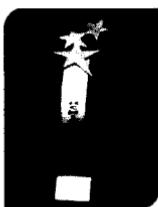
STEROIDS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

لہر کے دورہ پاکستان کا مستقل پروگرام

ملٹی
ایوارڈ
ھولڈر



ASIAN EXCELLENCE
PERFORMANCE AWARD



AWARD
BEST ACHIEVEMENT

اسلام آباد

9۔ اپریل تا 30 سی سی
میں
G-8/1 کلکٹر
سری چک (تلی پور) اسلام آباد
فون: (051) 2254595-2255880
موباک: 0300-8566188

9۔ اگست تا 30 سی سی
جہر
9۔ دسمبر تا 30 جنوری



AWARD
PILLAR OF LEUCODERMA

لاہور

14۔ فروری تا 27 فروری گلشن سینئر
14۔ جون تا 27 جون آفس چک 16۔ فروری چک
14۔ جون تا 27 جون چک چک نوں زد منم بارکت لاہور
14۔ اکتوبر تا 27 اکتوبر موباک: 0300-8566188

پشاور

11۔ فروری تا 27 فروری گلشن سینئر
11۔ جون تا 27 جون چک چک نوں زد منم بارکت پشاور
11۔ اکتوبر تا 27 اکتوبر موباک: 0300-8566188

ملتان

28۔ مارچ تا 16 اپریل گلشن سینئر
28۔ جولائی تا 16 اگست چک ریٹلے سے دو نوڑو چک عزیز ہل مان
(061) 4518061-62
28۔ نومبر تا 27 دسمبر موباک: 0300-8566188

کراچی

13۔ مارچ تا 27 مارچ آفس 7، 706، ٹریڈ شاپ ایڈبل
13۔ جولائی تا 27 جولائی چک چک نوں زد منم بارکت کراچی
021-34328080
13۔ نومبر تا 27 نومبر موباک: 0300-8566188

چاروں گرہن

ساجد علی ساجدی گلر

محبت اور کیا چاہتی ہے
لما تو دی متاع زندگی نک

فاطمہ عبدالحق

یہ 1974ء کی بات ہے جب میں چار سال کے چھپے تھے۔ ایک تو وہ بہت ہی حسین تھی،
کی تھی اور ہمارے گاؤں میں رضیہ سردار کے حسن دوسرا ایک سردار کی تینی بھی تھی۔ اور سردار بھی وہ



جو اپنی نیک سیرت اور نیک دل کی بنا پر آس یا س
کے گاؤں والوں میں بھی معینہ اور مشہور تھا۔ لیکن
ان تمام تر خوبیوں کے باوجود رضیہ کا شرط طبیعتی
ہو رہا تھا کیونکہ رضیہ کی زبان تو قلبی تھی۔ لفظ اُس
سے ملٹل طور پر ادا نہ ہوتے تھے وہ انک اک کر
غفتگو کمل کر کی تھی۔

سردار نی کو بیشہ رضیہ کی فکر گھیرے رہتی وہ
اندر ہی اندر بے تحاشا پریشان ہوتی، جبکہ
سردار جی حقہ گزگزاتے ہوئے سردار نی بھی کو تسلی
دیا کرتے تھے۔

”محلیے لوکے“ اللہ پر بھروسہ رکھ جوڑے تو
آسمانوں پر نہتے ہیں۔ اللہ نے ہماری رضیہ کا بھی
کہیں نہ بھیں کسی سے جوڑ بنایا ہو گا جب اُس کو
منظور ہوا، اُس کی شادی بھی ہو جائے گی۔“
”سردار جی! پورے اخبارہ سال کی ہو گئی ہے
ہماری بیٹی اس کی دنوں سہیلیاں بھی بیاہ کر اپنے
گھروں میں چل گئی ہیں۔“

گاؤں کی بیالیاں بھی جو اس کی ہم عمر ہیں ان
کی بھی شادی ہو گئی ہے، ایک ہماری رضیہ ہی ابھی
تک کتواری بیٹھی ہوئی ہے۔“

”شو صبر کریا کر، اللہ سب کی سنتا ہے وہ ہماری
مراد بھی سن لے گا، بس اُس کے درسے بھی نامید
مت ہوئے اور نہ ہی اس سے بھی مانگنا چھوڑ دیو۔“
”سردار جی کی باتیں سردار نی کے دل کو لیتیں
اور وہ ایک بار پھر زور و شور سے اللہ سے دعائیں
کرنے لگ جاتیں۔“

”یا اللہ! ٹو تو سب چانتا ہے، میرے دل کا
حال تجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے؟ میں تجھ سے
اپنی بیگنی کے لیے نیک سیرت خاندان کا سوال
کرتی ہوں۔ ٹو تو بن ماٹے بھی عطا کرتا ہے لیکن
اس کے باوجود میں تجھ سے سوال کرنا پسند کرنی

بیٹی کے لیے دعا کرتے ہوئے سردار نی کی
آنکھوں سے آنسو روں ہو جاتے تھے۔
اور پھر ایک روز سردار نی کی دعا قبول ہو گی
اور جمال الدین کا رشتہ رضیہ کے لیے آ گیا۔
رضیہ کی بات بھی ہونے پر سردار نی نے پورے
گاؤں کی دعوت کی، دو بکرے منکوا کر صدقے کے
لیے دیے اور رب کے حضور شکرانے کے نوافل ادا
کرتے ہوئے رود دیں۔

”اب رونے کا نہیں خوش ہونے کا موقع
ہے۔“ سردار جی ہستے ہوئے یوں لے تھے۔

”سردار جی یہ تو خوشی کے آنسو ہیں،“
سردار نی بھی مسکرا دیں چھیس۔
”دیکھ لے اللہ لوک میں نے تجھے کہا تھا ناکہ
اوپر والے سے بس ماٹا کر پہ باتیں اور شکوئے
شکایات ہم انسانوں کو زیب نہیں دیتے، ان کا
حاصل وصول کچھ نہیں ہے۔“

البتہ اُس کے در سے مانگی جانے والی
دعائیں ضرور نگ لاتی ہیں، اور بات تو یقین کی
ہوتی ہے، آپ جس قدر پچے دل سے دعا مانگتے
ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو اتنی ہی جلدی اور اسی قدر
زیادہ نوازا تھے۔“

اٹھاتے یہ بات بھول جاتا ہے کہ باقی کی چار اگلیاں اُسی کی طرف اٹھتی ہیں، لیکن اگر کوئی یہ بات سوچے گا تو وہ کسی کی طرف اٹھی ہی کیونکر اٹھائے گا؟

”آپ ہمیشہ سچی اور کھری بات کرتے ہیں، سردار جی.....“ سردار نی مسکراتے ہوئے بولی تھیں۔

☆.....☆

مگر ایک بات تو کھری ہے کہ ایسے حالات میں جب لوگ آپ کی جانب انگلی اٹھاتے ہیں تب آپ کو ان کی انگلی پر ضرور سکھا جاتی ہے کہ کون آپ سے خلص ہے اور کس کی چاہت صرف دنیا دکھاوے کی ہے؟

رضیہ پر اٹھتی اگلیاں جمال الدین کو اپنی ہٹک کا احساس دلانے لگتیں، اُسے یوں محسوس ہونے لگا کہ لوگ اُس کی بجی کرتے ہیں، لیکن اگر جمال الدین صرف ایک بات سوچ لیتا کہ اللہ تعالیٰ کے کاموں میں بندوں کی دل اندازیاں نہیں چلتیں، تو وہ بھی بھی انتہائی قدم نہ اٹھاتا۔

بھی بھی رضیہ سردار کو طلاق نامہ نہ تھا تاگر جمال الدین کی محبت بھی چڑھتے ہوئے سورج کی طرح تھی، جو نبی سوانیزے پر آیا جسم جلنے لگا تھا اور یوں پورے دو سال بعد رضیہ سردار اجڑ کر سردار جی کی دلیلیز پروابیں آگئی۔ گاؤں میں جس کسی نے رضیہ سردار کی طلاق کے بارے میں سناؤ نے جمال الدین کے وہ لئے لیے کہ کیا لکھوں دیسے گاؤں والوں میں سے کوئی بھی تو رضیہ سردار کو اپانے والانہیں تھا۔ مگر جمال الدین پر پھٹکار برسانے کے لیے بھی اپنا حق بحقتھے ہوئے آن پہنچ تھے۔

سردار نی سے رضیہ کا غم برداشت نہ ہو پایا اور وہ اسی رات خالق حقیقی سے جاملیں سردار جی نے دونوں صدے بیٹھی کی طلاق اور یوں کی موت بہت بہت سے ہے تھے غم کا پھر اڑ چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو صبر کرنے والوں کے صبر کے ساتھے

بالآخر سردار اور سردار نی کی زندگی میں وہ دن آئی ہی، جب رضیہ لہن بنی، لہن بن کر رضیہ کا حسن مزید دو آتھو ہو گیا تھا۔

ناک کے بعد جب رضیہ کو جمال الدین کے پہلو میں بٹھا یا گیا تو جمال الدین تو پہلی نظر کا اسیر ہو گیا، اُس پر بھی رضیہ کے حسن کا جادو سرچڑھ کر بولا تھا اور یوں رضیہ سردار بھی خوشی بیاہ کر جمال الدین کے گھر آگئی تھی۔

سردار اور سردار نی ہر وقت اللہ کا شکر ادا کرتے تھے کہ اُن کی بیٹی اپنے گھر بہت خوشی ہے اور جمال الدین محبت اور خلوص سے گندھا حصے ہے جو ان کی بیٹی کا ہر مکان طور پر خیال رکھتا ہے۔ لیکن اگر دنیا میں زندگیاں صرف محبت کے سہارے گزاری جاسکتیں تو دنیا میں باقی چیزوں کی انسان کو کبھی ضرورت ہی نہ پڑتی۔

شاوی کے ابتدائی دنوں میں تو جمال الدین کے سر پر رضیہ کے حسن کی بیٹی بندھی ہوئی تھی، لیکن آہستہ آہستہ یہ بیٹی اترنے لگی اور رضیہ کے حسن پر اُس کی زبان کا تو طلاق پن غالباً آنے لگا، جمال الدین اور رضیہ جمال کہیں بھی جاتے لوگ رضیہ کی باتوں پر ہنسنے لگتے اور کچھ لوگ تو باقاعدہ اخبار فسوں گزرنے لگتے۔

”ہائے اللہ نے کتنا حسن دیا مگر تو تمی زبان اس سارے حسن کو گہنادیتی ہے۔“

یوں تو لوگوں کا کام یا تین بناتا ہی ہوتا ہے وہ تو ہر حال میں کوئی نہ کوئی شخص ڈھونڈتے ہی لیتے ہیں، اس دنیا میں ہر کوئی دوسرے کی جانب انگلی

ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔

روح کا سکون ہے، کیا تم نے قرآن میں نہیں پڑھا
تھا کہ اللہ کسی بھی جان پر اس کی برداشت سے
زیادہ بوجھ تکلیف نہیں ڈالتا؟ گھر آئے رشتے
سے انکار کرنا بھی اللہ کا شکری ہے ناشکری مت
کر پڑا اللہ سوہناب سب چنگیاں کرے گا۔ اس پر
بھروسہ رکھ۔“

اور یوں رضیہ مان گئی اور ایک بار پھر دہن
بندی گئی لیکن اس بار رضیہ کا حسن سو گوار تھا، سردار
جی کو سرداری کی کی اس موقع پر بے تحاشہ محسوس
ہوئی، لیکن انہوں نے یہ بات رضیہ پر ظاہر نہیں
ہونے دی اور یوں رضیہ سردار، رضیہ روافد بن کر
روافد حسن کے گھر آگئی تھی۔

رضیہ کی زندگی اب بہت اچھی گزرنے لگی تھی،
کیونکہ روافد حسن بہت اچھے انسان تھے اور ان
کے گھر والے بھی اچھے لوگ تھے سردار جی رضیہ کو
شاد اور آباد دیکھ کر یہ انتہا خوش ہوتے تھے وہ
بھی بھاری آسمان کی جانب نگاہ اٹھاتے اور
کہتے۔

”دیکھ لے سرداری، اللہ نے ہماری رضیہ کو
کتنا اچھا جوڑ عطا کیا،“ تیرا دل بھی کتنا جھوٹا تھا عم
برداشت ہی نہ کر پایا، تھی جلدی تھی ناچھے اللہ
سوئے کے پاس جانے کی کاش تو دیکھ لئی تھی کہ
تیری رضیہ اپنے گھر میں لئی خوش ہے۔

رضیہ کی زندگی یونہی پہنچتے مکراتے گزر رہی
تھی جب روافد حسن کے گھر والوں کو رضیہ کی سونی
گود لکھنے لگی، وہ بجائے اللہ سے مانگنے کے رضیہ کو
مور دیا اور مخہر انے لے گئے اور پھر دن بدن گھر کا
ماحوں خراب ہونے لگا تھا۔

روافد حسن نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنے گھر
والوں کو سمجھا سکیں کہ اس معاملے میں رضیہ کی کیا
غلطی یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا تھا۔

رضیہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلا ب
روائ تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کے اندر کا لادا
پھٹ کر باہر آتا، سردار جی نے رضیہ کو اپنے گلے
سے لگا کر کھا تھا۔

”رضیہ پڑا! چہاں تیری ماں گئی ہے وہ تو ہم
سب کا بدبی ٹھکانا ہے پھر رونے اور واپسی کرنے
سے کیا ہوگا، کچھ بھی تو نہیں ہوگا اور تو جانی ہے
نا کہ اللہ وادیا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اللہ
صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، پھر صبر کر۔“
سردار جی رضیہ کا سر خپچھاتے ہوئے گھر سے باہر
نکل کر مردوں کے پاس آ کر بیٹھ گئے تھے۔

دکھ کے دن جتنے بھی بھاری کیوں نہ ہوں،
صبر کرنے سے کثی وجاتے ہیں، رضیہ سردار نے
بھی صبر کا دامن تھام لیا تھا کیونکہ وہ بھی صابر سردار
کی ایک صابر بیٹی تھی۔

زندگی اب پھر سے پرانے ڈھب پر گزر رہی
تھی، کی تھی تو صرف سرداری کی باقی سب بالکل
پہلے جیسا ہی تھا۔

لیکن زندگی بیشہ ایک ہی ڈھب پر نہیں
گزرتی، اس میں تبدیلی بہت ضروری ہے، جبکہ تو
اس کائنات کے اتنے رنگ ہیں، فضا میں بھی
رنگ بدلتی ہیں اور یونہی ایک دن رضیہ کی زندگی
میں ایک بار پھر بدلا دیا جاتا ہے۔

رضیہ کے لیے ایک اور رشتہ آیا تھا، مگر رضیہ
رشتے سے انکاری تھی، اُس کے لیے پہلا جھر ہی
بہت تھا، وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس جھر بے کو پھر
دھرا یا جائے۔ لیکن سردار جی ایسے انسان تھے جو
رضیہ کو قائل کر سکتے تھے، کیونکہ وہ اس ہنر سے
بخوبی واقف تھے۔

”دیکھ رضیہ پڑا! اللہ کی رضا میں راضی رہنا ہی

رضیہ نے خوشی خوشی روٹ حسن کی دوسری شادی میں شرکت کی، لوگ سدار کی بیٹی کا صبر دیکھ دیکھ کر انگشت بدال تھے کہ کیا کوئی ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ جیسی رضیہ سدار تھی۔

روٹ حسن کی زندگی میں رضیہ کی اہمیت دوسری شادی کے بعد بھی وہی تھی جو پہلے ہی مگر یہ سب اب روٹ حسن کی دوسری بیوی اور گھر والوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا، اس لیے سب موقع کی تلاش میں تھے کہ کب کوئی ایسا وار کیا جائے کہ روٹ حسن رضیہ کو طلاق نامہ تھا کر چکتا کریں اور بالآخر دوسال بعد جب روٹ حسن کی دوسری بیگم کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی تو سب کو موقع مل گیا۔

روٹ حسن کی دوسری بیگم نے شوہر کے سامنے پر شرط رکھ دی تھی۔

”اگر بیٹی کا منہ دیکھنا ہے تو رضیہ کو طلاق نامہ تھما جائے۔“

روٹ حسن بہت ہی زیادہ عکمش کا شکار تھے۔

” یہ میری یہی آزمائش ہے؟ ایک طرف میری معموم بیٹی اور دوسری طرف، مخصوص بیوی رضیہ میں کس پر ٹکلیم کروں گا؟ رضیہ نے تو کبھی کسی کو تکلیف نہیں دی تھی، بھی کسی کا برائیں چاہا تھا پھر ان لوگوں کو رضیہ کا وجود کیوں ملھتا ہے؟ آخرا یا کیوں؟

اپنی شدید پریشانی میں روٹ حسن ہمیشہ رضیہ کے پاس ہی آتے تھے اور رضیہ بھی اپنے شریک حیات کا چہرہ دیکھتے ہی پہچان جاتی تھی کہ وہ پریشان ہیں۔

اُس روز بھی روٹ حسن آئے اور رضیہ کی گود میں سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

روٹ حسن صاحب کیا ماجرا ہے؟ اتنا

لیکن روٹ حسن کے گھر والوں نے اُن کی ایک نہ سنی، اُن کی ایک ہی رٹ تھی رضیہ کو طلاق نامہ تھا اور نئی شادی کی تیاری پکڑو روٹ حسن از حد پریشان تھے وہ رضیہ کو بالکل بھی اپنے سے الگ چڑھتے جا رہے تھے، مگر گھر والے دن بدن چڑھتے جا رہے تھے۔

رضیہ نے جب فضاوں کا رخ بدلتے دیکھا تو روٹ حسن کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

” مجھے طلاق مت دیجیے گا، لیکن آپ دوسری شادی کر بیٹھی مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ روٹ حسن بالکل بھی دوسری شادی نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن گھر کا ماحول اسی حد تک خراب ہو گیا تھا کہ جس کی کوئی حد نہیں تھی، ہر وقت ایک ہی رٹ تھی، اس حق حق سے عج آکر روٹ حسن بھی دوسری شادی کے لیے اس شرط پر راضی ہوئے کہ وہ رضیہ کو خود سے ہرگز جدا نہیں کریں گے اور یوں روٹ حسن کے گھر والوں نے اجازت پاتے ہی لڑکیاں دیکھنا شروع کر دی چکیں۔

رضیہ نے مزید صبر کا دامن تھام لیا تھا اور مزید اللہ کی عبادتوں میں مصروف ہو گئی ہی اب رضیہ نے اللہ سے مکمل طور پر لوگا لی تھی وہ یہ جان گئی تھی کہ یہ دنیا ایک سراب کے سوا کچھ نہیں، کچھ ہی سدا باقی نہیں رہتا، نہ بھتیں نہ انسان اور نہ ہی کوئی مال و دولت یہ سب فانی ہے اور اس لیے ہمیشہ کچھ نہ کچھ کھونے کے لیے تیار رہنا چاہیے اور کھوجانے پر داویلائیں صبر کرنا چاہیے۔

روٹ حسن کے گھر والوں کی شد و مدد سے کی جانے والی کوششیں بالآخر رنگ لائیں، انہیں مطلوبہ لڑکی مل ہی گئی اور روٹ حسن کی دوسری شادی ملے کر دی گئی۔

پریشان تو میں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا؟"

اس سوال کے جواب میں بس ایک خاموشی تھی اور رواف حسن کی خاموشی رضیہ کا دل دہلاتی تھی، رواف حسن نے کچھ درج مرید خاموش رہنے کے بعد رضیہ کو سارا اجر اتنا دیا تھا۔ رضیہ نے صبر و تحمل پر پوری بات سنی تھی اور پھر اطمینان سے بولتی تھی۔

"آپ مجھے چھوڑ دیں۔"

رواف حسن نے ترپ کر رضیہ کی طرف دیکھا تھا۔

"میں نے تو کبھی ایسا سوچا بھی نہیں ہے۔"

"لیکن اب آپ کو سوچنا ہے اور وہ بھی صرف اپنی بیٹی کے لیے ہے ایک باپ کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔"

یہ کہتے ہوئے رضیہ نے اپنے سارے آنسو حلق میں اتار لیے تھے۔

"لیکن رضیہ....."

"آپ کو اللہ کا واسطہ ہے رواف حسن، آپ میرے فضلے کا احترام کریں گے، میں میں اپنا سامان لے کر چلی جاؤں کی، آپ طلاق نامہ بھجوادیجیے گا۔"

"کاش یہ لوگ تمہارا دل دیکھ سکتے رضیہ، جس میں اتنا سہر ہے تو کبھی بھی تم سے جدائی کی بات نہ کرتے۔" رواف حسن کی آنکھوں سے آنسو بہہ لکھنے پڑنے لگے۔ کون کہتا ہے کہ مرد روشن نہیں، رواف حسن پچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رور ہے تھے اور رضیہ صبر کا پھاڑائی رواف حسن کو حوصلہ دے رہی تھی۔

یونہی روتنے ہوئے اور حوصلہ دیتے ہوئے کب رات نیتی، اور کب فجر کی اذان فضاء میں بلند ہوئی انہیں احساس ہی نہ ہوا کہ رواف حسن

انٹھ کر دھوکرنے چل دیے۔ رضیہ نے بھی دھوکیا اور یوں دونوں میاں یوں جائے نماز پھاٹے نماز ادا کرنے لگے۔

رضیہ کا آخری سجدہ کچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا تھا، جب کافی دیر تک رضیہ سجدے سے نہ اٹھی تو رواف حسن کو انجانہ سا احساس ہوا، انہوں نے رضیہ کو سجدے سے اٹھانا چاہا مگر رضیہ کی روح تو پرواز کر چکی تھی۔

اُسے رواف حسن سے جدائی برداشت نہ تھی، تبھی خالی تھقی سے جائی تھی۔

رواف حسن رضیہ کی جدائی پر دھاڑیں مار مار کر روئے تھے، رضیہ اپنے صبر کا ہی نہیں بات کی محبت کا بھی بھرم رکھنا چاہتی تھی، وہ سردار بھی کو دکھ نہیں دینا چاہتی تھی، تبھی تو سب کو اکیلا چھوڑ کر ابدی سفر پر روانہ ہو گئی۔

جب وہ کفن میں لٹپٹی پڑی تھی تو اُس کے چہرے پر اس قدر نور اور سکون تھا کہ میں نے اپنی زندگی میں آج تک ایسا چھرہ نہیں دیکھا تھا اور میں اس چہرے کو آج برسوں گزر جانے کے بعد بھی بھول نہیں پائی ہوں، اور نہ ہی رواف حسن بھی رضیہ کو بھول پائے، اس وقت ان کی دو بیٹیاں اور تین بیٹی ہیں وہ ہر جمعہ اپنے تینوں بیٹوں کے ہمراہ رضیہ کی قبر پر جاتے ہیں، فاتحہ پڑھتے ہیں، اور گھر واپس لوٹ آتے ہیں۔

برسون سے ان کا بھی معمول ہے، یہ کہتے ہوئے میری چھوٹی خالہ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے کیونکہ وہ بھی رضیہ سردار سے بے تحاشا محبت کرتی تھیں اور یوں میری یہ کہانی بھی اختتام کو پہنچی۔ جو کہ ایک ایسے چاند کی کہانی تھی جسے گرہن لگا ہوا تھا۔

☆☆.....☆☆

گلابی سے پانچوں جیتی جاتی کہانی

العزیزی

فرحت عباس شاہی فکر

یاد آتا ہے مقدر جب بھی
کپکپائی ہے دعا ہاتھوں میں

ڈاکٹر الماس روی

اُس نے خدا کا رنگ اختیار کیا تھا بھی رنگ نہیں تھا۔ دل مطمئن تھا اسے دیکھ کر لوگ بے سب سے اچھا ہوتا ہے۔ اب اُسے کوئی گلے ٹکوہ اطمینان تھے۔ اور اس کی فکر میں سُکُل رہے تھے۔



سے بھی نواز اتھا۔ گفتگو کا طریقہ مجھے آتا تھا۔ اس لیے میرا کاروبار ترقی پر تھا چند سالوں میں میری دو چار بڑے بازاروں میں کمی دکانیں بن چکی تھیں۔ جہاں میں نے اپنے ملازم رکھ کر تھے۔

میں ملازم رکھتے ہوئے شکل و صورت کے ساتھ تعلیم اور انداز بیان بھی دیکھا کرتا تھا۔ تاکہ وہ جب کپڑے افروخت کریں تو گاہک کو عزت و احترام سے مخاطب کریں۔ میری دکانوں سے کوئی گاہک خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا۔ دیہہ زیب رنگ، ڈیزائن اور کپڑے کا معیار انہیں میری دکانوں کا رخ دکھاتا تھا۔ صبح جب میں کاروبار کے لیے نکلا تو میری ماں مجھ پر سورتوں اور آجتوں کا حصار کرتی اور دعا میں دیتی تھیں جسک ماں کی دعاؤں کا نتیجہ تھا جو اللہ نے مجھے اتنا عطا کیا تھا۔

ایک روز میں ڈینش کے بوئیک پر تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا کم لوگ بازار میں تھے۔ ڈینش کی گلیاں رات کو جا کر تھیں ہیں وہ سیاہ بر قتعے میں تھی جس کے لمحے میں میٹھاں تھیں۔

”بنیے پلیز ذرا یہ پرنٹ دکھا دیجیے۔“ میں نے اس کا اشارہ دیکھتے ہوئے تھا نکال دیا۔

”جی یہ.....“

”بہت خوبصورت ہے یہ پرنٹ چھوٹا ڈیزائن ہے اور کھلا کھلا رنگ ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں بڑی اور ابھری ہوئی تھیں اور اس میں خاص چک تھی۔ اس نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”پلیز اس میں سے ایک سوت کاٹ دیجیے۔“

میں اس رات نہ سویا۔ مجھے جانے کیوں وہ اتنی اچھی لگی ڈینش کے علاقے میں خاتمیں جس طیہ میں بازاروں میں نظر آتی ہیں وہ بیان سے باہر

لیکن وہ تھا جو بے نیاز تھا۔ اللہ کا نور اس کی محبت دل میں اترتی جا رہی تھی۔ اسے نہیں خبر تھی کہ سامنے کے لاک اپ میں جو قیدی ہے وہ اس سے کیونکر اور کس قدر خانک ہے اور وہ اسے کیا کیا سزا دینا چاہتا ہے۔ وہ تو لمبے پہنچپن میں یاد کی گئی سورتیں اور ملے درہ اتار ہتا تھا۔

قید خانے کے در و دیوار کو دیکھ کر اکثر سوچا کرتا تھا اس در و دیوار کا تو بڑا احسان ہے مجھ پر جس خدا کو میں بھول چکا تھا وہ مجھے یہاں یاد آیا جب میں بس ہو گیا۔ لکنا میری ماں میرے لیے چاہتی تھی کہ میں حافظ ہوں۔ قرآن حفظ کروں مگر میں گلی میں، گلی ڈنڈا کنج، پونگرام، چور پاہی کھیلتے ہوئے اکثر ماں کی پنکار کو آن سنائے کر دیتا تھا۔ ماں ہر رات اپنے گھetto پر سر کھکھلے کر میرا سر پر سہلاتے ہوئے کہتی۔

”میرا بیٹا قرآن حفظ کر لے دیکھ جو قرآن حفظ کرتا ہے اس کو بڑا اجر ملتا ہے۔ ساری زندگی تو آنٹوں سے تحفظ رہے گا“ دل میں دنیا گھر نہیں کرے گی، رب رہے گا۔“ میں ماں کی باتیں سن کر واقعی کوش کرتا۔ مگر پھر دل اچاٹ ہو جاتا اور کھلئے دوڑ جاتا۔

زندگی کے بیس برس گزر گئے، بچپن سے لڑکپن، لڑکپن سے جوانی کے اس سفر نے سارے کام کروائے لیکن میں نہ پڑھ سکا تو قرآن نہ پڑھ پایا چند پارے پڑھتے تھے۔ پھر بھی اچاٹ ہو گیا۔ میں نے پارچہ بانی کا کام شروع کیا تھا، میں فیصل آباد جاتا تھا اور کپڑوں کی لاث کی لاث لاتا تھا۔ میرے لائے ہوئے کپڑے خواتین کو بہت پسند آتے تھے میں نے مہنگے بازار میں کپڑوں کا یونیک کھولا میری دکان کی چک دک، ہی الگ تھی۔ دوسرے مجھے خدا نے اچھی شکل و صورت

ادا کرنے آتے تھے۔

اس نے میرا اور میری ماں کا بہت خیال رکھا تھا۔ وہ روز صحیح سویرے اٹھتی نماز فجر پڑھتی اور قرآن کی تلاوت کرتی۔ نہ جانے کیوں تھپن ہی سے قرآن کی تلاوت اگر زور سے کوئی بھی کرتا تو میرے سر میں درد ہونے لگتا تھا۔ میں اللہ کے کلام کی تعظیم کرتا تھا۔ میں نے اپنے ملازمین کو خاص کر بدایت کر رکھی تھی دکان کھلتے ہی صفائی سترہائی کے دوران شیپ پر تلاوت قرآن پاک لگادی جاتی تھی مگر میرے پہنچنے سے پہلے ملازموں کو یہ کام کرنا پڑتا تھا۔ عائزہ جب تلاوت کرتی تو میں سننا چاہتا تھا مگر شیطان مجھ پر غالب ہونے لگتا اور مجھے غصہ آنے لگتا۔ میں اکثر اس سے کہتا۔

”تموڑا اور منحصر پڑھا کرو۔“

زندگی ایک مرد اور عورت کی مکمل تب ہوتی ہے جب اولاد ہو جاتی ہے شادی کو دس سال گزر چکے تھے۔ مگر میں اور عائزہ اولاد سے محروم تھے۔ وہ اکثر مجھے دوسری شادی کا مشورہ دیتی تھی۔

”قائم زندگی بہت منحصر ہے بہت انتظار کر لیا۔ آپ دوسری شادی کر لیں میں بخوبی اجازت دے رہی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کسی کے ساتھ حق تلقی نہیں کریں گے۔“

مگر میں اس کی ان باتوں سے چڑھتا تھا۔

”کیا اُسے مجھ سے محبت نہیں ہے کُس قسم کی عورت ہے جو بُوراء کی بات کرتی ہے، عورتی تو زمیں آسان ایک کردیتی ہیں شوہر کی دوسری شادی بیکی بن کر ان پر گرتی ہے اور ایک یہ عورت ہے جس میری محبت نہیں تھی۔“

میری ماں مصلے پر بیٹھی مجھے مسکرا کر دیتی۔

”بیٹا وہ بے حس نہیں ہے کبھدار ہے اس کے دل میں رب رہتا ہے اس لیے بے نیاز ہے۔ تو

ہے۔ دولت اور بے تھا شہ دولت کا ہوتا گھر کی خواتین کو خواتین نہیں بجوبے بنادیتا ہے۔ عمر رسیدہ خواتین پارلوں کے چکر لگا لگا کر کھل ہی بگاڑ لیتی ہیں۔ اکثر بوسی خواتین کو دیکھ کر مجھے تو اپنی ماں کا سفید دوپٹے کے حلقة میں پہنچا ہے نور چہرہ یاد آ جاتا تھا اور میں ایسی خواتین پر افسوس کیے بغیر نہ رہتا تھا جو گھرے پال کھلے بازو ببرے بڑے گلے دوپٹوں سے بے نیاز چھپی جیز اور اونچی اونچی ہیل پہنچنے نہ جانے خود کیا سمجھ کر مردوں کے آگے چلتی تھیں۔ ایسے ماہول میں میں نے اس لڑکی کو غور سے دیکھا جو بہت سادہ تھی جس کی پسند بھی سادہ تھی۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا مگر رہستہ ہو تو تھی۔

میئنے دو مہینے بعد وہ ضرور نظر آئی تھی۔ سر دیاں آچکی تھیں موسم بدلتے ہی کپڑے بھی بدی جاتے ہیں۔ اس دفعاً نے کھٹکی کے دوسوٹ خریدے تھے۔ اس کے ڈرائیور نے گاڑی میری ماں کے قریب لاکھڑی کی تھی۔ میں نے دیکھا وہ بوتیک کے دوسرے پورشن میں بیٹھیں وغیرہ و دیکھ رہی ہے۔ میں باہر گیا اور ڈرائیور سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا تو پاتوں ہی پاتوں میں پتہ چلا وہ جو چھٹے پندرہ سال سے اس گھر کا ڈرائیور ہے۔ خیابانِ شمشیر میں رہا۔ اس لڑکی کا نام عائزہ ہے جو ایک مرد سے کی مطلہ ہے۔

مگر میں میری ماں کا اصرار شادی کے لیے بڑھ چکا تھا۔ جب میں نے اپنی ماں کو اس لڑکی کے بارے میں بتایا تو وہ بہت خوش ہو گیں۔ زندگی میں اللہ نے مجھے اچھی ماں کی طرح نیک اور خوبصورت یوں سے بھی نوازا۔ اس کے گھر کا ماحول بالکل الگ تھا۔ مگر خدا نے دین کی خاصی سمجھا سے دی تھی۔ وہ بہت پار سادگی۔ پاکیزہ اور مخصوص اُسے ایک بیوی کے سارے وظائف بخوبی

بہت خوش نصیب ہے جسے عائشہ جیسی مومن بیوی
ملی ہے اس کی قدر کر اور دعا کر کہ خدا مجھے اُسی
سے فرمانبردار، نیک اور صالح اولاد فرمائے
اُس کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔“
ماں کو دعا کے لیے ہاتھ اخھاتا دلکھ کر میں
پُر امید ہو جاتا خدا مجھے ضرور اولاد دے گا یہ آخر
میری ماں کی دعا ہے۔

اُس روز میں قیصل آباد میں تھا اور کٹرے
لے کر لوٹ رہا تھا۔ راستے میں مجھے ایک ٹیکسی کا
ایکیٹھنڈ دکھائی دیا میں نے گاڑی روکی وہ
صاحب جو سافر تھے پر بیان تھے مجھے کہنے لگے۔
میں انہیں لفت دے دوں تو مہربانی ہو گی ان کے
ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ میں نے ازراہہ ہمدردی
اٹھیں بنالیا۔ ادھر ادھر کی ہاتھیں کرتے ہوئے
انہوں نے بُس اسٹاپ پر پان لئنے کے لیے گاڑی
روکائی اور پھر ہجوم میں غائب ہو گئے۔

میں انتظار کرتا رہا تھا کہ گھر کی طرف رخ
کیا۔ میں بھول چکا تھا اس کا بریف کیس پیچھے
پڑے ہیں۔ اچانک پولیس موبائل نے میری
گاڑی روکائی اور مجھے تھانے لے گئے میں ہکا بکا
کھڑا تھا۔ اُس بریف کیس میں ہیر و ٹھی۔ میں
چیخ چیخ کر کھتہ رہا یہ بریف کیس میر انہیں ہے۔ لیکن
کسی نے میر ایک نہ سکی۔ مجھے تھامشاہارا، آگیا
و دھنکارا گیا اور لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔ نجوان
میں زندگی کہاں سے کہاں آگئی، تسلی یوں گلے
پڑتی ہے زندگی تباہ ہوتی دکھائی دے رعنی تھی
مارے صدے کے میں کمزور ہوتا چلا گیا اور
خاموش رہنے لگا مجھے اس دنیا میں اب کچھ نظر نہیں
آتا تھا سوائے دھوکے کے ایک قیدی کی زندگی
عبرت کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ یہاں ایک دوسرے
کونو پتے کمر و شمعے والے درندے رہتے ہیں۔

غزل

نظرت بجا رہی تھی محبت کی باسری
اور رقص کر رہی تھی اسی لیے یہ زندگی
کس نے خوش کر دیا پچھ و تباب کو
اور کس نے پائے زیست کی پاک بھی چھین لی
کا لکھ لی یہ کس نے رخ بھتاب پر
کس نے بھائی ہر درخت کی روشنی
کس نے سر چمن سے ہے کھینچی براءے گل
کس نے مسل کے رکھ دی ہر ایک نوبہ نوکلی
گلشن کو کس نے ایسے اجازا ہے دستو
باد صبا چلی بھی تو شوریدہ سر چلی
خود باغبان نے لوٹ لیا حسین گلتاں
تھت اگر گئی بھی تو گھنی کے سرگئی
راشد یوں فتح ہو گیا افسانہ حیات
اک آرزو میں کٹ گئی یہ ساری زندگی

راشد حسین راشد (کینڈا)

کیا۔ اکثر وہ مجھے پڑھا جاتے تو حوصلہ پتے۔

”پروردگارِ عالم نے اپنی کارگاہِ فانی میں آرام و تکلیف، رُخ و غم، دوست و دشمن، بیماری و متدرستی اور طرح طرح کی صد ہار احتوں اور مصیبتوں میں پیدا فرمایا۔۔۔۔“ انسان کو ہم نے مشقت اور تکلیف میں پیدا کیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ نجات کے لیے احتیاطی تدبیریں مقرر فرمادی ہیں۔“

انسان اپنے مسائل حل کر سکتا ہے۔

”مولانا صاحب وہ تدبیر کیا ہیں؟“ میں نے پیدا میڈ ہو کر انہیں دیکھا۔

”پیناسپ سے قوی تدبیر یہ ہے کہ بلااؤں اور مصائب کے اترانے والے کو پکارا جائے جسے دعا کہتے ہیں۔ بس یقین کے ساتھ دعا کرو دعا ضرور قبول ہوگی۔“

اس روز میں نمازیں بہت روپا۔

”میرے پاس کوئی راستہ نہیں ہے تو دیکھ رہا ہے مجھے سزاے موت ہو سکتی ہے میں بے گناہ ہوں میں

نے وہ گناہ نہیں کیا تو مجھے بچالے اور مجھے میرے اپنوں میں پہنچا دے میری ماں میرے لیے ترقی

ہے۔ میری یوں کوئی دعا کرو ضرورت ہے اے رب کریم مجھ پر رحم فرمایا۔ مجھے اس آزمائش سے بکال لے۔

میرے گناہوں کو معاف فرمادے۔“ بجدے میں روتا تھا جو زکر دعا مانگتے ہوئے خدا سے معافی مانگتا اور پھر قرآن کھول کر بیٹھ جاتا میں گھنٹوں پڑھتا۔

میرے دل بے قرار کو قرار آتا۔ میں نے قرآن حفظ کر لیا تو حوالدار صاحب نے تھانے میں مٹھائی لفیم کرواتی اور انہیوں نے مجھ سے کہا۔

”تم ایک نیک انسان ہو خدا تم پر رحم کرے میری دعا ہے تمہیں سزاے موت نہ ملے۔“ میں رو دیا۔

”میں نے اپنا معاملہ خدا کے سپرد کیا ہے خدا جانتا ہے میں بے گناہ ہوں۔“

جادو یہ بھی ایک ایسا درندہ تھا جس نے ایک گروہ بیان کھا تھا اس جمل میں اس کی دادا گیری چلتی تھی۔

ہر کمزور کو دباتا تھا۔ میں خاموش رہتا تھا، لیکن کمزور نہیں تھا۔ ایک روز اس نے مجھے بلاوجہ جھیٹا اور

میں نے اسے زمین پر پٹخت دیا۔ اس دن سے لوگ میرے رفیق بن گئے۔ ہر بڑی طاقت زیر ہو سکتی ہے بس ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لوگ بلاوجہ اس سے ڈرتے تھے۔ وہ باتوں کا شیر تھا۔ مجھے

اکثر راتوں کو اپنی معصوم یہوی کا غمزدہ چہرہ ستاتا تھا۔ اس کے حسین چہرے پر سرخ و سفید رنگ کی لکیریں آنکھ پھولی کھلیتی ہیں۔ رخسار پھولوں کی مانند سرخ

اور نرم ہونٹ گلاب کی پھلیڑیوں کی طرح نرم و نازک بھی سفید گردن اور نازک کندھوں پر سیاہ رُفسیں ناگنوں کی طرح لہراتی تھیں۔

وہ بات کو بال میرے کہنے پر کھوٹی تھی مجھے اس

کے بال بہت پسند تھے۔ وہ نسایت کے تمام جذبات و احساسات اور خصوصیات کے زیور سے

آراستہ و پیرا راستہ تھی۔ جس کا حسن بے مثال، گفتگو لاجواب، اور مرمریں پکیر لاثانی تھا۔ مجھے اس کی بڑی

فکر تھی اس دفعہ وہ مجھ سے ملنے آئی تو بے تحاشہ روئی وہ بہت دنوں بعد آئی تھی اس نے مجھے بتایا وہ امید

سے ہے۔ میں بہت خوش ہوا اور روپڑا اس حالت میں اسے میری لقی ضرورت تھی۔ پیدورت کی لکیسی

سم ڈریفی ہے۔ اتنے عرصے بعد خوب جبری دی بھی کن حالات میں بے بھی سے میں نے اسے دیکھا۔

انسان جب مجبور اور بے بس ہوتا ہے تو صرف

اللہ یاد آتا ہے۔ میں نے نماز کی پاندی پہلے سے زیادہ کی اور قرآن پڑھنے کی طرف رغبت ظاہر کی مجھے

حوالدار نے قرآن دے دیا۔ اب میں صحیح سوریے اٹھتا اور نماز فجر پڑھ کر قرآن پڑھتا، تھانیدار صاحب نے ایک مولانا کو میرے قرآن پڑھانے پر مامور

کھنچتے ہی مجھے لٹک جانا تھا اچانک مجھے قدموں کی آس کھٹ سائی دی۔۔۔۔۔ مگر یہ کیا تھا نیدار صاحب نے رسی کھلوا دی۔ اور مجھے تختہ دار سے اُتار لیا گیا۔

”اصل مجرم پکڑا گیا ہے جس نے بیان دیتے ہوئے پولیس کو بتا دیا ہے کہ اُس نے تمہیں کیسے پھنسایا تھا۔“ آنے والے پولیس الہکار نے کہا۔ میں سمجھ دے میں گرا بے شک میرے خدا تو ہی آڑے وقت اور مصیبت میں کام آنے والا ہے۔ تو رحیم ہے کریم ہے۔ شکر ہے میرے مولا تو نے مجھے بچا لیا۔ میں بے گناہ تھا۔ میرا ساتھ دیا۔

تھانے میں اس روز جشن کا سماں تھا مٹھائیاں تقسیم ہوئیں اور مجھے تھانیدار صاحب نے رخصت کرتے ہوئے دعا دی۔

”حافظ صاحب آپ بہت خوش نصیب ہیں۔ خدا نے آپ کو پھر سے زندگی دی ہے ہمیشہ خوش رہیں۔“

میں گھر پہنچا میری ماں مجھ سے لپٹ کر بہت روئی وہ مجھے چومتی رہی اور دعا میں دیتی رہی۔ ہاں یہ میری ماں کی دعائی ہی میں واپس لوٹ آیا۔ عائشہ کی گود میں میرا نخنا منا سا پینا کھیل رہا تھا۔ میں نے اپنے بیٹے کو پیار کیا اور عائشہ کا شکر یہ ادا کیا جس نے میری غیر موجودگی میں پردے میں رہ کر کار و بار بھی دیکھا اور گھر میں اسی کا بھی خیال رکھا۔

”بیٹا اس کا نام ہم نے محمد ایں رکھا ہے۔“

”ماں یہ نام بہت اچھا ہے۔ اویں کو میں ضرور حافظ بناؤں گا پھر دنیاوی تعقیم بھی دوں گا۔“ میں نے اویں کے ہاتھ چوتھے ہوئے کہا۔ میری ماں مسکرا دی۔ اب میں روز گھر سے نکلنے سے پہلے ماں کو قرآن سناتا ہوں تو مجھے دعا میں دیتی ہیں کہ میں نے اُن کی حافظ بنتنے کی خواہش پوری کر دی۔

☆.....☆☆.....☆☆

☆.....☆
وہ رات میری آخری رات تھی صبح صادق کے وقت میں انھائیں نے وضو کیا پسی ماں بیوی اور بچے کے لیے دعا مانگی آج مجھے اپنی ماں بہت پیدا رہی تھی عائشہ نے مجھے بتایا تھا وہ بہت پیار ہیں آپ کو یاد کر کے صبح دشام روئی ہیں۔ میں نے انہیں پکھنیں بتایا۔

عائشہ نے اچھا کیا میری ماں تو مجھے اس حالت میں دیکھ کر مر جاتی۔ اس نے بیوی کے بعد مجھے بڑی محنت و مشقت سے پلا تھا۔ سارا سارا دن میرے کاموں میں مصروف رہتی میرے لیے جس طرح طرح کے کھانے بناتی مجھے اسکوں چھوڑ کر آتی مجھے نہ لتا و دھلاتی۔ مجھے صاف سخرا رحمتی پیماری میں میری تیارداری کرتی، اُس کا اٹھنا بیٹھنا سونا جا گناہ سب میری ذات کے گرد تھا۔ وہ یہ سب کیے برداشت کرتی۔ غم سے اس کا سینہ پھٹ نہ جاتا۔ شکر آٹھ بجے مجھے سپاہی لینے آگئے۔ لاک اپ میں کھڑے سب قیدی اداں تھے۔ انہیں مجھ سے اُس ہو گیا تھا۔ میں نے جاتے ہوئے سب سے مصافحہ کیا۔ ہر آٹھ کھنڈ یہ ٹھی۔ اور میں اداں اور غزدہ۔۔۔۔۔ کیا خدا میرا ساتھ دے گا یہ پل یہ چند لمحے جو میری سانسوں کے رہ گئے ہیں اس میں کوئی کرشمہ خداد کیھا سکتا ہے۔

تھانیدار صاحب ایک جلا دا یک ڈاکٹر اور سپاہی میرے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ جلانے ایک سیاہ رنگ کا کپڑا میرے منہ پر چڑھا دیا۔ میں نے سورہ یسین دل میں پڑھنا شروع کی تاکہ زندگی سے موت کا سفر آسان ہو جائے۔ اب میری سوچوں میں رشتے ناطے مدم پڑ رہے تھے۔ اب سانس اکھڑنے والی تھی جلانے تختہ دار پر کھڑا کیا اور رہی میرے گلے میں ڈالی۔ میں نے کلمہ پڑھا اور آنکھیں زور سے بند کر لیں۔ پھرندہ



مصطفیٰ زیدی کی فکر

مری روح کی حقیقت میرے آنسوؤں سے پوچھو
مرا محلی عبسم مرا ترجمان نہیں ہے

صفد جیب

ایک دم ہڑپڑا کر انھی کیونکہ اگر وہ اب اس سے پہلے کہ چل ایکن تک اتی وہ ایک دم بتر بھی نہ اٹھتی تو یقیناً اماں کی چل لازمی آنامی، اور سے کو دگنی۔



کر گئے تھے اُن کی پروپریتی بھی اُن کے منہ بولے بچانے کی اور جب بشیر صاحب کمانے کے قابل ہوئے تو اُن کی شادی اپنی بیٹی جہاں آراء بیکم سے کردی جہاں آراء بیکم بھی قسم سے اکلوتی تھیں اس لیے ایکن کو خالہ کا پیاراں سکا اور نہ ہی بچا، پھوپوں کا پیاراں سکا۔

ایکن کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے کا بہت شوق تھا اور اُس دن بشیر صاحب کو ایکن کا ایڈمیشن کروانے اُس کے ساتھ جانا تھا جہاں آراء بیکم صحیح سے ہی بڑبڑا نہیں مصروف تھیں۔ ”ستیاناس کر دیا ہے لڑکی کا امرے میں اثر بہت ہے کون سا شادی کے بعد تو کوئی کرے گی۔“ وہ نہایت غصے کے عالم میں بڑبڑا ہی تھیں اور ایکن اور اس کے والد مکار ہے تھے۔

”ارے بھکی جہاں آراء بیکم صحیح اچھے کلمات مدد سے نکالو، پچی کو دعا میں دو اللہ اے کامیاب کرے انشاء اللہ شادی بھی ہو جائے گی ابھی کون سا ہماری بیٹی کی عمر نکلی جا رہی ہے۔“

”ہاں ہاں جائیے، میری سنا کون ہے اس گھر میں،“ اُن کا غصہ بخوبی قائم تھا۔

یونیورسٹی سے شام چار بجے کے قریب ایکن اور بشیر صاحب گمراہ پس آئے، گرفتار ہے ایڈمیشن ہو گیا تھا۔ اب ایکن کی روشنی بہت نہ ہوئی تھی صحیح آٹھ بجے گھر سے لکھتی تو واپسی میں پانچ بجے جاتے تھے۔

اماں پڑھ پڑھ کر پھوپھیں رہتیں اور ساتھ ہی نیحتوں کا انبار ایکن کے لیے لگا ہوتا، یونیورسٹی میں ایکن کی یوں تو کافی دوستیاں ہو گئی تھیں، مگر افشاں اُس کی خاص دوست بن گئی تھی۔ دراصل افشاں کا گمراہ ایکن کے گھر کے قریب تھا اس لیے ساتھ آتا جانا بھی تھا اور دونوں میں دوستی بھی گہری

”کبھی ڈاکجھوں نے ستیاناس مار دیا ہے اور رعنی سکی کسر اس نیت نے پوری کر دی ہے۔“ مخصوص ماری ہر وقت موبائل میں لگی رہتی ہے۔“ ایماں مستقبل بڑبڑا ہی تھیں مگر ایکن کو کہاں پرواہ تھی۔ یہ تو ایماں کا روز کا معمول تھا۔ ایکن کے والد بشیر صاحب ایک نجی ادارے میں طازمت پیشہ تھے اور ایکن اُن کی اکلوتی بیٹی تھی۔

چہاں آراء بیکم کی سلیقہ مندی سے عزت سے گزر بہر ہو رہی تھی۔ چہاں آراء بیکم کی بھی ہر ماں کی طرح بھکی خواہش تھی کہ جلد از جلد کوئی شریف خاندان دیکھ کر ایکن کے لامتح پلے کریں، مگر بشیر صاحب ایکن کی دچپی دیکھتے ہوئے اُسے اور پڑھانے کے خواہش مند تھے۔ ایکن پڑھائی میں کافی بوشیار تھی اور اثر کے تنازع نہیں یہ بات اور پختہ کر دی جب ایکن شاندار نمبروں سے کامیاب ہوئی۔

ایکن کو روانی ڈاکجھ پڑھنے کا بہت شوق تھا اور جب موقع ملتا ہوا مام سے چھپ کے ڈاکجھ پڑھنے پہنچ جاتی، چہاں آراء بیکم ایک دین دار خاتون تھیں اُن کے لیے یہ سب فالتوں لغویات تھے وہ ایکن کو بھی سمجھاتیں کہ دین کی سمجھ حاصل کرو مگر ایکن نادان تھی وہ تو انہی سوچوں میں رہتی کہ ایک دن کوئی ”شہزادہ“ آئے گا اور اُس کو پیاہ کر لے جائے گا، ایک خوبصورت لڑکی تھی وہ کسی بھکی لڑ کے کا خواب ہو سکتی تھی اور اماں کو روز بروز بھکی فرکھائے جا رہی تھی کہ کوئی اچھا سا رشتہ مل جائے اُن کی دعا میں صرف ایکن تک ہی مدد و دوستی تھیں۔

بشیر صاحب بھی اپنے والد کے اکلوتے جنم و چراغ تھے اور اُن کے والدین بھپن میں ہی انتقال

ہو گئی تھی۔

پاس ہو گی تو انہیں اچھا لگے گا۔“

بیش ر صاحب کچھ سوچتے ہوئے انھیں گئے اور
بیکری حلے گئے، واپس آگر انہوں نے ناشتہ کیا
اور تیار ہو گر آفس چلے گئے۔ ایکن بھی گھر کے
کاموں میں لگ گئی وقفے و قفے سے اماں کو دیکھنے
جائی پتہ نہیں کیوں آج اسے اماں کے چہرے پر
سکون نہیں نظر آ رہا تھا جسے ہمیشہ ہوتا تھا پتہ نہیں وہ
کس بات کو لے کرتی تفکر تھیں۔

شام میں بیش ر صاحب جب دفتر سے واپس
آئے تو اماں کی طبیعت کافی سنبھل گئی تھی مگر وہ
بدستور خاموش تھیں۔

ایکن برآمدے میں ٹہل رہی تھی پتہ نہیں کیا
بات تھی ابو آتے ہی اماں کے پاس گئے اور کافی
دیر سے دونوں پتہ نہیں کس مسئلے کو لے کر بحث
کر رہے تھے ایکن نے کافی سخن کی کوشش کی مگر نہ
سن سکی، مگر تھوڑی ہی دیر میں جب ابو نے آواز
دے کر اسے بلا یا تو وہ ڈرتے ڈرتے اندر آئی کہ
نجانے کیا کہیں گے، اماں نے اسے پیار سے اپنے
پاس بٹھایا تھا۔

”کیا ہوا اماں اب طبیعت کیسی ہے، آپ اتنی
چپ چپ کیوں ہیں؟“ ایکن نے اماں کی گود
میں اپنا سر رکھتے ہوئے پیار سے پوچھا۔ اماں
مکرانے لگیں۔

”کچھ نہیں میری شہزادی میں ٹھیک ہوں اب
اچھا سنو مجھے اور تمہارے ابو کوتم سے کچھ پوچھنا
ہے تم ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔“ جہاں آراء یکم
نے ایکن کے بالوں کو سہلاتے ہوئے پیار سے کہا
تو بیش ر صاحب بھی مکرانے لگے۔

”اماں میں نے آج تک آپ سے کچھ
جبوٹ بولائے ہے جو آپ ایسے کہہ رہی ہیں۔“
ایکن نے مصنوعی خفیٰ سے کہا۔

وقت کا کام ہے گزرنا وہ گزرنا چلا گیا اور
یوں کس طرح ایک سال گزر گیا پتہ ہی نہ چلا،
ایکن کی وہی روشنیں جاری تھیں اور جہاں آراء یکم
کی فکر بھی بڑھتی جا رہی تھی، دراصل وہ چاہ رہی
تھیں کہ کم از کم ایکن کی پڑھائی مکمل ہونے تک
کہیں بات چیت طے کر دیں اور اس سلسلے میں
آج کل آمنہ بوا کافی ان کے گھر آ رہی تھیں۔
اس معاملے میں ایکن خاموش تھی، کیونکہ وہ جانتی
تھی کہ اگر اس نے اماں سے فی الحال کوئی بحث
کی تو پڑھائی سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

اُس دن صبح سے ہی اماں کا دل گھبرا رہا تھا،
پتہ نہیں کیوں وہ بے چینی کی لگ رہی تھیں کیونکہ نہ
ہی انہوں نے ایکن کو یونیورسٹی جانے کے لیے
اخھایا اور نہ ہی کمرے سے باہر آئیں ایکن کو
الارم لگا کے سونے کی عادت تھی مگر اس تھی وہ اماں
کے اٹھانے سے ہی تھی، مگر جب اماں نہ آئیں تو
وہ خود اٹھ کے باہر آئی دیکھا تو اماں برآمدے
میں نہیں تھیں، وہ اماں کو آواز دے کر کمرے میں
جانے لگی تو ابو نے روک لیا۔

”رنے دو میٹا تمہاری اماں کی طبیعت کچھ
ٹھیک نہیں لگ رہی ہے، رات سے ہی کچھ بے
چین ہیں، ابھی آنکھ گلی ہے تھوڑا آرام کرنے دے
وہیں۔“

”خبریت ابو کہا ہوا ہے اماں کو رات میں تو
ٹھیک تھیں۔“ ایکن کو فکر لاحق ہوئی۔

”پتہ نہیں بیٹا، میں بھی فکر مند ہوں چلو تم
پریشان نہ ہو ٹھیک ہو جائیں گی، ایسا کرو چائے
بناؤ میں بیکری سے پاپے وغیرہ لے آتا ہوں اور
ایسا کرو آج چھٹی کر لو اپنی اماں کے پاس رہو
ہو سکتا ہے اُنہیں کسی چیز کی ضرورت محسوس ہوتا
ہے۔“

غزل

☆☆☆

صبر سے کام لو، موسم کو بدل جانے دو
برف حالات کی تھوڑی سی پکھل جانے دو
اپنی کشتنی کو ہٹالو ذرا ساحل کی طرف
بس یہ کچھ دیر کا طوفان ہے مل جانے دو
اب سجاانا ہے سکتے ہوئے ہونٹوں پر ہنسی
میرے اس خواب کو تعمیر میں ڈھل جانے دو
عہدِ گم گشتہ کے قصے نہ سناؤ مجھ کو
وادیِ خواب سے اب مجھ کو نکل جانے دو
شاخِ امید سے یہ ٹوٹ کے بکھرے ہوئے پھول
ان کی قست میں پکلتا ہے کچل جانے دو
سازِ احساس ہے خاموش نہ جانے کب سے
اب تو نغمہ کوئی ہونٹوں پر چل جانے دو
ڈھونڈ لے گی نئی امید کا ساحل خود ہی
کشتنی زیست کو طوفان سے منجھل جانے دو
روشنی کچھ تو سر را گہندر ہو فیاض
اس میں کچھ خواب بھی جل جائیں تو مل جانے دو

☆☆☆

فیاض علی فیاض

"نہ میری بچی میرا یہ مطلب نہیں تھا دارا صل
میری چند امیری طبیعت اب تھیک نہیں رہتی میں
چاہتی ہوں کہ پڑھائی مکمل ہونے تک تمہاری
نہیں بات پکی کر دوں، مگر تمہارے ابوکا کہتا ہے
میں پسلتم سے پوچھوں کہ تم کیا چاہتی ہو تو نہیں
ہمارے اس فیصلے پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"
"اماں اتنی جلدی کیا ہے، پکھنیں ہو گا آپ
کوئی کیوں وہم پالتی ہیں آپ۔" ایکن روہانی
ہو گئی۔

بیش رصاحب بولے۔

"بیٹا! تمہاری اماں کو چین مل جائے گا، تم تم
اپنی پڑھائی مکمل کرو ہم شادی تو تمہاری پڑھائی
مکمل آرنے کے بعد ہی کریں گے۔"
ایکن خاموش ہو گئی کیونکہ اُس کی ہاں میں
اماں کا سکون تھا، جو اسے دنیا میں سب سے زیادہ
عزیز تھا۔

تو اوار کا دن تھا آج صبح سے ہی اماں بہت
خوش تھیں اور ہوتیں بھی کیوں نہ بھتی آج ایکن کو
دیکھنے لڑ کے والے ارہے تھے، آمنہ بوانے رشتہ
پیالا تھا، خاندانی لوگ تھے، لڑکا کیا ہوا تھا،
آن لوگوں کو بھی تھوڑا وقت درکار تھا، لہذا جہاں
آراء بیگم نے آن لوگوں کو گھر آنے پر مدح کیا۔

ایکن تو تھی ہی پیاری سادگی میں بھی اُس کا
حسن نایاب تھا اب تھوڑا تیار ہوئی تو اور نکھر گئی
اماں بلا ٹیک لیے جاری تھیں۔

"اللہ پاک میری بچی کے نصیب اچھے کرنے
نظر بد سے بچائے۔" اُن کے لیبوں پر بس بھی دعا
تھی۔

ہلکے گلابی رنگ کے سوٹ میں سر پر سلیقے سے
دو پڑائوڑ ہے ایکن جب کمرے میں داخل ہوئی تو
دانیاں پلٹیں جھپکانا ہی بھول گیا، اتنا مکمل اور سادہ

ہوتی جا رہی تھی وہ مزید حسین ہو گئی تھی۔

اماں تو لگتا تھا اس ایکن کو گھر میں بنتا بنا دیکھنے کے لیے ہی زندہ تھیں، چند ماہ بعد ہی اح JACK اُن کا بارٹ فیل ہوا اور وہ اللہ کو پیاری ہوئیں، بیش رصاحب بھی تھائی اور صدمہ برداشت نہ کر سکے اور جہاں آراء بیگم کے چہلم میں وہ بھی چل لے۔

لے کے بعد دیگرے صدموں نے ایکن کو ٹھڑا کر دیا تھا پہلے ماں اور پھر باپ کا سایہ بھی چھمن گیا، ایکن بہت ثوٹ گئی تھی دنیاں اُس کا بہت خیال رکھ رہا تھا، ہر طرح سے اُس کی دل جوئی میں لگا ہوا تھا۔

وقت ہر زخم بھر دیتا ہے کچھ وقت بعد ایکن بھی سنجل گئی۔

ای دو ران ایکن کو بہت بڑی خوشخبری ملی اللہ نے اُسے ماں بننے کی سعادت سے نوازا، رضیہ بیگم اور دنیاں کے تقدیم ہی زمین پر نہیں پڑ رہے تھے اُن کا بُس نہیں چل رہا تھا ایکن کو کہاں چھپا دیں جہاں اُسے کسی کی نظر نہ گئے۔

ایکن بھی بہت خیال رکھ رہے تھے کیونکہ میکہ تو رہا نہیں تھا، رضیہ بیگم کی بھی کوٹھ ش ہوتی کہ ایکن کو کبھی کوئی کمی محسوں نہ ہو وہ ایک درود مدد خاتون تھیں۔

اُن دنوں ایکن کی طبیعت ٹھڑا ہی رہنے لگی تھی، کہنے کو تو وقت ہر زخم بھر دیتا ہے گر ماں پاپ دنیا کی ایسی ہستی ہیں جن کی بھی پوری نہیں ہو سکتی اور ان دنوں اماں کی یاد ایکن کو ملیں چلیں ہوں ہر ہی تھی یہ وقت ہی شاید ہر عورت کے لیے نازک ہوتا ہے جہاں اُس کو پیار اور اپنوں کا سایہ بہت ہست دیتا ہے۔ رضیہ بیگم اس بات کو

حسن، اُس نے نہیں سوچا تھا وہ تو اپنی امی کے بہت ضد کرنے پر اس رشتے کے لیے راضی ہوا تھا، اگر اب ایکن کو دیکھ کر اسے اپنی امی کے فیصلے پر پیار آ رہا تھا۔
رضیہ بیگم (دانیال کی والدہ) کو بھی ایکن بہت پسند آئی، دنوں گھر انوں کی اپس میں بات چیت ہوئی اور دنیاں کا ایکن کے ساتھ رشتہ طے ہو گیا۔

ایکن کو یہ سب کچھ ایک خواب سالگ رہا تھا اُس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی اچا بک اتنی خوبصورت ہو جائے گی، دنیاں واقعی ایک ایسا انسان تھا جو کسی بھی لڑکی کا خواب ہو سکتا ہے پہنچنے نہیں چلا وقت کب پر لگا کے اڑتا چلا گیا اور ایکن کی تعلیم مکمل ہوئی اور شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں، جہاں آراء بیگم کی سلیقہ مندی کی وجہ سے بیش رصاحب کو اتنی بڑی ثانی کا ساماننا کرتا پڑا کیونکہ تھوڑا تھوڑا جوڑ کے بھی کافی سامان جہاں آراء بیگم نے ایکن کے لیے جمع کیا ہوا تھا۔

آخر کار سب کی دعاوں میں ایکن دنیاں کے ساتھ رخصت ہو کر اس کے گھر آگئی اور بیش رصاحب کا گھر سونا کر گئی۔

ایکن کی سلیقہ مندی کے سارے ٹکنے جہاں آراء بیگم والے ہی تھے، اُس نے آتے ہی سرال میں سب کا دل جیت لیا، دنوں نہیں بھاپی کی دیوانی تھیں، دیور جیسے تو تھے نہیں دنیاں اکلوتیا تھا رضیہ بیگم کا اور اب بہو بھی آگھہ کا تارا بین گئی ہی۔
ایکن نے اپنے اخلاق و محبت اور اپنے سلسلے سے سب کو اپنابالیا تھا، دنیاں کی تو جان نے ہی تھی ایکن میں بہت خیال رکھتا تھا وہ اُس کا تھوڑی سی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا ایکن کی اور ایکن اُس کی محبت میں دن بدن نہیں

بخوبی سمجھ رہی تھیں اور ایکن کو ہر اونچے نجع کے
ڈاکٹروں نے لاکھ کوشش کی گرفتاری تقدیر کی
کچھ اور ہی مغلظہ تھا کیونکہ دنیا ڈاکٹروں کی
لاکھ کوشش کے باوجود بھی نہ فتح سکا اور زندگی کی
بازی ہار گیا۔ رضیہ بیگم کے اوپر تو قیامت ہی ثبوت
مگر ان کا اکلوتا چشم و چاغ بیہس کے لیے گھر کو
اندھیرے میں ڈبو گیا۔ ایکن کی تو حالت اتنی
زیادہ خراب تھی کہ آنے والا رخص امکلار تھا، پے
در پے صدموں نے ایکن کو سکتے کی کیفیت میں
ڈال دیا تھا۔

اُسے نہ بچی کی خبر تھی اور شہزادی اپنا ہوش، اتنی
ی عمر میں بھاڑ جیسے دکھوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا،
گرفتاری زندگی اسی کا نام ہے یعنی کسی کے لیے
رُکتی ہے اور شہزادے کی وقت ہر زخم پر مرہم رکھتی
دیتا ہے، گرفتاری ہیں تا کچھ ذخم نا سورہ بن جاتے
ہیں، بچی کچھ ایکن کے ساتھ بھی ہوا زندہ لاش بن
چکی تھی وہ بچی کی قفاریاں بھی اُس کو زندگی کی
طرف واپس نہیں لایا رہی تھیں۔

رضیہ بیگم نے بچی کا نام انمول رکھا کیونکہ وہ
آن کے دنیا یا کی آخری نشان تھی اور آن کے
لیے انمول تھی۔

اس واقعے کا وہ دوسرے بیت چکے ہیں ایکن
آج بھی رضیہ بیگم کے ساتھ عی رہ رہی ہے اور
رضیہ بیگم نے بھی اُس کو اولاد کی طرح ہی رکھا ہوا
ہے اور آن کی یہ خواہش ہے کہ ایکن دوبارہ زندگی
کی طرف لوٹے اور اپنے لیے کسی همسفر کا انتساب
کرے۔

میری تو بھی دعا ہے اللہ اُس کے نصیب اچھے
کرے اور اُسے داغی خوشیاں دے آئیں۔ آپ
قارئین سے بھی دعا کی التماس ہے۔

☆☆☆.....☆☆

بخوبی سمجھ رہی تھیں اور ایکن کو ہر اونچے نجع کے
بارے میں سمجھا رہی تھیں، یہی وجہ تھی کہ ایکن کافی
حد تک سنجل گئی تھی۔
کہتے ہیں نصیب کے لکھے کو کوئی ٹال نہیں سکتا
ہے، شاید بد بیجتی نے ایکن کا دامن پکڑ لیا تھا، جس
روز اُس کی ڈیوری تھی، صبح سے ہی رضیہ بیگم کے
ہاتھ میں پھول رہے تھے گھبراہٹ تھی کہ ختم ہونے کا
نام یہی نہیں لے رہی تھی وہ اپنے آپ کو سنبھال
رہی تھیں کیونکہ اگر ایکن اُن کی یہ حالت دیکھ لئی
تو شاید وہ اور زیادہ بدواس ہو جاتی، دنیا
دواں نہیں لینے اسٹور گیا ہوا تھا اور کافی دیر ہو گئی تھی
داہم نہیں آیا تھا۔

اسی اثناء میں ایکن کو لیبر روم میں شفت
کر دیا گیا، رضیہ بیگم کی زبان پر درود شریف کا ذکر
اور دعا میں مستقل جاری تھیں۔

”یا اللہ بن ماں باپ کی بچی ہے، اس کے
لیے آسانیاں پیدا کر اور اس کی تکلیف کو آسانی
میں بدل دے میرے مالک۔“ اُن کے لیوں پر
بس سیکی دعا جاری تھی۔

تقریباً آدمیے گئے بعد نہ سہا ہر آئی اور رضیہ
بیگم کو خوشخبری سنائی کہ وہ دادی بن بچی ہیں۔
ایکن نے ایک خوبصورت بیٹی کو جنم دیا تھا، رضیہ
بیگم بہت خوش تھیں گرفتاریاں کا ابھی تک کچھ پڑے
نہیں تھا، ایکن بھی کب سے دنیا کے ہی بارے
میں پوچھ رہی تھی۔

اسی اثناء میں ہاسپل میں ایک شیڈ نہ کیس لایا
گیا ایک شیڈ نہ پری طرح ہوا تھا پورے ہاسپل
میں بھکڑا بچہ کئی تھی رضیہ بیگم بھی شور کی آواز ن
کر باہر آئیں اور انہوں نے جو دیکھا اُس کو دیکھ
کر وہ اپنے ہوش دوحاس سے بیکاش ہو گئیں کیونکہ
ہاسپل میں لا یا جانے والا وہ نوجوان کوئی اور نہیں

سمیتی سے سائزیں جیتی جاتی کہانی

سمیتی پیار رہیں

بیش بر کا شعر

یہ سوچ لو اب آخری سایہ ہے محبت
اس در سے اٹھو گے تو کوئی درد نہ ملے گا

گیتا پاٹے

کہا جاتا ہے کہ عشق میں پڑنا خطرناک بھی
کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں ہو گا کہ انہیں اپنی ہی
ہو سکتا ہے، لیکن رام پور کے رہنے والے تمہارے
ایک پاکستانی جاودیہ ایک پاکستانی رشتے دار سے محبت کرنے کا صدیہ



تھے۔ ” اپنی واپس آنے کے بعد سے پہلے کے لحاظ سے فیڈی کے مکین جاوید اپنی تنوخوں کی تمام رقم مبینہ کو فون کرنے پر خرچ کر دیتے۔ وہ کہتے ہیں ” اس وقت موپائل فون نہیں تھے اس لیے میں تیلی فون بتوحہ سے انہیں فون کیا کرتا تھا۔ یہ بہت مہنگا ہوتا تھا ان سے بات کرنے کے لیے اس وقت ایک منٹ کے لیے 62 روپے لگتے تھے۔ ”

ایک برس بعد جاوید نے پھر سے دو ماہ کے لیے کراچی کا دورہ کیا۔ اب دونوں کے الیخانہ بھی اس پیار و محبت کے چکر سے آگاہ ہو چکے گئے تھے۔

اس رشتہ پر تو کسی کو اعتراض نہیں تھا لیکن مبینہ کے الیخانہ چاہتے تھے کہ جاوید پاکستان منتقل ہو جائیں جبکہ اس کے برعکس جاوید کی فیصلہ چاہتی تھی کہ مبینہ اپنی آجائیں۔

جاوید بتاتے ہیں کہ ان کے خطوط دس صفحات پر مشتمل ہوتے اور میں 12 صفحے کا جواب دیتا اسے لکھنے میں مجھے بارہ دن لگتے تھے وہ کہتے ہیں آخری بار جب میں واپس آنے کا تو اس نے کہا آپ جائیے میں انسے والدین کو قائل کرلوں گی اور دوسروی بار آ کر مجھے ساتھ لے کر چلا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اب میں دوبارہ کبھی واپس نہیں آپاؤں کا اور اسے کبھی دوبارہ نہیں دیکھے پاؤں گا۔ ”

اس کے بعد اگلے دو برس تک جاوید مبینہ سے فون پر رابطے میں رہے اور دونوں نے ایک دوسرے کو طویل خطوط لکھے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ جاوید کو اور دمزمی زبان پر بہت کم آتی تھی جس میں مبینہ اپنی خطوط حصی تھیں اس لیے جاوید نے خط پر ہوانے کے لیے اپنے دوست مقصودی مددی۔

ملے گا کہ دہشت گردی کے الزام میں انہیں ایذا کیں دی جائیں گی اور سازھے کیا رہ برس جیل کی سزا کاٹنی ہوگی۔ عدالت سے بری ہونے کے دو برس بعد جاوید نے اپنی محبت کی اس غیر معمولی آپ بیتی کو مجھ سے شیئر کیا۔

انہوں نے اپنے عشقیہ خطوط دکھائے اور بتایا کہ کیسے انہیں اٹھیں خفیہ اداروں نے انہوں کر کے ان پر تشدد کیا اور جس پار کے لیے وہ برسوں قید میں رہے بالآخر وہ بھی نہیں ملا۔ مبینہ سے ان کی پہلی ملاقات سنہ 1999ء میں اس وقت ہوئی تھی جب وہ اپنی ماں کو لے کر کراچی گئے تھے۔

جاوید کے پچھا اور خاندان کے کتنی دیگر افراد سنہ 1947ء میں پاکستان ہجرت کر گئے تھے اور انہیں لوگوں سے ملاقات کے لیے یہ رام پورے کراچی آئے تھے۔

جاوید نے بتایا ” ملاقات کے ایک ماہ کے اندر ہی ہم نے ایک دوسرے سے اپنے پیار کا اٹھاہار کر دیا تھا۔ ہماری ملاقات خاندان کی ایک شادی میں ہوئی جہاں اور بھی بہت سی لڑکیاں لڑ کے موجود تھے اور شاید انہیں عدم تحفظ کا احساس ہوا۔

وہ مجھے ایک کونے میں لے گئیں اور کہا کہ چونکہ وہ مجھے سے پہاڑ کرتی ہیں اس لیے میں کسی اور لڑکی کی طرف نہ سیکھوں۔ میں نے ان سے کہا کہ میں بھی ایسا ہی محسوں کرتا ہوں۔ ” بس اس طرح کراچی میں جاوید کے سائز ہے تین ماہ کے قیام کے دوران یہ محبت پروان چڑھتی گئی۔

وہ کہتے ہیں ” وہ گھر سے کالج جانے کا بہانہ کر کے نکلتیں اور پھر میں کالج سے باہر ان سے ملتا اور پھر ہم سفاری پارک جاتے اور وہاں بیٹھتے

کرنے کی گزارش کر رہا تھا۔"

جاوید کی آنکھوں پر پیٹی باندھ دی گئی اور جب وہ کھوئی گئی تو انہوں نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں پایا جہاں اگلے تین روز تک انہیں ایذا میں دی گئیں۔

انہوں نے مجھے بہت مارا۔ مجھے الثالثا کا دیتے اور میرا سر ایک پانی کے ٹب میں ڈبوتے تھے۔ یہ بہت تکلیف دہ تھا۔ جب میری یہ برداشت سے باہر ہو گیا تو میں نے ان سے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ وہ مجھے قتل کر دیں۔

جاوید پر پاکستانی اٹیلی جنس ایجنٹی آئیں آئی کا بیجٹ ہونے کا الزام عائد کیا گیا اور پولیس نے دعویٰ کیا کہ وہ وزارت خارجہ اور دفاع کے خصیرہ راز اسلام آباد پر پہنچاتے رہے ہیں۔ تین روز بعد انہیں رام پور دوارہ واپس لایا گیا اور ان کے دوستوں مقصود، متاز میاں اور تاج محمد کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

دوسرے دن ان افراد کو عدالت میں پیش کیا گیا اور صحافیوں کے سامنے خطرناک تم کے درہشت گرد کے طور پر پیش کیا گیا، جنہوں نے بھارت کے خلاف جنگ چھیڑ رکھی تھی۔ حکام کا دعویٰ تھا کہ جاوید نے دوار کراچی کا دورہ آئی ایس آئی کے حکام سے ملاقات اور خصیرہ راز پہنچانے کے لیے کیا تھا۔ ان پر پوتا کے تحت مقدمہ چلا۔

جاوید کو قید تھائی میں رکھا گیا اور بہت ایذا میں دی گئیں۔ وہ اپنے بہترین دوستوں سے جدا ہو گئے لیکن ان کے پیار کی یادیں ہی جیل کی ساتھی تھیں جن کے سہارے وہ اپنا وقت گزارتے۔ وہ کہتے ہیں۔

"میں جیل میں دوسرے قیدیوں کو میں کی

ان کے ایک دوسرے دوست تاج محمد اردو میں تحریر کردہ خطوط کو ہندی میں ترجمہ کرتے تھے جنہیں جاوید بار بار پڑھا کرتے۔ مقصود ہی جاوید کی طرف سے اردو میں میں کو جواب لکھا کرتے تھے۔

جاوید بتاتے ہیں "ان کے خطوط دس صفحات پر مشتمل ہوتے اور میں 12 صفحے کا جواب دیتا۔ اسے لکھنے میں مجھے بارہ دن لگتے تھے۔" اور پھر ایک دن اچانک پوری دنیا ہی بدلتی گئی۔ جاوید کہتے ہیں۔

"مجھے وہ دن آج بھی یاد ہے۔ یہ 10 اگست 2002ء کا سنپر کا دن تھا۔ میں اپنی دکان میں تھا جب ایک آدمی آیا اور ٹی وی درست کرنے کے لیے ساتھ چلنے کو کہا۔

میں نے کہاں مکروں میں جا کر ٹی وی نہیں بنتا ہوں۔ لیکن ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ بہت پریشان ہے اس لیے میں چلنے کے لیے راضی ہو گیا۔" وہ دکان سے کچھ ہی میسٹر دوڑ گئے ہوں گے کہ ایک کار آئی جس کا دروازہ کھلا اور اس انہیں انواع کر لیا گیا۔

جاوید بتاتے ہیں کہ انہیں پہلے لگا کہ شاید یہ مجرم پیشہ و رفراہ ہیں لیکن پھر ان کی باتیں سن کر وہ سمجھتے کہ یہ پولیس الہکار ہیں اور ان کی مشکل وہیں کار میں ہی شروع ہو گئی۔ انہوں نے میرا پر، گھڑی اور دیگر چیزیں لے لیں۔ میرے پاس میں کے دو خط بھی تھے اور وہ بھی انہوں نے لے لیے۔ انہوں نے کہا اگر میں چپ نہیں رہا تو وہ مجھے شوٹ کر دیں گے۔

انہوں نے بتایا کہ میرے خاندان کو بھی انواع کر لیا گیا ہے اور دوسری کار میں اُن پر تشدید کیا جا رہا ہے۔" میں رو رو کر جیخ چلا کران سے رجم

غزل

یقین میں نقب لگاتا گمان کس کا تھا
فضا میں وہم آگاتا دھیان کس کا تھا
دلوں میں رُخِم لگاتی زبان کس کی تھی
خراشتا ہوا زور بیان کس کا تھا
وہ میرا گمراہ تو تھا آبادیوں کے پیچوں نجع
کھنڈر بنا ہوا خالی مکان کس کا تھا
یہ رُخِم رُخِم پرندے کو تھا نہ اندازہ
وہ ہاتھ حاملی تیر و مکان کس کا تھا
فصلی شہر پر شبِ خون مارنے والو !
ہمارے در پر کشیدہ نشان کس کا تھا
وہ ایک سایہ ہمیشہ جو ساتھ ساتھ رہا
تھہارے اور مرے درمیان کس کا تھا
نہ راہبر کا پتا اور نہ منزلوں کے نشان
وہ راستے میں لٹا کاروان کس کا تھا
وہ جس نے صحنِ گلستان میں لفظِ سلاگائے
ہمیں پتہ نہ چلا ترجمان کس کا تھا
خبر نہیں ہے کہ اس ہمیرے امام میں نور
ہوا کے دوش پر وہ سائبان کس کا تھا

نورشح نور (کینڑا)

کہانی سناتا تھا۔ کیسے مجھے پیار ہوا، اس کی عادتیں
کیسے وہ مجھے چڑھتی تھیں۔ اس سے جیل میں مجھے
بہت ہمت ملتی تھی جاوید کے والدین کے لئے بھی
یہ بہت مشکل وقت تھا۔ ان کی ماں افسانہ بیگم تو
اس کے لئے خود کو ذمہ دار مانتی ہیں۔ کہتی ہیں ”
اگر کراچی جانے کے لیے میں اس سے اصرار نہ
کرتی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس مصیبت سے بچے
جاتا۔“ ان کے والد نے اتنے بیٹے کی آزادی
کے لیے مقدمہ لڑا جس کے لیے انہیں اپنی زمین
جا شیدر اور زیور تک فروخت کرنا پڑے۔ بالآخر
19 جنوری 2014ء کو انہیں رہا کر دیا گیا اور رنج
نے ان پر عائد ک تمام الزامات سے انہیں یہ کہہ کر
مری کر دیا کہ ان کے خلاف شوت نہیں ہیں۔
جادو پید کہتے ہیں کہ ان کی زندگی کے قیمتی سال
جیل میں گزر گئے۔ گزشتہ دو برس سے وہ اپنی
زندگی دوبارہ شروع کرنے کی کوشش کر رہے
ہیں۔ انہوں نے گمراہ کے پاس ہی ایک ٹھی وی
رعایتی کی دکان کھولی ہے۔

وہ اس بات پر اکثر غصہ کرتے ہیں کہ وہ بے
قصور تھے اس کے باوجود ان کے ساتھ یہ سلوک
ہوا تو اس کا ہر جانہ کیوں نہیں ملا اور قصور اور اس کو
سرزا کیوں نہیں ملی۔ مبینہ سے متعلق ایک سوال کے
جواب میں وہ کہتے ہیں کہ وہ ان سے بہت دنوں
سے راتلے میں ہی نہیں ہیں اور شاید ان کی شادی
ہو چکی ہوگی۔ وہ بتاتے ہیں کہ وہ مبینہ کو اپنے
ذہن سے تو نکالنے میں کامیاب رہے لیکن دل
سے نہیں نکال پائے۔

”میں اب بھی اس سے پیار کرتا ہوں لیکن
کمال کرنے سے ڈرتا ہوں۔ کیا ہو گا اگر وہ پھر
میرے یا میرے خاندان کے چیچے پر جائیں۔“
☆☆.....☆☆

اللہ کی ہبھیاں جن کا انجام در طرح کا ہے

مختصر بیان

مختصر بیانی کا افغان

بہت سے وہ ہیں جو بار سفر اٹھا نہ سکے
بہت سے وہ ہیں جنہیں راستہ نہیں معلوم

افتخار چوبہ دری

گھر کے صحن میں لگے ہوئے آم کے گھنے پیڑ گھول رہی تھی۔ پیڑ کی گہری چھاؤں میں چار پائی پر چڑیوں کی موسمیقت بھری چپکار کانوں میں رس ڈالی گئی تھی، جس پر گھر کے افراد پتی ہوئی دھوپ



کیا ہے، پندرھویں سال میں ہو۔ پچھلے تین، چار سال سے تم جس طرح گھر کا نظام چلا رہے ہو وہ کیا کم ہے جبکہ تمہاری عمر کے پچوں کوتکھیل سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ ”انہوں نے پیار سے اس کے سرپرہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

”مگر ماں جی، چار سال مزدوری کر کے بھی میں کچھ جمع نہیں کر پایا۔ جب میں جوان ہنوں کی طرف دیکھتا ہوں تو میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ ان کی شادی کیسے کریں گے، دن رات میں سوچ سوچ کر میرا لیکچر منہ کو آتا رہتا ہے۔ اب تو اپنے قریبی رشتے دار بھی کتنی کمزور کرنکل جاتے ہیں کہ کہیں میں ان سے کوئی سوال ہی نہ کر دوں۔ میری اور آپکی کل آمدنی میں بمشکل چولہا جاتا ہے، تو اپنے میں یہ فرض کیے ادا ہوگا۔“ حامد نے ایجادی دلکی لمحے میں کہا، اس کی آنکھیں چھلنکے کو تھیں۔

”بیٹا تم دل چھوٹا نہ کرو میر اسونا رست متب الاسباب ہے، وہ ضرور کوئی نہ کوئی انتظام فرمادیں گا۔“ دشادیگم نے اپنے حاس دل میٹھے کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ گھر خود ان کا اپنا لہجہ کرب میں ڈوبا ہوا تھا۔

”ماں جی، کیوں نہ میں کسی دوسرے ملک چلا جاؤں اگر ایسا ہو جائے تو چند سال میں ہی ہمارے سارے ملے حل ہو جائیں گے۔“ حامد نے ایک خیال کے تحت کہا۔

”نہیں، بیٹا مجھ میں نہیں دو رسمیجے کا حوصلہ نہیں ہے۔ میں نہیں دیکھ دیکھ کر ہی تو جیتی ہوں اور دیے لمحی دوسرے ملکوں میں روپے درختوں پر تو نہیں لگتے، وہاں بھی بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔“ دشادیگم نے فتحی میں جواب دیا۔

”ماں جی صرف چند سال کی بات ہے جیسے

میں اکثر آرام کرنے کی غرض سے بیٹھتے تھے۔ اس وقت بھی حامد اور اس کی والدہ وہاں موجود تھے۔ ”ماں جی، آپ کو ایک بات بتاؤں...؟“ حامد نے لاڑلے انداز میں پوچھا۔

وہ اپنی ماں کی گود میں سر کر کر لیٹا ہوا تھا۔ ”ہاں بیٹا بتاؤ۔“ دشادیگم نے چوک کر جواب دیا، وہ حامد کے بالوں میں الکلیاں بھیر رہیں تھیں، کہ اس کی بات سن کر ان کا ہاتھ رُک گیا۔

”آپ اس دنیا کی سب سے اچھی اور پیاری ماں ہیں۔“ حامد نے اٹھتے ہوئے کہا اور پھر اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر اس پر عقیدت و احترام کا بوسہ شبت کر دیا۔

”اور تم جیسا بیٹا بھی شاید ہی کسی ماں کو نصیب ہوا ہو۔ اپنے باپ کے گذرنے کے بعد تم نے اتنی چھوٹی سی عمر میں جس طرح دن رات مزدوری کر کے اس گھر کو سہارا دیا ہے، کوئی عام پچھہ تو اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں اپنے پروردگار کا جتنا بھی شکر کروں وہ کم ہے۔ میں تو سوچ کر ہی کاپ جاتی ہوں کہ اگر تمہارا سہارا ان ہوتا تو میں پانچ بیٹیوں کا بوجھا لیکی کیسے برداشت کرتی۔“

دشادیگم نے پیار بھرے انداز میں کہا، بات کے اختتام تک ان کا لہجہ بھرا گیا تھا۔

”میں کہاں اچھا ہوں ماں جی۔ جھلا جس ماں کا جوان بیٹا ہو اور اسے پھر بھی لوگوں کے گھروں میں کام کرنا پڑے تو وہ کہاں سے اچھا ہو گیا۔“

حامد نے اس بار قدرے مایوس اور دکھ بھرے لمحے میں جواب دیا۔

”نا، بیٹا، نا اپنے نہیں کہتے ابھی تمہاری عمر ہی

جج کا کوئی جواب نہیں تھا۔
”بینا تم اپنی عمر سے بہت بڑی باقی کرنے
لگے ہو۔ بحر حال میں تمہیں خود سے دور کرنے کا
سوق بھی نہیں سکتی۔“ دشاد بیگم نے حقی انداز میں
انکار کیا اور پکن میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی
ہوئیں۔

اٹگل کئی دن حامد اپنی ماں اور بہنوں کو قائل
کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ بلا آخر ایک دن ماں
اپنے بیٹے کی ضد کے سامنے ہار گئی۔
”میر بیٹا جانے کے لیے اتنے روپے کہاں
سے آئیں گے۔“ انہوں نے ایک اہم مسئلے کی
طرف توجہ دلائی۔

”ماں جی ہمکر یہ گھر فروخت کر دیتے ہیں
آپ مجھ پر بھروسہ رکھیں میں بہت جلد آپ کو ایک
خوبصورت گھر بنانا کر دوں گا اور بہنوں کے ہاتھ
بھی پیلے کر دوں گا۔“
وشا دیگم کو اپنے بیٹے کے خلوص میں کسی قسم کا
کوئی ٹھنڈا نہیں تھا، چند دن میں ہی گھر فروخت
ہو گیا اور وہ اپنی بیٹیوں کو لیے کرائے کے ایک گھر
میں اٹھ آئی۔ حامد اپنے دوست شیخ سہیل کے
ساتھ شہر سے خوابوں کی سرز میں کی تلاش میں نکل
کر ہوا۔

☆.....☆

آج سمندر کا مود جزر عالم دنوں کے مقابلے
میں کافی تیز تھا۔ یقیناً آسان پر موجود چودھویں کا
چاند ہی اس تغیر کا ذمہ دار تھا۔ پورے چاند کے
ان دنوں میں پیدا ہونے والی مخصوص کشش کے
تحت حقی ہوئیں پانی کی طاقت در لہریں پر شور
آواز کے ساتھ ساطھ چنانوں کے ساتھ سرگرا کر
خود کشی کر رہیں تھیں۔ اور یہ عمل ایک تسلسل سے
جاری تھا۔

ہی میری بیٹیں اپنے گھروں کی ہو جائیں گی
میں واپس آ جاؤں گا۔“ حامد نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی۔ مگر
انہوں نے انکار میں سر بلکہ اس کے خیال کی
تردید کر دی۔

”ماں بیٹے میں کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں
کچھ بھی تو نہیں۔“ جیبیہ نے ہتھے ہوئے پوچھا
وہ ابھی کمرے سے نکل کر محیں میں آئی تھی۔ وہ
وشا دیگم کی سب سے بڑی بیٹی تھی۔
”باجی آپ ہی امی کو سمجھا میں نا۔“ حامد نے
التجھیہ انداز میں کہا اور اپنے باہر جانے والا آئیڈیا
اے بھی بتا دیا۔

”نہیں، بھائی ہم روکھی سوکھی کھالیں گے، مگر
تمہیں اپنی آنکھوں سے دور نہیں جانے دیں
گے۔ تم نے سب سے چھوٹا ہونے کے باوجود داس
کافی ہے۔“

جیبیہ نے بھائی کی بات سننے کے بعد دو توک
انداز میں اس کی بات رد کر دی۔

”آپ لوگ میری بات کو سمجھنے کی کوشش
کیوں نہیں گر رہے۔ پانچ بہنوں کی شادی کرنا
کوئی مذاق نہیں ہے۔ میں جو کچھ کمار ہاہوں اس
سے تو پیٹ کا جہنم بھی نہیں سے نہیں بھرتا تو ان کا
جہیز کیے ہواؤں گا۔ کیا ان کو گھر میں بٹھائے بوڑھا
کرنے کا ارادہ ہے۔ کسی اچھے ملک میں جا کر کم
از کم میری مزدوری کا معاوضہ تو معمول ملے گا اور
پھر میں اکیلا تو نہیں جاؤں گا۔ اپنی گلی کے شیخ
صاحب کا بیٹا اوسیں بھی میرے ساتھ جائے گا۔“
اس پاراں کے لمحے میں دیکل کے ساتھ جذباتی
پن بھی موجود تھا۔

وشا دیگم اور جیبیہ کے پاس اس کے کڑوے

گرگراہٹ کے ساتھ بیدار ہو گیا۔
انجمن اسارت کرنے کے بعد اس شخص نے
ڈائریکشن لیور کو سنجالا اور کشتی کو خطرناک حد تک
تیز رفتاری سے کھلے پانیوں کی طرف یا جانے لگا۔
ساحل کی طرف آئی ہوئی دیوبیکل اور طاقت
ور لمبیں کشتی کے راستے میں مراہم ہو رہی تھیں۔
کئی پارکٹی بڑی لمبیوں کی تاپ پر جا کر ایک

دم سے نیچے آئی تو ایسے محسوس ہوا کہ کشتی ابھی
الٹ جائے گی۔ مگر انجمن کو کنٹرول کرنے والا
ادھیر عرض شخص اپنے کام کا انتہائی باہر ٹاہرت ہوا، اس
نے ہر بار عین آخری لمحوں میں کشتی کو بیلس کرتے
ہوئے اسے اللئے سے بجا لایا۔ اس خوفناک جان
لیوا صورت حال سے کئی پارنو جوانوں کی گھٹی گھٹی جخیں
لکھیں۔

وہ سب ایک دربر سے جڑے ہوئے
بیٹھے تھے۔ لمبیوں نے کشتی کوئی بار التئے کی کوشش
میں اٹھا کر چاکرا گر انجمن آپریٹر کے سامنے اُن
طااقت ور لمبیوں کی کوئی پیش نہیں چلی، بالآخر وہ
ادھیر عرض شخص کشتی کو پھری ہوئی موجودوں میں سے
نکال لانے میں کامیاب ہو گیا تو سب نے
اطمینان کا سانس لیا۔

اب کشتی کھلے سمندر میں کافی تیز رفتاری سے
آگے بڑھ رہی تھی، ان لوگوں کا سمندر کے
پھرے ہونے کے باوجود اتنا خطرناک ریسک
لینے کا ایک خاص مقصد تھا اور وہ خاص مقصد یہ تھا
کہ دو جزر کے زیادہ ہونے کی وجہ سے کھلے
سمندر میں کوٹھ کارڈ زکی کشتی ثیموں سے مدد یعنی
ہونے کا چانس تقریباً ہونے کے باہر تھا۔ ابھی
انہوں نے چند نائلیں میں کاسفڑی طے کیا ہوگا
، جب غیر متوقع طور پر ایک جانب سے کوٹھ
کارڈ زکی تیز رفتار لامچے نمودار ہوئی اور سیدھی انہی

اس وقت جنوب سے شمال کی طرف چلنے والی
ہوانی سے بھری ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے فضا
میں جس کا تناسب بڑھا ہوا تھا۔ یہ سنسان اور
ویران علاقہ ایران کی مشہور بندرگاہ بندرعباس
سے شخص چند کلو میٹر کے فاصلے پر موجود تھا۔ یہاں
کئی پچھی چنانوں میں بے شمار قدر تی کریک
اور کھاؤیاں بیٹی ہوئی تھیں۔

یہ کریک اور کھاؤیاں انسانی اسکلروں اور
مشیات کو مشرق وسطہ سے لے کر یورپ تک
پہنچانے والے ڈیلوں کے لیے جنت چھیسی اہمیت
رکھتی تھیں۔

اس طرف کوٹھ کارڈ زکا عملارا وغیرہ ہونے
کی وجہ سے ان نا جائز دھندا کرنے والوں کو کھل کر
کھیلنے کا موقع ملا ہوا تھا۔

اس وقت ایک گہری کھاؤی میں چند کشتیاں
موجود تھیں، ان میں سے ایک کشتی میں درجن بھر
نوجوان دبکے بیٹھے تھے۔ کشتی کے آخری حصے میں
ایک چھوٹا سا انجمن دیسی اندماز میں فٹ کر کے
اسے بوٹ ہنانے کی بھوٹی کوشش کی گئی تھی۔
قریب ہی موجود اونچی چستان پر ایک لمبائی
نوجوان آنکھوں سے دور بین لگائے قفل سل ایک
ہی سست میں دبکے جا رہا تھا، کچھ ہی دیر میں اسے
دور سمندر میں پہنچتی بھوتی ہوئی روشنی دھکائی دینے
لگی۔ تو وہ کچھ گیا کہ اسے راستہ لکھیر ہونے کا کاش
دیا جا رہا ہے۔

اس نے ایک گہر اسانس لیتے ہوئے دور پین
آنکھوں سے ہٹائی اور پھر تیزی سے اترتا ہوا کشتی
کے قریب آیا اور ایک طرف بندگی ہوئی ریکھوں
کر کشتی میں سوار ہو گیا۔ اسی دوران انجمن کے
قریب بیٹھے ہوئے ادھیر عرض شخص نے انجمن سے
مشک ری کو ایک جھکلے سے چینچا تو انجمن بھلی سی

میں اترو اور پھر کوں کو کپڑتے ہوئے کشٹی کے
نیچے کی طرف ملے جاؤ۔ بس چند منٹ کی بات ہے
جیسے ہی فورس مظمن ہو کر واپس چلی جائے گی، تو
میں تمہیں واپس بلاں گا، اور یہ ایڈیشن ماسک
ہے جو پانی میں سے آ کر جن کشید کرتا ہے، اس سے
تمہیں سانس لینے میں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ اب
جلدی کرو اگر فورس نے تم میں سے کسی کو دیکھ لیا تو
میرے لیے بہت برا مسئلہ بن جائے گا۔“

کچھ ہی دیر میں سب لڑکے ماسک پہننے کر
بپھری ہوئی موجودوں کے درمیان ڈوٹی ہوئی کشٹی
سے نیچے اتر کر پیندے کی طرف آئے اور کوں کو
تھام کر انتظار کی سولی سے لٹک گئے۔

”اپنے ہاتھ سروں کے پچھے رکھ کر کشٹی کے
فرش پر لیٹ جاؤ۔ اگر کوئی غلط قسم کی حرکت کی تو
کویوں سے بھون دیئے جاؤ گے۔“ سیکورٹی
فورس کی لانچ سے لاڈ ایچیکر کر ذریعے پہلے
فارسی اور پھر وہی اعلان انگریزی میں دہرایا گیا۔
لانچ سے ہیوی سرچ لائٹ کی روشنی برہار راست
تکڑی ڈالی جا رہی تھی۔

کچھ تکڑی میں دو فرڈنٹ آر ہے تھے، اعلان سنتے
ہی دونوں نے اسے ہاتھ سرکے اوپر رکھے اور فرش
چرپیت گئے۔ چند گھنوان میں ہی کئی سلح نیوی سیلر
کشٹی میں اتر آئے اور ان دونوں کو نٹانے پر رکھ
لیا۔

”اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ اور اپنی شناخت
کرواؤ۔“ ایک سیلر نے بار عرب آواز میں حکم دیا
۔ اس کے کندھے پر آفیسر کے چیخ موجود تھے۔

”سر، میں رضا ہوں اور یہ عزیزی ہے۔“
لبے تر ٹکے نوجوان نے اٹھ کر کھڑے ہوتے
ہوئے اپنا اور کشٹی چلانے والے ملاج کا نام بتادیا
اور اس کے ساتھ ہی دونوں نے اپنے اپنے آلی

کی طرف بڑھنے لگی۔ بوٹ پر ایرانی سرچنگ
فورس کی مخصوص رینگ والی فلاش لائٹ سلسلہ حرکت
کر رہی تھی۔

ٹائپ سیکورٹی فورس نے ان کی کشٹی کو مارک کر
لیا تھا اسی لیے سیدھی ان ہی کی طرف بڑھتی چلی
آ رہی تھی۔

لانچ کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ کر کشٹی
میں موجود تمام افراد کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

انہوں نے بپھری ہوئی موجودوں میں کشٹی ڈالنے کا
یہ سک صرف اس لیے لیا تھا کہ آج پکڑے جانے
کا چانس نہ ہونے کے برابر تھا۔ مگر ان کے
اندازے اور سورس کی طرف سے مہیا کی گئی
اطلاع دونوں غلط ثابت ہو چکی تھیں۔ لانچ کسی
عفریت کی طرح ان کی طرف بڑھتی چلی آ رہی
تھی۔

”سر بے وقت کہاں سے فلک پڑے۔“ اس
لبے تر ٹکے نوجوان نے فارسی زبان میں
بڑھاتے ہوئے کہا، اور پھر ایک طرف پڑے
ہوئے بیگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بیگ کی زپ
کھول کر اس نے اندر سے جدید قسم کے ماسک
ٹکالے اور سب کو ایک ایک دینے لگا۔

”یہ چنکن کر سمندر میں اتر جاؤ کشٹی کے نیچے
والی طرف لو ہے کے کپ لگے ہوئے ہیں انہیں
کپڑا کر کشٹی سے جھٹے رہتا۔ جب فورس واپس چلی
جائے گی تو میں تمہیں واپس اور بلاں گا۔“ اس
بار اس نے صاف اردو میں بات کی تھی، مگر الجھ
تحکما نہ تھا۔

”مگر مجھے تو تیرنا ہی نہیں آتا۔“ ایک نو عمر
معصوم سے لڑکے نے اپنا مسئلہ بتایا۔

”میں نے کب کہا ہے کہ تم سکھے سمندر میں
کو جاؤ، کشٹی کے کنارے کو کپڑا کر آرام سے پانی

ڈی کارڈ نکال کر آفیسر کی طرف بڑھا دیئے۔ وہ پچھوڑ دیک کارڈ زکوغر سے دیکھا رہا اور پھر ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”رات کے اس پہر کھلے سمندر میں کیا کر رہے ہو؟“ اس نے ایک گہرا سانس لیکر آئی کارڈ واپس کرتے ہوئے پوچھا۔ اس دوران چند الکار کشتی میں موجود چیزوں کو الٹ پلٹ کر تلاشی لینے میں مصروف تھے۔

”سر، میں درگان جزیرے تک جا رہا ہوں۔“ میں جا ب کے سلسلے میں بندر عباس رہتا ہوں، جبکہ میرے والدین درگان میں ہوتے ہیں، پچھے دیر پہلے گھر سے فون پر اطلاع ملی کے میری والدہ کی طبیعت اختیانی ناساز ہے تو مجبوراً مجھے اسی وقت لکھنا پڑا۔ برادر عزیزی کی مہربانی ہے کہ اس نے مجھے درگان تک پہنچانے کی حادی بھر لی ورنہ مجھے صبح ہونے کا انتظار کرنا پڑتا۔“ رضا نے آفیسر کو قصیل سے جواب دیا۔

”مگر بندر عباس سے درگان جانے کا راستہ تو بیہاں سے چند نائلک میل مشرق کی طرف ہے تو پھر تم لوگ بیہاں کیا کر رہے ہو؟“ آفیسر نے ملکوک بجھ میں سوال کیا۔ اس دوران الکار تلاشی لینے کے بعد اسے بتاچکے تھے کہ کشتی میں کسی قسم کی کوئی غیر قانونی چیزوں نہیں۔

”سر، انہیں میں اچاک بک کوئی خرابی پیدا ہو گی تھی، کوشش کے باوجود انہیں اشارت نہیں ہو رہی تھا۔ سمندر کا مد جزر تیز ہونے کی وجہ سے لمبیں کشتی کو اس طرف دھکیل لائیں۔ اب عزیزی نے بڑی مشکل سے انہیں کو درست کیا ہے تو ہم سفر کے قابل ہوئے ہیں۔“ رضا نے بدستور اعتماد بھرے لجھے میں جواب دیا۔

”تمہیں ایسے موسم میں سفر نہیں کرنا چاہیے۔“

ریفع الدین راز

تحا۔ بہر حال میں تمہاری والدہ کی صحت یابی کے لیے دعا گو ہوں۔ ”افرنے مطمن لجھ میں کہا اور الہکاروں کو واپسی کا اشارہ کرتے ہوئے سڑھی کی طرف پڑھ گیا، جو لائچ سے کشٹی میں لکھا گئی تھی۔

ہونے پر جیرت کا ظہار کیا۔

اس دوران عزیزی انجمن کو اشتارت کر کے کشٹی آگے بڑھا چکا تھا، اگلے ایک گھنٹے میں وہ جزیرہ درگان اور کشم کو پیچھے چھوڑ کر میں الاقوایی سمندر میں داخل ہو چکے تھے۔

”شاپید وہ جہاز ہے جس میں ہمیں جانا ہے۔“ شیخ سمیل نے حامد کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے دور کھڑے ہوئے دیوبنکل کارگو جہاز کی طرف اشارہ کیا تو وہ بھی دھڑکتے ہوئے دل سے جہاز کی طرف دیکھنے لگا، کشٹی کا رخ بھی اس کی طرف تھا، ابھی وہ بچس نہ ہوں سے جہاز کی طرف دیکھی ہی رہا تھا، جب اس کے کانوں میں رضا کی گھبرائی ہوئی آواز گوئی۔

”بیڑا غرق یہ دوبارہ کہاں سے آگئے۔“
”عزیزی کشٹی کو واپس جزیرہ کشم کی طرف موڑ لو رہنا یہ ہمیں بھون کر رکھ دیں گے۔“

حامد نے چوپک کرا طراف کا جائزہ لیا تو ایک طرف سے خنی کی وہی لائچ کسی بلا کی طرح ان کی طرف بڑھتی چلی آرہی تھی، عزیزی نے جیزی سے کشٹی کا رخ موڑا اور دو اندر ہیرے میں لکیر کی صورت نظر آنے والے جزیرہ کشم کی طرف پوری رفتار سے اندر ھادھند کشٹی کو بھگانے لگا۔ لائچ کسی عفریت کی طرح ان کے عقب میں آرہی تھی، اسی دوران لاڈا اپنکرے انہیں رکنے کی وارنگ دی جانے لگی، بگر عزیزی پر اس اعلان کا کوئی اثر نظر نہیں آ رہا تھا، وہ کشٹی تو کسی جہاز کی طرح

آفیرنے لائچ کے عرشے پر پہنچ کر واپس کشٹی کی طرف دیکھا تو چونک گیا، اسے کشٹی کی سائیڈوں میں سائے سے لہراتے ہوئے محوس ہوئے، گو، وہ سائے پانی میں تھے، مگر اس کی حیز نظرؤں نے انہیں بھانپ لیا تھا، اور شاید وہ بھی اسی لیے کہ لائچ پر تے سرچ لائٹ کی تیز روشنی کشٹی پڑا الی جا رہی تھی، تمام الہکار واپسی لائچ پر پہنچ کھے تو لائچ بہلکی رفتار سے آگے بڑھنے لگی۔

آفیرن عرشے کی رینگ سے بیک لگائے کھڑا کشٹی کو دور ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا، اس کی کشادہ پیشانی پر سوچ اور فکر کے آثار گھرے ہوتے جا رہے تھے۔

کچھ ہی دیر میں سکورٹی فورس کی لائچ آگے بڑھتی ہوئی نظرؤں سے او جھل ہوئی تو رضا نے کشٹی کے نئے موجود نوجوانوں کو واپس کشٹی میں بلا لیا۔ سب فکر کر رہے تھے کہ تینی گرفتاری سے بال بال نجگے۔

”ہمیں مزید کتنا سفر کرنا ہو گا؟“ حامد نے رضا سے مخاطب ہو کر پوچھا، تو رضا چوپک کراں میں مصصومہ لڑکے کی طرف دیکھنے لگا، جسے منزل پر پہنچنے کی سب سے زیادہ جلدی تھی۔

”ہم درگان پہنچنے والے ہیں، اور پھر وہاں سے آدھے گھنٹے میں لشمن پہنچ جائیں گے، جہاں سے میں الاقوایی سمندر چند نائکل میل دور ہے، جس کارگو جہاز میں تمہیں اٹلی پہنچانا ہے وہ وہاں پہنچنے ہی والا ہے، ویسے جیرت ہے کہ تم اتنی چھوٹی

کی بات مان لیتا، اس کے ذہن میں بار بار ایک ہی خیال ابھر رہا تھا کہ اگر اسے کچھ ہو گی تو اس کی مخصوص بہنوں کا کیا بننے گا۔ اب تو ان کے سر پر چھٹ بھی اپنی نہیں تھی۔

”حامد نے پیچے جھک جاؤ۔“ اسکے دوست سہیل شیخ نے اسے زبردستی پیچے جھکاتے ہوئے کہا مگر اس کی یہ ہمدردی کسی کام نہ آئی۔

اسی لمحے ایک گولی کی یادی کو پھاڑتے ہوئے ایک شراثیزیل کی کین میں ہٹ گئی، جس کی وجہ سے یکدم آگ بہڑک اٹھی۔ ایک نوجوان نے جلدی سے کین کو نٹا نگ مار کر سمندر میں گرانا چاہا، مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے ارادے میں کام لے ہوتا کہنیں ایک دھماکے سے پھٹ گیا، اور کشی تکنکوں کی صورت تکھری چل گئی۔

☆.....☆

نیوی سلرزنے لائچ سے چند بوش سمندر میں اتارت کر مرنے والوں کی لاشیں اکھنی کرنے کی کوشش کی، جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ وہ چودہ لوگوں میں سے آٹھ کی لاشیں تلاش کر سکے تھے۔ پچھلے درمیں ان آٹھ لوگوں کی لاشیں بذریعہ اس کی بذرگاہ پر پہنچانے کے بعد انہیں تایروں میں منتقل کر دیا گیا۔

شیخ سہیل کی لاش نہیں لی تھی، جبکہ حامد کی شناخت اس کے لباس میں موجود بٹوئے میں تصویر اور ایڈریس کی وجہ سے ممکن ہوئی تھی۔ اب اس کی لاش پاکستان بھیجا جا رہی تھی۔

اس نے اپنی ماں سے جلد واپس آنے کا وعدہ بہت جلد اپناء کر دکھایا تھا، مگر فرق صرف اتنا تھا کہ وہ اپنے قدموں پر چل کر جانے کی بجائے دوسروں کے کندھوں پر سوار ہو کر جا رہا تھا۔

☆.....☆

اڑائے لیے جا رہا تھا۔

لائچ پر سے آخری وارنگ دی گئی، اور اس کے ساتھ ہی کاونٹ ڈاؤن شروع کر دی گئی، شیش سے اٹھی شروع ہونے والی کنتی جلد ہی قفری ٹوٹنے پہنچی اور فضا ہیوی مشین گن کی تر تراہٹ سے گلوچ اٹھی، گولیاں کشی کے ارد گرد پانی میں لگ رہی تھیں، شاید لائچ پر موجود الہکار انہیں صرف ڈرا دھکا کر روکنے کے موڑ میں تھے اسی لیے گولیاں براہ راست کشی کو نہیں لگ رہی تھیں۔ پچھلے درمیں جب سکیورٹی فورس والوں کو کشف ہو گیا کہ کشی میں موجود افراد ان کی وارنگ کو سمجھیہ نہیں لے رہے تو انہوں نے براہ راست فائر گک شروع کر دی۔

”عزیزی کشی روک دو ہم گرفتاری دینے کے لیے تیار ہیں۔“ حامد نے چیختے ہوئے کہا اور عزیزی کی ہاتھ سے ڈاڑیکش لیور چینیتے کی کوشش کی۔ اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے دوسرے لڑکے بھی مرنے کی بجائے گرفتاری دینے کو ترجیح دے رہے تھے۔ لے ٹکنے کے رضا کے آٹھ ہی پھرٹنے حامد کی کشی میں قلاہاز یاں لگوا دیں۔

”پکڑے جانے کے بعد تم تو بھی نہ بھی آزاد ہو ہی جاؤ گے، اگر میں ایک پار بطور انسانی امکل پکڑا گیا تو یہ فورس مجھے موت سے بھی برے حال میں پہنچا دے گی، اس لیے آرام جسے پیشے رہو۔“ رضا نے چیختے ہوئے کہا تو حامد حملہ نظر وہ سے گھور کر رہ گیا۔

اس کا گال پھٹ پکا تھا جس میں سے خون تیزی سے روس رہا تھا۔ اس کی نظر وہ میں شفیق مان اور مخصوص بہنوں کا چہرہ گروش کر رہا تھا، اسے اب شدت سے احساس ہو رہا تھا، کہ کاش وہ ان

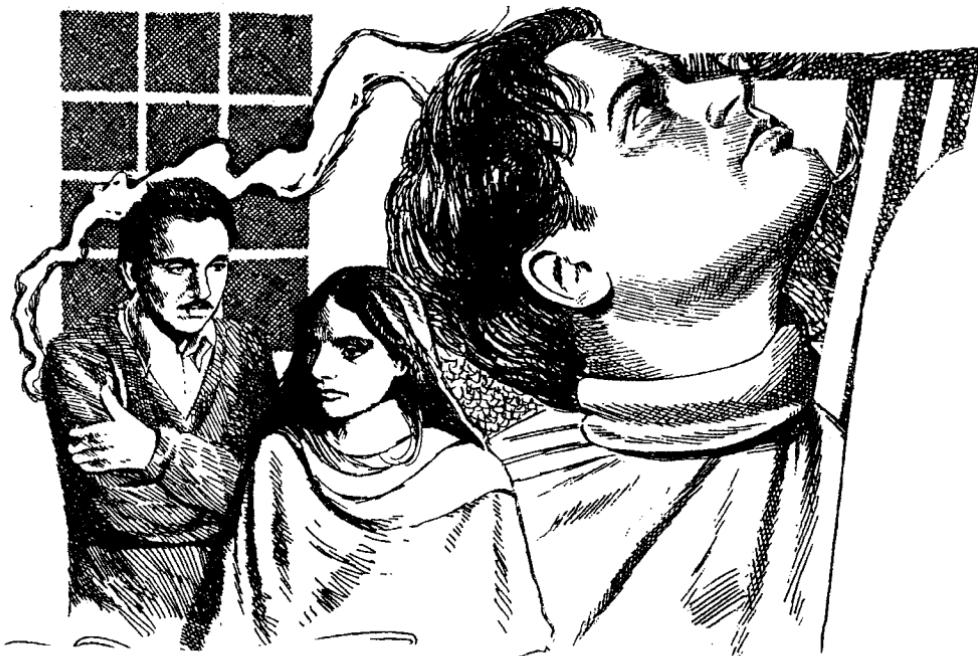
بیوی میں ہزار

علی حسین جاوید کا خیال

کب سے قائم ہے اندر ہڑوں کا سلط بھج پر
کاش بھر دے میری دنیا میں اجائے کوئی

ایں اتیاز احمد

نیاز احمد کو اپنی زندگی میں سب کچھ بہت ہوش سنبلاتے ہی اسے ایک دکان کرائے پر لے آسانی سے مل گیا تھا۔ اس کے والد بشیر احمد نے دی اور اس میں سودا بھی ڈال دیا۔ دکان چل گکی تو



کا جواب دیتے ہوئے شرم اور کھلکھل کا شکار ہوجاؤ گے تو ہمیں فیصلہ کرنے میں مشکل ہو گی۔ اس بات کا جواب تو تم نے کھٹ سے بلا دھڑک دے دیا۔ معاملہ ایک فقرے میں طے کر کے رکھ دیا اور کاروباری سلسلے میں یوں شرعاً شرعاً کر بات کر رہے تھے چیز.....”

یہ بات سنتے ہی نیاز احمد نے اپنے ماٹھے پر ہاتھ مارا اور اسے اپنی حمافت کا احساس ہو گیا۔ اور شرم کے مارے اس کا چھرہ سرخ ہو گیا۔ نیاز احمد کو چاچا طیم احمد کی بیٹی کرن پسند تھی۔ سکھر، مگر میلو، سیلقت مند اور نیاز سے دو جماعتیں زیادہ پڑھی ہوتی۔ ابھی ابھی میڑک کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی۔ نیاز احمد کے والدین کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

☆.....☆

چٹ مٹھنی پڑ ہیاہ ہو گیا، کرن جیز میں دکان بھی لائی تھی۔ یوں نیاز احمد کی خواہشون کے پیڑ بغیر عنست اور کوششوں کے ہی ہر بھرے ہوتے گئے۔ شادی کے بعد وقت کیسے پر لگا کر اڑا معلوم ہی نہیں ہوا اور نیاز احمد تین بچوں کا باپ بن گیا۔ دکان کی مصروفیت نے اسے کئی سال البحارے رکھا۔ اب اس کا کاروبار جنم گیا تھا۔ زندگی یکسانیت کے دھارے پر چل لگی۔ اس کا جی چاہنے لگا کہ وہ کرن کی دربا اور متعدد شخصیت سے لطف اندو زہونے کے زیادہ سے زیادہ موقع حاصل کرے۔ لیکن معاشرتی زندگی کا رنگ ڈھنک ایسا تھا۔ وہ اپنی یہ خواہش بھی پوری نہ کر سکا۔

اُس روز نیاز احمد دکان سے واپس آیا تو کرن کہیں جانے کی تیاری میں گلی تھی۔ وہ آج بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔

”تم اور بچے کہاں جا رہے ہو خوب بن ٹھن

اس کی شادی کی فکر ہونے لگی۔ مال چاہتی تھی اپنی بھائی کو بیاہ کر لائے۔ لیکن بشیر احمد چاہتا تھا نیاز احمد کی شادی وہیں ہوئی چاہیے۔ ”نیاز بیٹا! اب تو ماشاء اللہ بیٹیں سوال کا کام کرو گیا ہے۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہے۔ کیوں نہ تیری شادی کر دی جائے۔“ بشیر احمد نے بیٹی کی مرتب معلوم کرنے کے لیے گفتگو کا آغاز کیا۔

”ابا میرے کاروبار میں اتنا منافع شروع نہیں ہوا کہ میں کچھ جمع کر کے اپنی دکان خرید لوں۔“ نیاز نے جیپنے جیپنے کہا۔

”میں تیری شادی کی بات کر رہا ہوں تو دکان خریدنے کی بات کر رہا ہے۔“ ”دکان تو کاروبار بڑھاتی ہے۔“ اور نیاز نے شرما کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

”دکان خریدنے کے لیے تو عمر پڑی ہے، انسان ساری زندگی کاروباری جیلوں میں ہی گزارتا ہے، لیکن شادی کے لیے ایک خاص عمر مقرر ہے، وہ تکل جائے تو مسئلے کھڑے ہو جاتے ہیں۔“ والد نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ابا جیسے تمہاری مرتبی ہو کر ڈالو۔ مجھ سے کیا پوچھتے ہو، مگر شادی میں صرف کران سے ہی کروں گا۔“ نیاز نے چکنے ہوئے کہا۔ یہ بات سن کر بشیر احمد پہلے تحریر سے اُسے سکنے لگا۔ پھر یک دم ہنسنے لگا۔ ہنسنے ہنسنے اس کے پیٹ میں مل پڑکے۔

نیاز احمد خاموشی سے اپنے والد کی طرف دیکھتا رہا۔ جب بھی کا دورہ ختم ہوا تو پوچھا۔

”ابا میں نے کون سا ایسا طفیلہ سنا دیا تھا جو تم نہیں کر دہرے ہو گئے۔“

”بھی کیا بتاؤں جس بات کے پوچھنے میں ہم اتنا بچکار ہے تھے۔“ ہمارا خیال تمام اس بات

کر؟ ”نیاز نے پیار سے پوچھا۔
”صوفی کی مہندی ہے ناپرسوں“ وہیں
جاری ہے ہیں۔“

”مہندی پرسوں ہے تو کیا آج سے مہندی
اگانے کے لیے بیٹھ جانا ہے وہاں جا کر؟“
”آج ڈھونکی ہے۔“ کرن نے مسکراتے
ہوئے اور بچوں کو تیار کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے بھی لے چلو برقع پہنا کر۔“ نیاز احمد
نے بظاہر تو از راہِ مذاق ایسا کہا تھا، لیکن دراصل
وہ دل سے یہی چاہتا تھا کہ گھر آنے کے بعد ہر
پل کرن کی اعانت میں گزارئے اس سے باقی
کرے۔ جہاں وہ جائے اس کے ساتھ رہے۔
جو کچھ بھی کرے اس میں نیاز احمد بھی شریک ہو۔
لیکن یہ ایسی خواہش تھی جس کا اظہار ایک شہر
کے لیے معیوب سمجھا جاتا ہے۔ یوں کے مکثوں
سے جڑے رہنا ایک مسترع عمل سمجھا جاتا ہے۔ سو نیاز
احمد نے اپنی خواہش کا گلاد بادیا اور ایک مختنڈی آہ
بھر کر مرا جہے اندرا میں کہا۔

”کاش میں بھی تمہارے ساتھ ہی جاسکتا۔“
”اور لڑکوں میں بیٹھ کر ڈھونکی بجاتے۔“
کرن اُس کی ولی تھنا سے بے خبر اسے چیخیرہی
تمی۔

”تم لوگ جب تیاری کمل کرو مجھے بتا دینا
میں چھوڑ آؤں گا۔“
کرن اور بچوں کے جانے کے بعد گھر سونا
ہو گیا۔ نیاز احمد نے فی وی دیکھنے کی کوشش کی لیکن
اس کا دل نہ لگا۔ وہ یادوں میں کھو گیا۔ اسے وہ
 تمام موافق ایک ایک کر کے یاد آنے لگئے جب وہ
اور کرن ایک ساتھ ہونے کے باوجود بھی ایک
ساتھ نہیں ہوتے تھے۔ کسی شادی یا تقریب کے
موقع پر ہی نیاز احمد فارغ ہوتا تو اسی موقع پر کرن

کے ساتھ رہنے، اس کے ساتھ چھوٹی بڑی
مشابہتے میں آنے والی ہر چیز کے متعلق تباول
خیالات کرنے کا موقع ملتا تھا۔ کرن کی رائے
اُسے بہت دلچسپ لگتی۔ نیاز احمد کے خیال میں وہ
بہت سوچ سمجھ رکھنے والی بیوی تھی۔ جس کے
ساتھ وقت گزر انہا بہت کار آمد اور پُر لطف ہوتا تھا
لیکن بد تھتی سے شادی بیاہ کے طور طریقے اُس کی
آرزو میں ہمیشہ رکاوٹ بن جاتے۔ کرن کو
زنانے میں جانا پڑتا اور نیاز احمد کو مردانے میں
یوں تقریب کے اختتام تک دونوں ہی اپنا اپنا
وقت ایک دوسرے سے جدا گزارتے، واپسی پر
کرن تو چک چک کر کچھ یا تین ادھر ادھر کی سنا
دیتی لیکن نیاز احمد کے دل کی مکھن دور نہ ہوتی۔ صح
جلدی اٹھنے اور دکان پر جانے کے خیال سے نیند
کی گلک میں وہ اپنے دل کی بھڑاں بھی نہیں نکال
پاتا تھا۔ اگلے دن گاہوں میں مغز کھپاتا اور برصغیر
ہوئی مہنگائی پر لوگوں کے برے برے تاثرات کو
دیکھنے کے بعد اس کے پاس اس موضوع پر بات
کرنے کے سوا دوسروی کوئی بات نہ رہتی۔ یہ ایسا
خیک موضع تھا جسے کرن کے سامنے چھیڑ کر اسے
پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے عام طور پر
خاموشی ہی اختیار کرتا۔

انہی خیالوں میں کھو یادہ اپنے سماج کے رسم و
رواج پر غور کر رہا تھا کہ کسی نے دروازے پر
دستک دی۔ نیاز احمد نے دروازہ کھولا سامنے
پڑو کی لاڑکاریاں کھڑا تھا۔
”آور یا پس اندر آ جاؤ۔“ نیاز احمد نے راستہ
دیتے ہوئے کہا۔

☆.....☆

”میں آپ کو بلانے آیا ہوں“ نایلوں کی
کھدائی اور مرمت کا معاملہ ہے سب لوگ انور

ایسی اللیاں لگتی ہیں جس میں کمٹے کی ضرورت ہوتی ہے اور ڈاکٹر کے پاس جانے سے منع کر دیا جاتا ہے۔

اب نیاز احمد کو احساس ہوا کہ کرن کیوں نہیں جا رہی ہے۔ وہ بھی اس کے ساتھ تھوڑا لگا کر ہنسنے لگا۔

” بتائیں نا آپ کو کیا ہوا ہے؟ آپ کہاں گئے تھے؟ کیا کھایا؟ کیا پیا؟“

” پیا.....؟ پیا تو کچھ بھی نہیں تھا۔“ نیاز احمد نے گھبراۓ ہوئے کہا۔

ڈاکٹر کے پاس جانے سے کیوں کترار ہے ہیں بتائیے نا آخر بات کیا ہے؟“ کرن نے سنجیدگی سے کریڈنے والے انداز میں کہا۔

” کرن یہاں بیٹھو میرے قریب تمہیں مج بتاؤں۔“

نیاز احمد کے بدلتے تاثرات اور چہرے کی سنجیدگی کو دیکھ کر کرن کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ سمجھتی ضرور کوئی نامناسب بات ہے۔ کوئی تکلیف وہ صحائی ہے، لیکن وہ حوصلہ بلند کر کے ہے تون گوش ہوئی۔

” میں خالد کے ساتھ اس کے پرانے دوست کے گھر گیا۔ وہاں سمجھی شراب پینے پڑا۔ آج میں نے بھی تھوڑی سی پلی می اور میری یہ حالت ہو گئی۔ اب تم خود ہی بتاؤ اگر میں ڈاکٹر سے دوالوں گاتوبات پورے محلے میں پھیل جائے گی۔“

یہ خبر کرن کے دل پر بھلی بن کر گری۔ اس کی حالت غیر ہو گئی۔ لیکن اس نے جلد ہی اپنی کیفیت پر قابو پایا اور نیاز احمد سے دوبارہ شراب پینے کے بارے میں رائے دریافت کی۔

” میری توبہ میرے باپ دادا کی بھی تو بہ کیا

چاچا کے گھر پر جمع ہو رہے ہیں آپ بھی وہیں آ جائیں۔“

نیاز احمد اس کے ساتھ ہی باہر نکل آیا۔ ایک گھنٹے تک نالیوں کی مرمت کا مسئلہ زیر بحث رہا۔ معاملات طے پا گئے تو بزرگ اپنے اپنے گھروں کو سدھا رہے۔ چند نوجوان بڑے ٹھہرے پر بیٹھ کرتاش کی بازی لگانے لگے۔ نیاز احمد بھی وقت گزاری کے لیے آن کے قریب بیٹھ گیا۔ اسے یہ کھیل بہت دلچسپ لگا اور پھر جلد ہی اسے بھی کھلنے کا موقع مل گیا۔ اس کے بعد سے نیاز احمد کی تاش باز گروپ سے دوستی ہو گئی۔ اس کی شامیں بلا ناخنیں بسر ہونے لگیں۔ اس گروپ کا ایک بندہ خالد تو اس کا بہت ہی چیز تادوست بن گیا اور نیاز احمد کو شراب پینے کی محفلوں میں بھی لے جانے لگا۔

” آخ ر آپ نے دوست کے گھر ایسا کیا کھایا تھا جو یہ اللیاں رُک ہی نہیں رہی ہیں۔“ کرن نے فرش صاف کرتے ہوئے نیاز احمد سے کہا۔

” تم بس لیموں کا رس لے آؤ، اگر لیموں نہیں ہے تو اچار ہی دے دو۔“

” میں نے لوگ کا پانی چڑھا دیا ہے ابھی دو منٹ میں تیار ہو جائے گا۔“

” نہیں، مجھے تم کوئی کھٹی چیز دو یہ اللیاں لوگ پانی والی نہیں ہیں۔“ نیاز احمد نے ذرا چُکر کہا۔

کرن کی ہمی نکل گئی۔ وہ ہنستے ہنستے جا کر لیموں لے آئی اور نیاز احمد کو شرات بھری نظرلوں سے دیکھتی رہی۔ نیاز احمد لیموں لے کر جائشے لگا تو کرن اس کی چار پانی کے قریب ہی بیٹھ گئی اور معنی خیز مکراہٹ کے ساتھ کہنے لگی۔

” میں نے پہلی بار سنائے کہ آدمیوں کو بھی

جب نیاز احمد کو پکی شراب پینے کی عادت پڑ گئی۔
وہ روزانہ شام کو دکان سے واپس آتے ہی
دستوں کے پاس جانے کی جلدی میں ہوتا، اگر
کرن اُسے بچوں کے کپڑے یا کسی اور کام کے
لیے ساتھ چلنے کو کہتی تو وہ نال دیتا۔ کچھ رقم
زیادہ نکال کر دیتا۔

”یہ رکھ لو ٹھیکی، رکھا یا سالم تاگکہ کروالیتا
پریشانی سے نج جاؤ گی۔“ اب اُسے کرن کے
ساتھ رہنے باشی کرنے اور نہنے ہشانے کی
فرصت اور خواہش نہیں ہوتی تھی۔ وہ رات گئے
نشی کی حالت میں گھر لوٹتا اور آ کر سو جاتا۔

کرن شوہر کے شراب پینے سے بہت دکھی
تھی۔ ہر وقت اداں و مطلوب رہتی تھی۔ اس کی کچھ
میں سچے بات نہیں آ رہی تھی کہ انسان اپنے بھرے
پرے گھر کو چھوڑ کر ایک کڑوی یعنی کی چیز کے
پیچھے کیوں بھاگنا شروع کر دیتا ہے۔ آخر اسے
کون ہی ایسی خوشی میر آ جاتی ہے کون ساتھ نہاد
سرور مل جاتا ہے جو یوہی بچوں کا تم البدل ہو جاتا
ہے۔

☆.....☆

”یار بڑی عجیب چیز ہے یہ نشی مجھے تو خوف سا
محسوں ہونے لگتا ہے۔ ویرانی، خاموشی، ہولناک
ستانا چھا جاتا ہے چاروں طرف مجھے نشی کیا یہ
کیفیت برداشت نہیں ہوتی میں تو شراب پینا چھوڑ
ہی دوں گا۔“ نیاز احمد نے ایک دن اس بجوبہ
کیفیت سے بچک آ کر خالد سے کہا۔

”کیا کہہ رہے ہو نیاز احمد یا زیادا مگل ہو گئے
ہو۔۔۔ دنیا بھر کے نشی کرنے والے کہتے ہیں۔
نشی میں ایک سرور کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے تم
کہتے ہو سنا تا ہولناکی لگتا ہے تمہیں پوری طرح
نشی نہیں ہوا، بھی کم پی ہے تو تھوڑی سی اور پی لو۔“

فضول چیز ہے میں آئندہ کمی شراب نہیں پیوں گا
و عده کرتا ہوں، لیکن ایک و عده تم بھی کرو۔“
”کون سا وعدہ؟“
”تم ابا کو نہیں بتاؤ گی میں نے شراب نی
تھی۔“

” وعدہ.....“ کرن نے پہلی غلطی سمجھ کر کوئی
اہمیت نہیں دی، اس کا ذہن اس بات کی طرف
نہیں گیا کہ جس دوست نے پہلی بار پلاٹی ہے اگر
اس سے دوستی قائم رہی تو یہ سلسلہ آگے کی طرف
بڑھے گا۔ کہیں بھی رکے گا نہیں۔ ورنہ نیاز احمد
کے والد کو ضرور اس صحائی سے آگاہ کر دیتی۔ اور
وہ خرابی کے اس پودے کو گھوڑے پکڑنے سے پہلے ہی
نیست و نابود کر دیتے۔ لیکن کرن نے اپنی محبت
مخصوصیت اور لاعلی کی بنا پر والدین کو نیاز احمد
کے پہلی باشراب پینے اور شرابی دوستوں کے
یہاں جانے کے بارے میں کوئی تحریر ہونے دی
اور پھر وہی ہوا جس کا کرن کو بالکل کوئی اندازہ
نہیں تھا۔

نیاز احمد ایک شام پھر پی کر آ گیا۔ کرن کو دلی
صد سر پہنچا، لیکن نیاز احمد نے اسے بھلا کر
آئندہ بھی نہ پینے کا وعدہ کر کے اُسے خاموشی
اختیار کرنے پر منالیا۔ وہ صرف اپنے والد سے
ڈھاتا تھا۔ اُن کے احترام اور محبت کے سامنے وہ
کچھ بھی ترک کرنے کو تیار رہتا تھا۔ اسی لیے وہ
نہیں چاہتا تھا کہ والد صاحب کو اس کی شراب
پینے کی اطلاع ہو جائے۔

کرن نے اپنی وفا شماری کا ثبوت دیا اور
شوہر کے گناہوں پر پردہ ڈال دیا۔ اس بات کو
جانے بغیر کہ یہ عمل شوہر سے وفاداری نہیں بلکہ
اپنے ہاتھوں سے شوہر کے پاؤں پر کھڑا
مارنے کے برابر ہے اور پھر وہ وقت بھی آن پہنچا

وقت نہیں رہتی بس یوں لگتا ہے میرے جسم میں
بے انہا طاقت آئی ہے۔ غصہ، نفرت، جوش،
جدبہ سب کچھ بھر جاتا ہے میرے منہ سے
مخلافات نکلتی ہیں، لیکن مجھے دنیا کا خوف نہیں ہوتا،
ایک دلیری سی پیدا ہو جاتی ہے۔ دنیا تو یقینی ہے
بس جی چاہتا ہے کی کوماروں۔ خوب پیوں یا سر
چھاؤں دوں۔ اُس دن میں تائیکے والے سے اُلچھا گیا
تھا۔ حالانکہ وہ اچھا خاصا ہٹا کٹا جوان تھا۔ اگر
میں نشے میں نہ ہوتا تو اسے دور سے ہی دکھ کر گھبرا
جاتا۔ لیکن نشے میں میں نے اس کی پیٹائی کر دی۔
یاد ہے تا، پچھلے دونوں جہاں سے لڑائی ہو گئی تھی۔
میں نے اسے اتنا پارا کہ پیچا را ہلوہاں ہو گیا،
حالانکہ بات معمولی تھی، لیکن میرا جوش اور غصہ تو
نشے کا تھا۔

یوں نے یہ سب بتانے کے بعد خود لی سے
نیاز احمد کے ہاتھ پر ہاتھ را تھا۔
نیاز احمد نے تمام باتیں نہایت بے قیمتی سے
کی تھیں۔ وہ گھر جاتے ہوئے سوچ رہا تھا یوں س
شاید اپنے خواب سنارا تھا۔ ورنہ سچ نہیں میں
ایسا بھی نہیں ہو سکتا۔ شے میں تو یوں لگتا ہے جیسے
دنیا میں خوفناک سناثا چھا گیا ہے اور یہ سناثا تو ایسا
برآ ہوتا ہے کہ سیدھا دل کو پکڑتا ہے، اس سنائے کو
تڑنے والی کوئی ایک آواز ہونی چاہیے۔ مگر کیسی
آواز..... وہ یہ نہ جان سکا۔

دوسرے دن فتح کے وقت نیاز احمد کو ہمیشہ
اپنے شراب پینے کے عمل پر سرمندگی کا احساس
ہوتا۔ وہ ارادہ کرتا آئندہ نہیں پیے گا۔ بلکہ ان
دوستوں کے پاس ہی نہیں جائے گا، جہاں شراب
پینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

”بس آج سے میں اپنا وقت اپنے بیوی
پھول میں گزاروں گا،“ نیاز احمد خود سے وعدہ

نیاز احمد نے تھوڑی تھوڑی کر کے کافی شراب
اپنے اندر اٹھلی لی، لیکن اس کی کیفیت میں کوئی
تبدیلی نہیں آئی بلکہ اندر کے سنائے میں بتدریج
اضافہ ہوتا گیا۔ وہ جب بھی شراب پی لیتا، اسے
یوں محسوس ہوتا جیسے کی ویران علاقوں میں اپنوں
سے دور کہیں تھا، غار میں آ گیا ہے۔ جہاں کسی بھی
ذی روح کے پہنچنے کے امکانات نہیں جو اسے غار
سے باہر نکال سکے۔ یوں لگتا جیسے سنائا آہستہ
آہستہ اُس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اُس کا دم گھٹ
رہا ہے۔ ایسے میں اس کا جی چاہتا کسی طرف سے
کوئی آواز آئے کوئی شور بلند ہو جائے کوئی ہنگامہ
برپا ہو جائے۔ تاکہ اس ہونٹاک سنائے سے اس
کی جان پیچی رہے۔

نیاز احمد نے اپنی ان کیفیات کا اظہار کیجی
اپنے دوسرے دوستوں کے سامنے نہیں کیا۔ ایک
تو اس ذر سے کہ اس پر یقین نہیں کیا جائے گا۔
کیونکہ نشے کا مردیہ تصور صرف سرور کی کیفیت
سے وابستہ تھا۔ دوسرے نیاز احمد کی مرداگی پر
حرف آتا تھا اگر وہ کسی نامعلوم سنائے سے خوف
کا اظہار کرے، سو اس نے اپنے محسوسات کو سب
سے چھائے رکھنے کی کوشش کی، اور پھر ایک دن
ہمت کر کے اُس نے اپنے دوست یوں سے تھائی
میں پوچھی ہی لیا۔

”یار جھیں بھی نشے میں ایسا ہی محسوس ہوتا
ہے جیسے کہ میں محسوس کرتا ہوں۔“

یوں نے یہ تو نہیں پوچھا کہ نیاز احمد نہیں میں
کیا محسوس کرتا ہے، اس اپنے محسوسات اور ان
سے منسوب قسمے بیان کرنا شروع کر دیے۔

”یار مجھے تو ایک جوش سا آ جاتا ہے۔ طبیعت
میں یہ جان پیدا ہو جاتا ہے۔ جی چاہتا ہے کچھ نہ
کچھ کرڈاں، اچھا یا برا، اس کی تیزی مجھ میں اس

میں رس گھولہ۔ وہ آواز کی تلاش میں باہر گھن میں نکل آیا۔ اس نے دیکھا کرن ایک خالی چارپائی کے قریب فرش پر پیٹھی اپنے باوں سہلارہی گھی۔ ”کیا ہوا یہ آواز کیسی گھی؟“ نیاز احمد نے

پوچھا۔

”میری جیخ نکل گئی تھی۔ چارپائی بجھاتے ہوئی میرا باوں چارپائی کے پائے تلے چل گیا تھا۔“

”کیسے ادھر آؤ اندرا و مجھے بتاؤ کیسے؟“ نیاز احمد اسے بازو سے پکڑ کے اندر لے گیا۔ اس کا ہاتھ اپنی چارپائی کے پائے تلے دبا کر پوچھنے لگا۔ ”ایے.....“

”ہاں بالکل ایسی ہی، اب مجھے ہاتھ تو باہر نکالنے دین، آپ پائے پر وزن نہ ڈالیں مجھے تکلیف ہو رہی ہے ہائے اوی اللہ میں مر گئی چھوڑ دیں نیاز احمد آپ کو کیا ہو گیا؟“ یہ بلند آہ وزاری ہی تو اسے لذت پہنچا رہی تھی۔ اس نے کافی دیر تک کرن کو اذیت دینے کا سلسلہ جاری رکھا۔

صح ہوئی تو نیاز احمد کورات کے واقعات اپنی تمام جزویات کے ساتھ یاد آنے لگے۔ اے انتہائی درجے کی شرمندگی محسوس ہوئی۔ وہ اپنی پیاری اور حسن سلوک روا رکھنے والی بیوی کے ساتھ اپنے بھائی نرودے کو درست لذت آمیز پاتا رہا تھا۔ وہ مجرم تھا، کرن کا مجرم اپنے بچوں کا مجرم جو پاس کھڑے رورہے تھے اور نیاز احمد نے کرن پر ظلم سے ہاتھ نہیں روکا تھا۔

اے شراب سے نفرت محسوس ہو رہی تھی، اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا۔ وہ شراب کو ہاتھ نہیں لگائے گا، لیکن پریشانی کی بات یہ ہی کہ وہ کرن کا سامنا کیسے کرے گا۔ کیا وہ کچھ نہیں کہے گی جانے وہ لکھی ناراض ہو اسے اپنی محبت کا یقین کیے

کرتا، وہ اپنے بچھلے دنوں کو لوٹانا تھا۔ جب وہ کرن کے ساتھ اچھی اور خوبیگوار زندگی برکر رہا تھا، لیکن اس شراب نے ان کی زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔ کرن بھی اداس اور مر جھائی سی رہتی تھی۔

”کاش اس وقت کرن میرا کہاں مانگی نہیں“ جیسے غلط معاملے میں مجھ سے تعاوون نہ کرتی، یہ طریقہ وفا شعاری دکھانے کا تو نہیں ہوتا، کاش وہ مجھے سدھارنے کے ارادے سے وفا شعاری کے طور پر میرے والد کو میرے شراب پینے کی اطلاع پہنچائی ہی بار میں پہنچا دیتی تو میں اس دلدل میں اتنا ہنس جانے سے نہیں جاتا۔ اسی دلدل جس میں رہنا بھی کچھ ایسا خوبیگوار نہیں اور باہر نکلنے کا راستہ بھی کوئی نہیں۔“

دن کے وقت وہ جو کچھ سوچتا تجویز کرتا، محسوس کرتا اور ارادہ کرتا، شام ہوتے ہی بھول جاتا اور بلا ارادہ اپنی عادت کے مطابق یاروں کی محفل میں پہنچ جاتا، اور شراب کی عادت پوری کرتا۔ اسے نہ کرتے پورے دوسال گزر چکے تھے۔

☆.....☆

اُس روز وہ جلدی گھر لوٹ آیا تھا۔ کرن اپنے گھر بیوی کام کاج میں مصروف تھی۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں گیا اور شراب پینے لگ گیا۔ وہ پہنچ ہی کافی پی چکا تھا۔ لیکن اندر کا سناٹا اسے کھائے چلا جا رہا تھا۔ اُس نے اس وقت تک پہنچنے کا ارادہ کر لیا جب تک مدھوش ہو کر بستر پر نہیں کر جاتا۔ اچانک فضامیں ایک نسوانی جیج بلند ہوئی، نیاز احمد کو یہ آواز بہت اچھی لگی۔ جیسے اسے ہمیشہ اسی آوازا کا انتظار رہتا تھا۔ وہ اسی آواز اسی جیج کو دوبارہ سننے کے لیے بے جملن ہو گیا۔ جس نے ایک بار اس سنائی کو قڑ اور اس کے کانوں

خواہش پر قابو پانامشکل ہو گیا وہ اپنے مقررہ وقت سے پہلے ہی گھر چلا آیا۔ کرن اور نئے بھی جاگ رہے تھے۔ اُس نے کرن کو ہاتھ سے پکڑا اور ٹھنچتا ہوا اپنے کمرے میں لے گیا، اُس کے دونوں ہاتھ چار پائی کے پائے تلے دیے اور خود چار پائی کی پی پر بیٹھ گیا۔ کرن درد سے بلباٹھی۔ اُس کی بیج و پکارن کرتیوں سے بھی اندر آگئے۔ ماں کو اس حالت میں دیکھ کر وہ بھی چلانے لگے۔ نیاز احمد کو یہ شور و غوغاء بہت اچھا لگا۔ اس نے جلدی سے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ اس اثناء میں کرن اپنے ہاتھ پاپوں تلے سے نکال کے ایک کونے میں جا گھری ہوئی۔ بنچے اس سے لپٹ گئے۔ نیاز احمد نے کرن کو دوبارہ چار پائی کی طرف لے جانے کی کوشش کی تو پچوں نے جیھیں مارنا شروع کر دیں۔ نیاز احمد مسکرانے لگا۔ ایک جگہ بیٹھ گیا آوازوں کے دوران شراب پینے لگا، شور و صیما ہوا تو تیزی سے اٹھا ایک ہی جھٹکے میں کرن کو اپنی طرف ٹھنچ لیا۔ اس کے ہاتھ پاپوں تلے دبادیے۔ وہ کافی دریکٹ اذیت رسانی کا یہ کھیل کھیلتا ہاتھا۔

صحح ہوئی تو اُسے شرمندگی کا زیادہ احساس نہیں تھا، وہ جانتا تھا کہ کرن اسے صرف نشے کی بنا پر کیے جانے والا عمل بھوتی ہے۔ جو صحح کے وقت مجھے یاد بھی نہیں ہوتا۔ لیکن جب اُس نے کرن کے مل پڑے ہاتھ دیکھئے تو اُسے بہت دکھ ہوا۔ اُسے خود سے نفرت ہی محسوں ہونے لگی۔ اس نے کرن سے ہزاروں معافیاں مانگ لیں۔

پھر یہی سلسلہ ایک معمول بننے لگا۔ نیاز احمد ہر تیرے چوتھے روز کرن کو اذیت دیتا۔ صحح معافی مانگ لیتا۔

کرن کے اس حقیقت کو راز بنانے رکھنے کے باوجود یہ بات چھپی نہ رکی۔ لیکن کرن اپنے

دلاسکوں گا۔ نیاز احمد سوچوں میں غرق، سر نیبوڑہ بیٹھا تھا۔ ”چائے لے لیجئے۔“ اُس نے سراخا کر دیکھا۔ کرن چائے لی تکھڑی تھی۔ ”کچھ یاد بھی ہے آپ نے رات کو میرے ساتھ کیا سلوک کیا؟“ کرن نے قریبی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ نیاز احمد نے موقع غیمت جان کر فائدہ اٹھایا اور انجان بنتے ہوئے فوراً جھوٹ کا سہارا لے لیا۔ ”نہیں کچھ یاد نہیں، کیوں کیا ہوا تھا؟“ کرن نے رات کے واقعہ کی تفصیل بتائی۔ اُسے شراب پینے سے منع بھی کیا۔ نیاز احمد نے اپنی چائے ایک طرف رکھی خود کرن کے قریب فرش پر بیٹھ گیا۔ اُس نے نہایت رقت آمیز لجج میں کرن سے اپنے سلوک کی معافی مانگی۔ آئندہ بھی شراب نہ پینے کا وعدہ کیا۔ کرن کا دل تو پہلے ہی موم تھا۔ اُس نے تمام گلہنکوںے بھلا دیے۔ نیاز احمد نے دوسرے ہی دن پھر شراب پی لی تھی۔ وہ دریک دستوں کے ساتھ بیٹھا رہا۔ چاہتا تھا ایسے وقت گھر جائے جب سب لوگ سوچے ہوں۔ آدمی رات کو اپنے گھر کی دیوار پھلا لگی اور سجن میں اتر گیا۔ یہاں ٹھنچ کر اُس کا جی چاہا کرن کو جگائے۔ اُس کی آواز سننے پہلے وہ اُسے جگانے کے لیے کرن اور پچوں کے کمرے کی طرف پکا پھر ارادہ متوجی کر دیا۔ نیاز احمد نے کی حالت میں نمیر کے ساتھ لڑتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اُس نے کافی کوشش کے بعد کرن کی جیھیں سننے کی خواہش پر قابو پالیا اور سو گیا۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصہ برقرار نہ رکتا۔ اُنکے بعد اُسے اپنی ایک روز زیادہ شراب پینے کے بعد اُسے

ہاتھ دیے تو نہیں رہ سکتی نا؟“ اکبری نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”ہاں یہ تو تم ٹھیک کہتی ہو۔ اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا صبر کا پیانہ لبریز ہوا جاتا ہے۔ سوچتی ہوں نیازِ احمد کے والد کو خبر کر دوں اور خود اپنے والدین کے یہاں چلی جاؤں، بعد میں تمام بزرگ مل کر نیازِ احمد کا نشہ ترک کروانے میں تو کامیاب ہو ہی جائیں گے۔“

”درستے ہی سکی لیکن تم صحیح راست پر آگئی ہو کس جاؤ گی اپنے والدین کے گھر؟“ اکبری نے بنیادیگی سے پوچھا۔

”پندرہ دن تک پوکے امتحان ختم ہوتے ہی۔“

”بہر حال کچھ بھی ہو ذرا جلدی کرنے کی کوشش کرو۔ نشی کا نشہ راز بنائے رکھنا کوئی صحت مندرجہ نہیں، میں بھی اپنی سی پوری کوشش کر رہی ہوں کہ حکیم راہ راست پر آ جائے۔“ اکبری نے سمجھانے کے انداز میں اپنی بات ختم کی۔

شام کے وقت کرن اپنے بچوں کو پڑھاری تھی اچانک دروازے پر زور دار دستک شروع ہو گئی۔ کرن نے تیزی سے جا کر دروازہ گھولा۔

”بایتی ای کی طبیعت بہت خراب ہے آپ کو بلا بایا ہے،“ کرن کے بھائی نے ہانپتے ہوئے کہا۔ جو تو قریباً بھاگتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ کرن نے دونوں بیٹوں کو نیازِ احمد کے پاس چھوڑا اور چھوٹی بیٹی کو ساتھ لے کر اماں کی خیریت دریافت کرنے اور دیکھ بھال کرنے چلی گئی۔

نیازِ احمد نے سوچا بچوں کے بھانے میں بھی شراب پینے سے فج جاؤں گا۔ لیکن جوں جوں شام ڈھل رہی تھی اُس کی شراب پینے کی طلب بڑھ رہی تھی۔ اُس نے خاصاً اپنے پتوں کو دوسرے

خاندان یا پڑوں والوں میں سے کسی کے سامنے بھی اقرار نہیں کرتی تھی۔ بچوں کو جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتی، صرف حکیم کی بیوی اکبری اس کی ہمراز تھی وہ خوب بھی اپنے شرائی شوہر کے ظلم کی شکار تھی۔ جو نشے میں چھوٹی چھوٹی سی بات پر اُسے زد کوب کرتا تھا۔

”ہرشی بہت چالاک،“ اور اپنے مطلب کا بہت ہوشیار ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے اس کے پارے میں سب کچھ جانتا ہے اور اسے سب کچھ یاد بھی رہتا ہے، لیکن وہ نشے کی ہوں میں بہتلا ہوتا ہے اور جانتے بوجھتے ہوئے قلم رو رکھ سکتا ہے۔“ اکبری نے ایک دن اپنے تجربے کے مل پر کرن کی آنکھوں پر بندھی پیار کی پٹی کھولنے کی کوشش کی۔ ”نہیں میرا نیازِ احمد ایسا نہیں کر سکتا، اگر اسے ایک دن کا واقعہ بھی یاد ہوتا تو وہ اسی دن سے پچے دل سے نشہ کرنا چھوڑ دیتا۔“

”تمہارے اس بے شکے اعتماد کی وجہ سے ہی تو اسے ڈھیل لمحی جا رہی ہے۔ اسے معلوم ہے وہ کچھ بھی کرنے تم اُسی کی دلیل پر پڑی رہو گی۔“ اکبری نے جل کر کہا۔

”اکبری ایسی بھی کوئی بات نہیں،“ اگر نیازِ احمد نے مجھے کسی دن بھولے سے بھی یہ اشارہ کر دیا ہوتا کہ اُسے رات کا واقعہ یاد ہوتا ہے تو میں اُسی دن اس کے گھر سے چلی جائی۔ اور اس وقت تک واپس نہ آتی جب تک وہ نشہ ترک نہ کر دیتا۔“ کرن نے نہایت جوشیلے لمحے میں اپنی سیلی کو جواب دیا۔

”کاش نیازِ احمد بھائی اتنی سی مخصوصیت دکھا جاتے، اتنی سی غلطی کر جاتے کہ تمہیں اصل حقیقت سے آگاہ کر دیتے شاید اسی بھانے تمہارا اگر مزید جائزی سے فج جاتا۔ آخر تم زندگی بھر پائے تسلی

ہو گئی۔ نیاز احمد یہ آوازن کر اندر کی طرف بھاگا۔ جو مظفر اس نے دیکھا تا قابل پی دید تھا۔ بیٹھے کی اکڑی ہوئی لاش پنگ پر پڑی تھی۔ رات کا تمام واقعہ اپنی باریک تفصیل کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ وہ سکتے میں آ گیا۔

شام کو جنمازہ دنادیا گیا رات دس بجے کے قریب نیاز احمد کے حواس درست ہوئے۔ وہ غم کے مارے اپنا سر پینچنے لگا۔ اپنی جان لینے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ خود کشی کر کے مر جانا چاہتا تھا۔

” مجھے چھوڑ دو، مجھے مر جانے دو میں قاتل ہوں قاتل کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں میں نے زہر پلا کر اپنے پیچے کو مارا ہے۔ وہ زہر جس نے میری محنت اور عقل دنوں بہادر کر دیں شراب پلا کر مارا ہے میں نے مجھے پولیس میں دے دو میں قاتل ہوں ظالم ہوں میں نے کرن پر بھی مسلسل ظلم کیا ہے۔ مجھے ایک نہیں کئی سزا میں دو۔ مجھے صرف ایک بار نہیں کئی بار پھاسی چڑھاؤ میں مجرم ہوں۔ اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا مجرم ہوں۔ میں زندہ نہیں رہوں گا۔ مجھے مر جانے دو خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔“

پولیس آئی معاملہ رفع و فتح کروادیا گیا، لیکن غمیری کی عدالت نے نیاز احمد کو بری الذمة قرار نہیں دیا۔ وہ رورک خدا سے معافیاں مانگنے لگا۔ کرن کے بیووں میں لوٹنے لگا۔

” مجھے معاف کرو دیا کوئی سزا دو۔“

☆.....☆.....☆

اس واقعے کو چند رہ سال بیٹے ہیں، لیکن نیاز احمد نے خدا سے معافی مانگنا ترک ٹھیں کیا ہے۔ وہ عبادت گزار ہو چکا ہے۔ اور ہر پل خدا سے معافی کا طلب گارہتا ہے۔

☆.....☆.....☆

کاموں میں الجھانے کی کوشش کی لیکن بے سود آٹھ بجے کے قریب دونوں بچوں کو ساتھ لے کر واشن شاپ پر پہنچ گیا اور اپنا نشہ خرید لایا۔ دونوں بیٹوں کو سلاکر خود شراب پینے بیٹھے گیا۔ کافی دیر بعد اس نے دیکھا اس کا بڑا بیٹا دروازے میں گھبرا جھاک رہا ہے۔

” پیو گے؟“ نیاز احمد نے پوچھا۔

” ہاں.....“ بیٹا آگے بڑھا آیا۔

” کڑوی ہوتی ہے۔“

” دوں بھی تو کڑوی ہوتی ہے۔“

نیاز احمد نے قہقہہ لکایا اور بیٹے کو شراب پیش کر دی۔ بچے نے غٹا غٹت لی لی، تھوڑی تھوڑی دیر میں اس کی حالت بگڑنے لگی اور وہ ترشیزے لگا۔

نیاز احمد اس کی یہ حالت دیکھ کر ایک دم گھبرا گیا اور پیچے کو اپتال لے جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اسے اپنا دوسرا جوتا نہیں مل رہا تھا۔ وہ چار پائی کے پیچے جھکا جوتا تلاش کر رہا تھا کہ بچے نے سینے اور پیٹ کی جلن کے مارے چلانا شروع ہجے کر دیا ان چیزوں کا سنتا تھا کہ نیاز احمد نے اپتال جانے کا پروگرام کیشل کر دیا۔ اس نے مزید بچیں سننے کی خواہش میں ایک گلاس اور شراب بیٹھے کے منہ میں زبردست انبٹیل دی۔ پیچے چلا چلا کر بے ہوش ہو گیا۔ نیاز احمد بھی بیٹھاں ہو کے سو گیا۔

کرن نے صبح گمراہ کرس کے لیے ناشتہ تیار کیا۔ وہ رات بھر سے جا گی ہوئی تھی۔ پچھے دیر سونا چاہتی تھی چھٹی کا درن تھا۔ اس نے سوچا سب کو ناشتہ کرو اکرسو جائے گی۔ نیاز احمد خاصی دیر کے بعد اٹھا کر نے کئی بار پوکو آواز دی لیکن وہ اٹھا نہیں حالانکہ وہ تو ایک آواز پر اٹھ جاتا تھا۔ نیاز احمد کو ناشتہ دے کر وہ خود سے جگانے لگی اور بیٹھے کو دیکھ کر ایک دل دوز جیج مار کر وہیں بے ہوش

الحسناں کی فرمائش

احضر اکاہیل

بھی دل تھا کہ ترستا تھا مرام کے لیے
اب بھی ترک تعلق کے بہانے مانے

ملک عاشق حسین ساجد

یادیں کیسی بھی کیوں نہ ہوں دل و دماغ پر اپنا مسودہ رہتا ہے اور اگر تن ہوں تو زندگی کا ہر ایک اثر ضرور چھوڑتی ہیں۔ یادیں ٹکلفتے ہوں تو دل لمحہ اذیت و کرب میں چلتا بھاری گزرتا ہے اور اسی



طرح زندگی میں کبھی شرمندگی کا کوئی واقعہ رونما ہو جائے تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ احساسِ ندامت کا تاثر بکھی پچھا نہیں چھوڑتا۔ ایسا ہی ایک واقعہ پیچی کہانیاں کے باذوق قارئین کرام کے لیے پیش کر رہا ہوں۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں ملٹان شہر کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں نیا نیا ڈپنسنر مقرر ہوا تھا۔ ڈاکٹر ارشاد صاحب جو میرے استاد محترم تھے ایک اچھے ڈاکٹر ہونے کے ناطے سے ایک ہمدردانہ بھی تھے۔ اس لیے صرف مجھ سے نہیں بلکہ ہر ایک سے مشفقات رہیں رکھتے تھے۔ جن کی وجہ سے میں اسپتال میں شوق اور لمحجی سے کام کرتا تھا۔

اس اسپتال میں کام کرتے کرتے کافی شب وروز بیٹت گئے۔ بوقت شبینہ میں اسپتال سے کچھ دور ایک مکان میں رہتا تھا۔ اسی محلے کے کافی لوگوں سے میری شناسائی ہو گئی جن کے حسن سلوک سے میں جلد ہی متاثر ہو کر محل مل گیا۔ پھر اسی محلے کے ایک طالب علم ارشد سے میرادوستی کا رشتہ قائم ہو گیا۔ ارشد بہت مخلص تھا۔ وہ تعطی مصروفیات سے فارغ ہو کر شام کے وقت کپ شپ لگانے کے لیے آ جاتا اور مجھے اکیلا پریشان نہیں ہونے دیتا تھا۔ یوں میرا وقت بہن، اچھا گزرتار ہا۔

اسپتال میں روزانہ صحیح آٹھ بجے چار لڑکیاں میری نظر وہیں سے گزرتیں۔ وہ روز اسپتال کی بالائی منزل کو جاتیں اور واپسی پر ایک لڑکی کا اضافہ کیے زنے سے اترتیں ہاتھوں میں کتابیں لیے اسکوں چلی جاتیں۔ یہی اُن کا روزانہ کا معمول تھا۔

ان ارباب خمسہ میں سے ایک مخصوص اور

گلاب چہرہ سارا دن میری آنکھوں کے سامنے گھومتا رہتا۔ وقت گزرتار ہا آخرو ہی مخصوص سا چہرہ میری مبتاق نہ ہوں کے ذریعے میرے دل میں اپنا گھر کر گیا۔ آنکھیں اس کو دیکھنے کے لیے ہر وقت پیتا رہتیں۔ ایک بار دیکھنے کے بعد سارا دن بے کلی سی رہتی۔ روزانہ ارشد صاحب جس سے وہ مغمومیت استفسار کرتا تھا میرا جواب ”بس کچھ نہیں“ تک مدد و در ہتا۔ آخر ایک رات مجھے ارشد نے عالم جنون میں بیٹھا ہوا دیکھ لیا۔ دبے پاؤں آتے ہی کہنے لگا۔

”ارے مجتوں صاحب! خیریت تو ہے کہیں محبت کا روگ تو نہیں لگ گیا کیا؟ بابراؤگ محبت جھیلنا تھا رے بس کا کام نہیں اس دھنے کو چھوڑو۔“

میں نے یہ سب سن کر اسے بیٹھنے کو کہا اور چائے کا پوچھا۔ گروہ میرے سنبھیہ پن سے متاثر ہو کر میرے اندر غور سے جھانکنے لگا پھر تھوڑی دیر بعد کہا۔

”تمہیں کیا پریشانی ہے؟ اگر مجھے اپنا سچا دوست سمجھتے ہو تو مجھے اور بلا مبالغہ بتا دو۔ کیونکہ تمہاری پریشانی مجھ سے نہیں دیکھی جاتی۔“

میں نے صورت حال آشنا تی کرنے سے گریز کرنے کی کوشش کی تھر اس کے تقاضائے سوال اور اصرار نے مجھے بے بس ہو کر سب کچھ بتانے پر مجبر کر دیا۔ آخر میں نے سب کیفیات اس کے سامنے آٹھ کار کر دیں اور وصالی جاں کی تکلی کو بجھانے کی مدد چاہی۔ اس نے بڑی ہمدردی سے ہاں کر دی اور کہا کہ کل مجھے اس لڑکی کی شکل سے شناسائی کرنا میں ہر ممکن تم دنوں کو قریب لانے کا حرپ اختیار کروں گا۔ یہی کہہ کر

مینارِ نور

ایک دفعہ ایک دہریے سے حضرت مالک بن دینار کا مناظرہ ہوا۔ بڑی دری تک بحث ہوئی لیکن دہریہ قائل نہ ہوا بلکہ بالآخر اس پر فصلہ ہوا کہ دونوں آگ میں ہاتھ ڈالیں جس کا تمہ جل جائے گا اس کو راہ باطل پر سمجھا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اقتدار خداوندی سے کسی کا بھی ہاتھ نہ جلا لوگوں نے اس فیصلے کے مطابق دونوں کو برابر جانتا۔ اس پات پر آپ بہت دلکش ہوئے اور سرخود ہو کر عرض کی کہ اے اللہ! 70 ستر برس کی عبادت دریافت کے بعد اس دہریہ کے برابر ہی آسکا۔ آواز آئی۔ ”تجھے حقیقت کا پتہ نہیں یہ محض تیرے ہاتھ کی برکت تھی کہ اس کا ہاتھ نہ جلا اگر وہ تہذیالتا تو ضرور اس کا ہاتھ جل جاتا۔“

حسن انتخاب: اشعر ظفر۔ کراچی

”آپ ارشد کی.....؟“ میں نے پوچھا تو جواب ملا۔ ”جی ہاں میں ان کی چھوٹی بہن ہوں کیوں خیریت؟“
اس فقرے نے میرے پاؤں سے زمین کھال لی۔ میرے ذہن میں سوچوں اور پریشانیوں کا طوفان برپا ہو گیا۔ میں احساسِ ندامت کے سینے میں شرابو ہو گیا۔ فوراً بخیر بیٹھے اور بنا جواب کے واپس چلا آیا۔ وہ نہ جانے کیا کچھ کہتی رہی، لیکن میں بالکل نہ رکا۔ سیدھا استیال پہنچا معمول بہانہ بنا کر چھٹی لی جو با آسانی مل گئی۔ مکان پہنچ کر سامان اٹھایا اور سیدھا گھر کا رخ کیا اور آج تک وہاں واپس نہیں گیا ہوں۔ اس واقعہ کو بیتے بہت عرصہ ہو گیا ہے۔ گمراہی تک میں احساسِ ندامت کے بھاری بوجھ تملے باہو ہوں۔

☆☆.....☆☆

ارشد نے اپنے گھر کی راہ لی۔ اور میں اپنی محبوبہ کے حسین تصور میں لیٹ گیا اور دری تک میری آگہ نہ گی۔ اگلی صبح میں اسپتال پہنچ گیا۔ ارشد بھی وقت مقررہ پرو ہیں آگیا۔ وہ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ وہی لڑکیاں حسب معمول خرماں خرماں بالائی منزل کو چل جاہی تھیں۔ میں نے اشاروں ہی اشاروں میں اپنی من پسند کے بارے میں عقدہ کشائی کر دی۔ ارشد پر سکون کیفیات میں مجھے یہ آئہ کہ چلا گیا کہ کل وہ میرے لیے نویدِ سرست لائے گا۔ اور پھر کل کے انتظار میں دن اور رات بیت گئے۔ اگلی شام ہو گئی مگر ارشد نہ آیا جس سے مجھے پریشانی ہوئی۔ دوشب و روزگز رگئے مگر ارشد نہ آیا۔ خوب انتظار کیا مگر اس کے آنے کی آہٹ تک نصیب نہ ہوئی۔

تیرے روز کو چھوڑ کر چوتھے روز میں نے ارشد کے گھر جانے کا قصد کیا سوچا کہ وہیں جا کر ٹھکوہ کرنے کے بعد اس کا جھوٹا قول بھی اسے یاد دلاوں گا۔ میں یہی سوچتے اس کے گھر کی راہ لی۔ دیے تو ارشد نے بہت بار مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی مگر میں دن کو تھکا ہارا ہونے کی وجہ سے بھی نہ جاسکا تھا۔ آج پہلی مرتبہ اس کے گھر پر پہنچا تو دروازے پر دستک دینے کے کچھ دیر بعد دروازہ کھلا تو میں خوکی سے پھولے نہ سما یا تھا۔ وہی مقصوم اور حسین ولغیرہ چڑھ میرے سامنے تھا۔ میں نے سمجھل کر شاشی سے کہا تھا۔

”ارشد صاحب سے ملتا ہے، میں ان کا دوست اختر ہوں۔“ میں ایک ہی سائیں میں سب کچھ کہہ گیا تو جواب میں اس نے کہا۔

”آپ ادھر بیٹھک میں تشریف رکھیں۔ ارشد بھائی ابھی آنے والے ہیں۔“

محبت نمبر

طويل کہانی نمبر کی شاندار پذیرائی کے بعد نئے سال میں آپ کے لیے ایک اور تخفہ محبت نمبر ماہ مارچ کا شمارہ محبت نمبر ہوگا۔ وہی محبت کی وارداتیں، محبت کی گھاتیں، محبت کی فتح اور محبت کی ناکامی سے جڑی وہ کہانیاں، جن سے اب ادم اپنی زندگی میں ضرور گزر رہو گا۔

جی ہاں! کچی کہانیاں کاماہ مارچ کا شمارہ **محبت نمبر** ہو گا

پُرسار کہانی نمبر

خوف اور دھشت میں لپٹی چیزیں یا ارواح خبیثہ کا شاخانہ بننے والوں کی کہانیاں، فراغت کی سرز میں سے، اسرار بھرے راز عیاں کرتی خصوصی داستانِ حیرت، پوشیدہ دنیا سے بہت خاص طسم کدے میں قید کرتی وہ کہانیاں جو آپ کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔

تو پھر دیکھ بات کی ہے.....

ماہ فروری میں پُرسار نمبر اور ماہ مارچ میں محبت نمبر کی کاپیاں آج ہی بک کرالیجیے۔

ایمینٹ حضرات نوٹ فرمائیں۔

چی کہانیاں کافروری 2018ء کا شمارہ پُرسار نمبر ہو گا

کچی کہانیاں کا مارچ 2018ء کا شمارہ محبت نمبر ہو گا

چوتھی چشم

محمد احمد قاسم خاں کی فتوح

وہ میری ذات کے سب رنگ لے گیا تین
بس اپنی یاد کا رنگ ملال چھوڑ گیا

نیم سکینہ صدف

کھلو نے تو ہوتے ہی پیس ٹوٹئے اور بھرنے کیا۔ ذرا سی خیس لگی اور ٹوٹ گئے۔ ویسے بھی ہر کے لیے اور پھر مٹی کے کھلو نے ان کی بساط ہی چیز اپنی اصل کی جانب لوٹتی ہے۔ لوٹنا چاہتی ہے۔



تحت ہو گیا تھا جس پر صائمہ کی شابی یادیں کسی
شہزادی کی طرح آج بھی برآ جان تھیں۔

عمر کی ستر بیڑھیاں اتنے کے بعد صحت
بینائی، حافظہ سب بیگانے ہو جاتے ہیں مگر
چوہدری اسد کے حافظے میں گزرے ہوئے دن
پل پل زندہ تھے اور صائمہ جگنو کی طرح اُس کی
پتوں پر بھی رہتی تھی۔ محبت کا یہ عالم تھا کہ چوہدری
اسد کی ہر گفتگو میں صائمہ کا ذکر ضرور شامل ہوتا
کہنی پار تو پیشیاں چڑک رہتیں۔

”بابا! اُس عورت کا ذکر پار پار کیوں کرتے
ہیں جو آپ سے بے وفائی کر کے ایک غیر مرد کے
ساتھ فرار ہوئی۔“

”بیٹی! وہ اُس کا اپنا فصل تھا اور یہ میرا ماں کو
کچھ نہ کہو ماں تو پھر ماں ہوتی ہے۔ اولاد پر اس
کے بڑے حقوق ہیں۔“

”محبے تو نفرت ہے اُس ماں سے جو ہم
جز داں بہنوں کو یالنے میں چھوڑ کر بھاگ گئی۔“
”قامت کا لاملا کون نال سلتا ہے بیٹی۔“ وہ
ہر بار صائمہ کی بد جعلیٰ قوست کے خاتمے میں ڈال
کر بیٹیوں کو چکرداریتے تھے۔

چوہدری اسد بھی بھی سوچتے جو کچھ ہوا اس
میں صائمہ کیا قصور تھا، اندھیروں سے روشنی کا
سمجھوتہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں اور اب تو
صائمہ کے ہاتھوں لگائے ہوئے آنکھیں کے تمام
درخت بلند ہو چکے تھے اور درخت کے ہر پتے ہر
پھول، ہر شاخ پر صائمہ کا بیسرا تھا۔ اُسی کی حکومت
بھی۔ اُسی کا راج تھا۔

”اری اواریشا! میری چلم کی آگ بجھنی۔“
انہوں نے آواز لگائی۔

”آئی بابا۔“ بوڑھی ملازمہ ماتھ میں کڑھی
پر دیکھتے ہوئے کوئے لیے چوہدری اسد کے

ہرشے کی حقیقت فتا ہے۔ چوہدری اسد اپنے
والان کے ویسے وغیرہ یعنی تخت پر بیٹھے سوچ رہے
تھے۔ کیا واقعی یہ تخت بھی فانہیں ہو گا؟ یہ تخت جس
کے اردو گرد ہر پل پاروں کا بازار سجادہ تھا ہے۔ ٹوٹا
کیوں نہیں اور فتا بھی نہیں ہوتا، شاید یہ بھی فانہیں
ہو گا، کیونکہ فنا ہونے والے کچھ لوگ لا فانی اشیاء
چھوڑ جاتے ہیں۔

اس تخت سے چوہدری اسد کا رشتہ کیا تھا یہ تو
وہی جانتے تھے یا پھر وہ جو تعمیر و تخریب پر قادر ہے
وہ تو بُس اتنا جانتے تھے کہ اب سے سانحہ بر س
پہلے جب وہ صائمہ کو بیاہ کر لائے تھے تو اُس کے
جنہیں میں چاندی کے پائیوں والا یہ تخت بھی شامل
تھا۔

شرع شروع میں اسے کسے مکان میں
چاندی کا تخت انہیں ہر لمحہ اپنی چم مائیکن کا احساس
دلاتا رہا، انہیں یہ تخت دیکھ کر کوفت ہوتی مگر کچھ
روز بعد اچانک ہی انہوں نے محسوس کیا وہی
ناپسندیدہ تخت اُن کے دل میں جگہ بنانے لگا
ہے۔

ہوایوں کہ اُس روز چوہدری اسد نے اپنی
نویاہتا بیوی صائمہ کو تخت پر کچھ اس طرح دراز
دیکھا کہ دیکھتے ہی رہ گئے، اُس کی آنکھیں بند
تھیں۔ سر ہانے کی جانب لبے اور لشی پال تخت
کے بیچ فرش پر بکھرے پڑے تھے رخسار پر سیاہ
تل رسم کی طرح لپٹا ہوا تھا اور گلابی یاؤں میں
چاندی کی پازیب اپنے خوابیدہ نغموں کو تھپک رہی
بھی، حسن و مجال سے مزین صائمہ پر کسی مزید
قیامت ڈھار رہی تھی، منظر نکا ہوں سے پھل کر
باطن میں اتر جائے تو بھی دھنڈ لانہیں پڑتا۔ یہ
انہی حسین لمحوں کا کرشمہ تھا کہ چوہدری اسد کے
لیے مگر کی تمام اشیاء سے زیادہ محبوب صرف وہ

اپنی جوانی کا پورا گلشن قربان کیا تھا۔
بہت ہی خوبصورت اور کم عمر صائمہ بیاہ کر آئی
تو مام کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا تھا۔ حسین و بنیل بھو
پا کر اس کے خوابوں کی تعبیریں بر لمحہ رفص کرتیں
چاند کا گلکرا کہتے منہ تھلتا اور چوہدری اسد تو چاند
کہہ کر ہی مخاطب کرتے، مگر دل ہی دل میں یہ تمہی
کہتے۔

”صائمہ تم میرے آنکن کا وہ چاند ہو جے
دیکھ کر میرے طاق کا دیا ہر لمحہ شرمند رہتا ہے۔“
شادی کو ایک سال گزر گیا تھا۔ صائمہ اب
سو لے سال کی ہو گئی۔ سول سال کی عمر جذبوں کی
زبان سمجھنے لگتی ہے۔ یہی سوچ کر چوہدری اسد پر
ایک خوف طاری تھا کہیں دنوں سے صائمہ کچھ
اداں اداں اور سخیدہ بھی نظر آ رہی تھی۔

”کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی چاند؟“
چوہدری اسد صائمہ کے قریب آ کر بولے
تھے تو صائمہ نے انہیں اس طرح چونک کردیکھا تھا
جیسے کہہ رہی ہوں۔

”میں بچی نہیں ہوں سب بھتی ہوں۔“
”کیا کہنا چاہتی ہو بولو؟“ جواب میں صائمہ
کی نظریں اٹھیں اور جھک گئیں۔
چوہدری اسد کو کا کوئی تیر تھا جو سیدھا اُن کے
دل میں اتر گیا۔ وہ تملک کر رہے گئے اور پھر تھوڑے
ہی دنوں میں چوہدری اسد نے محسوس کیا کہ
صائمہ کی زلفوں کی خوبیوں اُن کے گھر کی چہار
دیواری پار کرنے لگی ہے اور ان کے آنکن کے
پیڑ پودوں اور پھلوں پر نت نئے بھنورے
منڈلانے لگے ہیں۔

وہ سخت ابھسن میں تھے اور جانتے تھے کہ
خوبیوں کی قید نہیں کی جاتیں بھنورے گرفتار نہیں
ہو سکتیں بار ارادہ کیا کہ اس بارے میں صائمہ کو

سامنے ہانپتی ہانپتی آن کھڑی ہوئی۔
”لا بیٹی لا۔“ چلم کو آگے بڑھاتے ہوئے
چوہدری اسد بولے۔

”اس میں بھروسے۔“
”بابا کیوں پیتے ہو اتنا حق؟ جانتے ہوتا یہ
سخت نقصان وہ ہے تمہارے لیے۔“

”نقسان! بیٹی انسان تو روز اول سے
خسارے میں ہے۔“

”کیسی بائیس کرتے ہو بابا، میری تو کچھ بھجو
میں نہیں آتا۔“

”وقت سب کچھ سکھا دے گا، جا پنا کام کراور
ہاں سن طاہرہ سے ایک گلاس پانی بھجو۔“ خادمہ
بغیر جواب دیے خاموشی سے سر جھکائے دالان
سے باہر نکل گئی۔ وہ ہر وقت ایک ہی سوال کا
جواب دے دے کر تھک چکی تھی، چوہدری اسد پر
وقت بیٹیوں کی صدالگاتے اور خادمہ انہیں بتاتی
کہ اُن کی بیٹیاں یہاں نہیں پر آئی ہو کر اپنا گھر
آبادر کرچکی ہیں۔

چوہدری اسد کی دھنڈلاتی آنکھیں ہزار گز
کے سوچ و عریض آنکن کا گوش گوشہ تلاش کرتیں
اور پھر امگنت چیختے سائے منظر میں آجائیں
ہو جاتے۔ صائمہ اپنے سنبھرے ریشمی بالوں کو
سکھاتی ہوئی سخت پر جلوہ نما ہو جاتی، کہیں مٹی کے
گھروندے بناتی ہوئی طاہرہ اور اریشہ کی بچکانہ
نوک جھوٹک ساعت کو جھنجھوڑتی، آنکن کے ایک
سرے پر چھوٹی سی کوٹھڑی میں مصلے پر بیٹھی ہوئی
بوزھی مان بادل کے سفید نکڑے کی طرح چمکتی
ہوئی دکھائی دیتی یہ ساری سفیدی باپ نے ماں کو
سو غات میں دی گئی، جس پر ماں نے آخری دم
تک کوئی رنگ نہ چڑھنے دیا۔ وہ اپنی ماں کے
اکھوںتے بیٹے تھے اور ماں نے ایک پھول کے لیے

تینیہ کریں مگر یہ سوچ کر سہم گئے اگر صائم نے یہ پوچھ لیا کہ مجھ سے منہ موڑ کر کیوں سوتے ہو؟ تو کیا جواب دیں گے؟ مگر یہ آنکھ پھوپھی آخر کم تک چلے گئی ایک دن تو یہ بات ظاہر ہو کر رہے گئی یہ سوچ کر چوہدری اسد نے اپنی تمام تر خود اعتمادی کے ساتھ یہ فیصلہ کر ہی لیا کہ اب صائمہ کو مزید اندر چھرے میں نہیں رکھیں گے۔

”غور سے سنوا جو میں کہہ رہا ہوں میں کسی عورت کے قابل نہیں۔ تم سے اس لیے چھپا کا کر میں تم سے بے حد پیار کرتا ہوں میں تمہیں کسی بھی حال میں کھونا نہیں چاہتا۔“ اس انکشاف کے بعد صائمہ پر ایک بندیاں کیفیت طاری ہو گئی اور کافی دریکٹ وہ بے ہوش رہی صائمہ کے نرم بالوں میں الگیاں پھیرتے ہوئے چوہدری اسد بولے۔

”تمہارا غم میرا غم ہے صائمہ آؤ آج ایک فیصلہ کریں۔“

☆.....☆.....☆

بُن اچا کنک ہی چوہدری اسد کے ایک نہایت ہی قریبی دوست قیصر علی کا حوالی میں بہت زیادہ آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ جس کے لیے دن اور رات کے حوالے سے کوئی وقت مقرر نہیں تھا اور نہ ہی گھر میں چوہدری اسد کی موجودگی!

وقت کا پرندہ اپنی مخصوص رفتار سے اڑان بھر رہا تھا کہ ایک روز چوہدری اسد کی حوالی کے دروازے پر غریبوں کے لئے مٹھائی کپڑے اور نقد رقم تقسیم ہوئی تھی اور حوکمی کے اندر اس کی جڑوں بیٹھیوں کی پیدائش کا جشن منایا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

وقت کے پرندے نے مزید اڑان بھری تو وہ وقت بھی آگیا جب قیصر علی کے گھر والوں نے اس کی شادی کی بات اس کی ایک خالہ زاد سے

دریوزہ گر بھکاری

☆☆☆

دوستو بے کار کوش مت کرو
سامنے آجائو سازش مت کرو

مدی ہیں ہم نہیں دریوزہ گر
حق ہمارا دو نوازش مت کرو

کہہ رہا ہوں خط سے بھی کام لو
یہ نہیں کہتا کہ خواہش مت کرو

جو جہاں پر ہے تھہر جائے وہیں
جلدہ گر ہے حسن جنبش مت کرو

کل کہا مسلم سے اک ماح نے
خود نمایاں ہو نمائش مت کرو

☆☆☆

مسلم سلیم (بھوپال؛ اٹھیا)

سکی جب سے ہوش سنگھلا ہے آپ کو ہر وقت
ماں کا ہی قصیدہ پڑھتے ناہے اور سب سے زیادہ
دکھ اس بات کا ہے کہ آپ نہ اچھا کھاتے ہیں نہ
اچھا پہنچتے ہیں، حولی کے آرام دہ کروں اور
بستر وں کو ترک کر کے دالان میں دھوپ کی لپک
اور تپش میں اس تخت پر پڑے رہتے ہیں میں
پوچھتی ہوں کیا دیا یا اس تخت نے اور تخت والی
نے آپ کو؟ کیوں اتنی محبت کرتے ہیں اس تخت
سے؟ کیوں اس پر بیٹھے ہوئے اپنی بوڑھی ہڈیوں کو
اذیت دیتے ہیں؟“

”بس کر بیٹی! تجھے کیسے سمجھاؤں کہ کچھ دکھ
ایسے ہوتے ہیں جن میں سکھ کا احساس ہوتا ہے
اور پھر بے وفائی کرنے والوں سے کیا گلے.....
حیون کے اس لبے سفر میں کون کسی کا ساتھ دیتا
ہے ٹو بھی تو ایک دن اس بوڑھے باپ کو چھوڑ کر
اپنے گھر چلی جائے گی۔

ہم سب ٹرین کے مسافر کی طرح ہیں اپنے
اپنے ایشیان پر اترتے رہیں گے، یہی نظام قدرت
ہے۔“

اور جب بیٹیاں اپنے اپنے گھر چلی گئی تھیں تو
چوہدری اسد کو ان کے چلے جانے کا جیسے یقین ہی
نہ آیا تھا، ہر وقت پکارتے رہتے بھی طاہرہ کو ہمی
اریشا کو مگر اس وست و عریض حولی میں صرف ایک
بوڑھی خادمہ ڈولتی پھرتی نظر آتی اور وہ ہر پانچ
دس منٹ بعد چوہدری اسد کو یقین دلانے کی
کوشش کرتی کہ بیہاں اریشا اور طاہرہ اب نہیں
رہتیں۔

ایک صبح جب آسمان پر پرندوں نے سفر کا
آغاز کیا بھنوڑے پھولوں کے نزدیک آئے
ہواوں نے گلشن کو صبح بخیر کہا اور مشرق کی جانب

پکی کردی تھی لیکن قیصر علی اپنی شادی کے فیصلے سے
قطعاً خوش نہیں تھا اور کچھ ایسا ہی حال، یا معاملہ
سامنہ کے ساتھ بھی تھا۔

☆.....☆

یہ قیصر علی کی شادی سے صرف تین روز پہلے کی
بات ہے اُس کی چوہدری اسد کی حولی میں آمد
ہوئی تھی اور وہ اُس وقت صائمہ کے ساتھ بیٹھا
اُس کے لیے گھر، والدین، عزیز رشتہ دار گاؤں
بیہاں تک کے ضرورت پڑنے پر زندگی کو چھوڑ
دینے کی بات بھی کر رہا تھا۔ مگر وہ دونوں اس
بات سے بے خبر تھے کہ کوئی کمرے کی بند کھڑکی
سے کان لگائے وہاں ہونے والی تمام باتیں سن
رہا ہے۔ اور پھر اگلے روز قیصر اور صائمہ کے
بھاگ جانے کی خبر پورے گاؤں میں پھیل چکی
تھی۔

☆.....☆

اب وہ طوفان گزرے دیر ہو چکی تھی۔ بیٹیاں
جو ان ہو گئی تھیں۔ چھوٹی بیٹی اریشا بالکل ماں کی
تصویر تھی، عادات و اطوار میں بھی ماں سے ملتی جلتی
تھی، وہ جب بھی چوہدری اسد کے سامنے آتی ان
کا دل انجانے خوف پر لرزاختا، وہی چاپ وہی
ڈھال، آواز میں وہی نغمگی، ایسا لگتا اریشا کی
روح نے صائمہ کا جسم پہن لیا ہو۔

اریشا چوہدری اسد کی سب سے لاڈی بیٹی تھی
گمراہ اس کی ایک بات انہیں بالکل پسند نہیں تھی کہ
وہ اپنی ماں کو ہر وقت برا بھلا کر تھی۔

”ببا! آپ ماں کو بھول کیوں نہیں جاتے،
بات بات پر ماں کا ذکر کرتے ہیں۔“

”بیٹی! محبوں کے مسافر قیام نہیں کرتے وہ تو
مسلسل سفر میں رہتے ہیں۔“
”بaba آج تک آپ کی کوئی بات میں سمجھ نہیں

تھی۔ ”بابا آپ کی ہر ابھی ہوئی بات اب میں سمجھنے لگی ہوں، میں بھگنے لگی ہوں کہ بابا تم نے کیوں اپنی پوری زندگی اسی تخت پر گزار دی۔“ ارشاد کا رور و گر بر حال تھا۔

برہما برس کے بعد پہلی بار وہ تخت اپنی جگہ سے ہٹایا گیا۔ تاریخی حیثیت کا حامل وہ تخت جس نے سرد گرم تمام موسم دیکھے تھے زر زمین، زن دنیا پر تینوں مرکے سر کر لیے تھے۔

توہوڑی دیر بعد قبر کی کھدائی شروع ہو گئی، چھاؤڑے کی ہر ضرب طاہرہ اور ارشاد کے دل پر بڑھ رہی تھی۔ بھیجی جیسے آسان سے کوئی بلکل ہی ماحول پر گر کری۔

”یہ کیا؟“ گورکن کے ہاتھوں سے ک DAL چھوٹ لگی اور آنکھیں بھٹکی کی پھٹکی رہ گئیں۔

”لے اللہ سب کیا سے۔“ عورتوں کی چیخیں نکل گئیں۔ طاہرہ اور ارشاد کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

”ہشت جاؤ سب لوگ۔“ گاؤں کے بڑے چھوڑری اپنی دھوتی کیستہ ہوئے قبر میں اترے اور بڑی احتیاط سے مظفر کا جائزہ لیئے لگے۔

اب گاؤں والوں پر یہ راز کھل رہا تھا کہ چھوڑری اسد نے اپنی ساری زندگی اسی تخت کے ساتھ کیوں گزاری ایک ہی جگہ پر ہر وقت کیوں سے بیٹھ رہتے تھے۔ بڑے چھوڑری کے بلاں پر پوکیس بھی آچکی تھی، اور اب قبر سے دو انسانی ڈھانچوں کو نکالا جا رہا تھا۔

ئی روز بعد آنے والی پوسٹ مارٹم روپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ ان دونوں ڈھانچوں میں ایک مرد کا تھا اور دوسرا عورت کا.....!

☆☆.....☆☆

سورج کی پاکیزہ کرنوں نے لجاتے شرما تے مناظر کا گھوٹکھٹ کھولا چکی ایک کوا آنکھن کی منڈیر پر آ کر بیٹھ گیا۔ گرروز کی طرح آج اس کی کامیں کامیں میں شورنہ تھا بلکہ ایک پیغام تھا۔

تخت پر لیٹے ہوئے چوہدری اسد کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ دوسرے ہی لمحے دور سے کہیں ریل کی سیٹی سنائی دی، کوامندیر سے اڑ گیا۔ تین کسی اشیش پر رک گئی تھی۔ منظر ساکت ہو گئے۔ چوہدری اسد کا ہاتھ تخت سے پیچے اس طرح جھول رہا تھا جیسے تصور میں وہ صائمہ کے سہرے بالوں کو چھونے کی کوشش کر رہے ہوں۔

لکھتی عجیب یات ہے کہ جب انسان کو ساتھی کی ضرورت ہوئی ہے تو لوگ اُسے تھا کر دیتے ہیں اور جب اُسے کوئی حاجت نہیں رہتی تو ہر کوئی اُس کی طرف دوڑا چلا آتا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے چوہدری اسد کی حوالی میں لوگوں کا بجوم اکھا ہو گیا۔ میت کو غسل دے کر جب تیار کیا گیا اور جنزاہ لے جانے کی تیاری ہی تھی کہ اچاک، ہی ارشاد چھوڑری اسد کا ایک وصیت نامہ لے کر آگئی جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ مرنے کے بعد ان کی مدفین اسی تخت کے پیچے دالان میں کر دی جائے۔

ارشاد نے آج اس تخت کو غور سے دیکھا جسے دیکھ کر وہ ہمیشہ نفرت سے منہ موزلیا کرتی تھی آج اسے لگا کہ بابا صحیح کہتے تھے کچھ دکھ ایسے ہوتے ہیں جن میں سکھ کا احساس ہوتا ہے۔ ماں کی یادوں سے بڑے ہوئے اس تخت نے جس پر نفرتی درج تھیں آج اچاک ارشاد نے اس سے ایک رشتہ قائم کر لیا تھا۔ باپ کی میت فرش پر رکھی ہوئی تھی، مگر ارشاد اسی تخت پر باپ کو دیکھ رہی

مختصر رنگ

چاوید قصہ کا خیال

گر حکومت دلوں پر کرنی ہو
شیریں لجہ زبان میں رکنا

نازیب بتوں رضا

جوں جوں عائشہ کی شادی کے دن قریب ہی جاریا تھا اور یہ ایک نظری عمل تھا ہر لڑکی کی آرہے تھے اس کی بے چینی اور اضطراب بڑھتا طرح وہ بھی بھی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی



ویے بھی اب ان کی شادی میں دن ہی کتنے رہ
گئے تھے صرف دو مینے.....!

ای ابونے فون پر بات کرنے کی کچھ سوچ کر
ہی اجازت دے دی تھی لیکن روزانہ صرف ایک
فون کال، کیونکہ آریان کی بھی خواہش تھی کہ وہ
شادی سے سلسلے عائش سے بات چیت کرے
عائش بہت خوش تھی اور کیوں نہ ہو تو آریان اور
اس کی نیلی بہت اچھی تھی سب لوگ لیام یا فیٹ اور
سلجھے ہوئے تھے اور نیلی بھی زیادہ بڑی نہیں تھی۔
آریان کے گھر میں سب سے بڑی صالح آپی
تھیں پھر آریان اور ان کے بعد دو بھائی تھے۔ جو
ابھی پڑھ رہے تھے۔

صالح آپی شادی شدہ تھیں ساس سر بھی بے
حد اچھے اور سلچھے ہوئے لگتے تھے ظاہر پر رشتہ ہر
طرح سے بہترین تھا، آریان کی جانب بھی بے حد
اچھی تھی پھر آخر کیا مسئلہ تھا تو عائش اتنی ڈسٹری
تھی۔

”کیا آریان نے کچھ کہا ہے؟ یا اس کی کوئی
بات بڑی لگ گئی ہے کچھ بتاؤ تو ہمیں اس طرح
چپ رہنے سے کیا ہوگا، پھر ابھی تمہاری خاموشی
اور پریشانی کو صرف میں محسوس کر رہی ہوں مگر کوئی
ای ایسا اور پھر باقی لوگ بھی محسوس کر کے نجا نے کیا
سوچیں گے جیسے ہم تمہاری شادی زیر دستی کروا
رہے ہیں۔“ آپی کے لمحے میں اب تھوڑی سختی
تھی۔

عائش نے سوچا کہ اسے اپنے دل کی بات اور
خداشت آپی کو بتا دینے چاہئیں، سو وہ حمکھتے اور
اکتھے بولی۔

”وہ آپی..... مجھے آریان پرانے خیالات
کے لگتے ہیں۔“

”پرانے خیالات کے.....!“ آپی زیرِ ب

کہ اس کا ہونے والا شوہر نے کس مزاج کا ہوگا،
نجانے اُس کے ساتھ رہو یہ کیا ہوگا! اس کے گھر
والے کسے ہوں گے؟ شادی کے بعد اس کی
زندگی کیسی گز رے گی وغیرہ وغیرہ.....! وہ اس کی
سے کچھ کہہ بھی نہیں رہی تھی اور اندر ہی اندر ہلکا
ہوئی جا رہی تھی۔

”کیا بات ہے عائش میں دیکھ رہی ہوں کہ
کچھ دن سے تم بجائے خوش ہونے کے چپ چپ
کی ہو؟ کیا بات ہے مجھے بتاؤ کیا تم اس شادی
سے خوش نہیں ہو؟“ طوبی آپی نے جو اس کی
شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں میکے آئی ہوئی
تھیں، موقع دیکھ کر اس سے بڑی محبت اور
رازداری سے پوچھا، کیونکہ اُن سے بھی عائش کا
اضطراب چھپا نہ رہ سکا تھا۔ آپی کی بات سن کر
عائش چوچی کیا اس کی پریشانی چھرے سے جھلک
رہی ہے کہ طوبی آپی نے بھی محسوس کر لی ہے۔

”کچھ نہیں آپی! بس ایسے ہی دل اداں
ہو رہا تھا۔“ اس نے تلا۔

”اس کی وجہ اسی ابوسے دوری ہے یا کوئی اور
بات بھی ہے؟ اگر کوئی بات ہے تو دل میں نہ رکھو
چندابھی بتاؤ کیا مسئلہ ہے ہو سکتا ہے میں تمہاری
پریشانی دور کر سکوں۔“ آپی نے کریدا پھر بھی وہ
خاموشی سے زمین کریدی تی کوئی جواب نہیں
دیا۔

طوبی آپی جو شادی شدہ اور ایک سمجھدار
عورت تھیں نورا بسمیل کیں کہ یقیناً کوئی بات تو ہے
جو اندر ہی اندر عائش کو پریشان کر رہی ہے، کیا اس
کے مغلکیر آریان نے کچھ کہا ہے؟ کیونکہ ابھی ایک
ہفت پہلے ہی سے آپی نے اسی ابوکی اجازت سے
عائش اور آریان کی فون پر بات چیت شروع
کر رہا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کو سمجھ میں

بڑا کیں۔

”کیا مطلب کھل کے بات کرو۔“

”وراصل آریان چاہتے ہیں کہ میں شادی

کے بعد حجاب کروں اور عبایا پہنوں۔“ اس نے اپنی پریشانی بیان کی کیونکہ انہی تو وہ سر پر اسکارف اور ساتھ دو پیٹ اور ڈھنپتی تھی، کھلے سر سے تو وہ اب بھی گھر سے نہیں لکھتی تھی، لیکن عبایا اور حجاب اس کے لیے کچھ نیا تھا اس لیے اس کی پریشانی فطری تھی۔

”آف اللہ!“ آپی نے اپنا سر پہنیت لیا۔

”بس اتنی سی بات کے لیے تم اتنا پریشان تھیں، میں تو انہی پتہ نہیں کیا پریشان ہے..... دیکھو اگر آریان کی یہ خواہش ہے کہ تم عبایا اور حجاب پہنون تو تم پہن لینا مشرقی لڑکیاں اپنے شوہر کی مرضی پر ہی چلتی ہیں اس سے اپنے شوہر کے دل میں گھر بناتی ہیں اور میں جانتی ہوں کہ تم ایک اچھی لڑکی ہو۔“

آلی نے رسائیت سے اسے سمجھایا۔

”لیکن آپی میری دو فرینڈز کی شادی ہوئی ہے اور وہ دونوں صرف دوپے میں بر جگد گھومتی پھرتی ہیں، انہی چھپلے دونوں میری فرینڈ رابعہ مجھے مار کیتے میں ملی تھی اپنے ہر پینڈ کے ساتھ شاپنگ کر رہی تھی اس نے جدید فیشن کے سوت کے ساتھ صرف دوپے اوڑھ رکھا تھا وہ بھی گلے میں، میں تو پھر بھی سر ڈھک کے نکلتی ہوں، اب اگر شادی کے بعد میں نے عبایا اور حجاب لیا تو میری فرینڈز میرا کتنا مذاق بنائیں گی میں نکتی آ کورڈ لگوں گی؟“

عائش روہانی ہو گئی تھی۔

”عائشہ تمہاری سوچ کو کیا ہو گیا ہے چندرا، اگر رابعہ کا شوہر اسے دوپے میں لے کر گھومتا ہے تو یہ

اُس کی سوچ اور نظر یہ ہو گا اور تمہارا شوہر اگر تمہیں عبایا پہنے کو کہے گا تو یہ اس کی سوچ اور نظر یہ ہو گا ہر انسان کا اپنا نظر یہ ہوتا ہے اور عورت کو بہر حال اسے شوہر کی مرضی پر چلا ہوتا ہے تھی وہ خوشحال زندگی گزار پاتی ہے ورنہ زندگی جہنم ہن جاتی ہے، میری نصیحت ہے کہ دوسروں کو مت دیکھو بلکہ شادی کے بعد وہی کرتا جو تمہارا شوہر چاہے۔ آریان ایک پڑھا لکھا اور سمجھا ہوا لڑکا ہے مجھے نہیں لگتا کہ وہ زبردستی تم پر اپنی مرضی مسلط کرے گا اس لیے ابھی سے اس معاملے میں پریشان ہو کر اپنا خون مت جلاو اور میرے ساتھ کام میں ہاتھ بناو بہت کم وقت رہ گیا۔“

آپی اپنی پیات ختم کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں اور عائشہ نے بھی وفتی طور پر اس بات کو نظر انداز کر دیا کہ جو ہو گی دیکھی جائے گی۔

ہو سکتا ہے میں آریان کو عبایا نہ پہنچے پر راضی کر لوں، اس نے خود کو سمجھایا اور پہ سکون ہو گر آپی کا ہاتھ بٹانے لگی۔

☆.....☆

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دن پر لگا کر اڑنے لگے اور عائشہ کی شادی کا دن آن پہنچا، عائشہ پر ٹوٹ کے روپ چڑھا تھا اسی کی بار اُس پر دم کر کے نظر اتار پھی تھیں اور اب وہ آریان کے پہلو میں نظریں جھکائے بیٹھی تھیں، گھنٹوں تصاویر اور مسودوں یہ بوانے کے بعد وہ تھکی یاری اب بیڈر دم میں پہنچی تھی اور آریان کی منتظر تھی بالآخر آریان کی کمرے میں آمد ہوئی تھی۔

”بہت خوبصورت لگ رہی ہو!“ آریان نے کہتے ہوئے اس کی انگلی میں ڈائمنڈ رنگ پہنا دی تھی اس نے شمار کر سمجھا دیا تھا۔

”مجھے آج تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی

ہیں جو میں فون پر نہیں کر سکا تھا۔“ آریان رے
ٹنگلو کے بعد کام کی بات پر آیا تو عائشہ کے کان
کھڑے ہو گئے۔
”جی کہیے۔“ وہ دھنے سے بولی وہ کچھ دیر
خاموش رہا اور پھر گویا ہوا۔

”دیکھو عائشہ میں جو کچھ کہنے جا رہا ہوں پلیز
اسے نیکھل دیتے لینا بلکہ کھلے دل سے اور سوچ بڑی
رکھ کر اس پارے میں سوچنا، یہ باتیں آج ہی کرنا
اس لیے ضروری ہیں کیونکہ آج ہماری زندگی کا
آغاز ہوا ہے اور کام پہلے ہی دن سمجھ آجائے تو
زیادہ بہتر رہتا ہے۔“
وہ تھوڑا کا پر بولا۔

”میں نے تم سے فون پر کہا تھا کہ تم شادی
کے بعد حباب کرنا تم نے میری بات کا کوئی جواب
نہیں دیا تھا، خاموش ہو گئی تھیں میں نے بھی سوچا
کہ یہ باتیں شادی کے بعد ہی کرنا مناسب ہے
اب بتاؤ کیا تمہیں جباب کرنے پر اعتراض ہے؟
دیکھو مجھ سے ہر بات کھل کر کرو میں بھی آج
ایسے دل کی باتیں تم سے کروں گا کہ مجھے یہی
عورتیں پسند ہیں، کیونکہ اب تم میری عزت ہو
تمہیں لوگ میری بیوی کی حیثیت سے دیکھیں
گے اور میں نہیں چاہتا کہ کوئی میری بیوی پر انکی
اخلاقے یا اسے میلی چشمیں سے دیکھے تم سمجھ رہی ہوتا
میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں؟“

وہ دھنے لے چکے میں اپنی بات اسے سمجھانا چاہ
رہا تھا اور عائشہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ یہ
آریان شادی کی پہلی رات کیا باتیں لے کر بیٹھے
گئے یہ باتیں ابھی کرنا ضروری تھیں کیا؟ بعد میں
بھی تو ہو گئی تھیں پتہ نہیں کس مزاج کے ہیں۔“

”تم نے جواب نہیں دیا میری بات کا.....
تمہیں اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ میں تم سے آج کی

رات یہ باتیں کر رہا ہوں..... یا پھر شاید تم مجھے
غلط سمجھ رہی ہو تھک نظر یا پھر شکی مزاج مرد..... ہے
تار؟“ وہ اس کی سلسل خاموشی کا مطلب سمجھ نہیں
پا رہا تھا وہ اپنے خیالات کا اظہار کیوں نہیں کر رہی
ہے تاکہ بات صاف ہو سکے کہ آیا وہ آریان کے
خیالات سے متفق ہے یا متفق.....!

عائشہ پہلو بدل کر رہی تھی کیا کہتی آریان اسے
بغور دیکھ رہا تھا۔

سرخ لہنگے میں خوبصورت میک اپ کے
ساتھ وہ سیدھی اُن کے دل میں اتر رہی
تھی۔ آریان نے نے ساختہ اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”دیکھو عائشہ مجھے غلط نہ سمجھنا میں کوئی نجک
نظر یا شکی قسم کا مرد نہیں ہوں ہاں مگر غیرت مند
ضرور ہوں اور ایک پڑھا لکھا، پاشور اور کھلے دل
و دماغ کا آدمی ہوں۔“ پھر لطف بھر کوڑ کا۔

”اب تم سوچو گی کہ اگر میں کھلے دل و دماغ
کا آدمی ہوں تو جباب کا کیوں کہہ رہا ہوں؟“ وہ
سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”بولو یہی سوچ رہی ہوتا؟“ عائشہ کا سر
اثبات میں ال گیا وہ واقعی یہی سوچ رہی تھی۔

”تو ڈیزیر میں اس معاملے میں کھلے دل و
دماغ کا ہوں کہ میں کبھی تم پر کوئی بے جا پابندی
نہیں لگاوں گا کہیں آنے جانے سے نہیں روکوں
گا تم پر کبھی شک نہیں کروں گا اور نہیں کہہ رہی تم پر بھی
باتھ اخاؤں گا بلکہ تمہیں اپنے دل کی ملکہ بناؤ کر
رکھوں گا، تمہیں بے انتہا پیار اور عزت دوں گا
بدلے میں مجھے صرف ایک چیز چاہیے کہ تم عبایا
پہنہ اور جباب کرو۔“

پھر رُک کر اس کے تاثرات دیکھنے لگا۔

عائشہ پیزاری محسوس کر رہی تھی یا اسے لگا۔

”اب میں تمہیں سمجھتا ہوں کہ یہ سب کیوں

ضروری ہے؟"

عائشہ چپ چاپ سن رہی تھی اسے اب آریان کی باتیں اچھی لگ رہی تھیں۔ کیونکہ وہ فطرتاً اچھی لڑکی تھی نمازی تھی بس اسے عباہی اور حجاب پسند نہیں تھا۔ اور یہ بات آریان کو طوبی آپی نے بتائی تھی اور لہا تھا۔

"اگر تم اسے محبت سے سمجھاؤ گے تو وہ مان جائے گی کیونکہ عورت تو ہوتی ہی محبت کی بھوکی ہے مرد چاہے تو محبت سے عورت کو اپنا غلام بنائے عورت چپ چاپ ساری زندگی دو یعنی بولوں کے عوض اس مرد کی غلامی میں گزار دے گی اف تک نہ کرے گی۔"

کیونکہ عورت کی تخلیق پسلی سے ہوئی ہے اور پسلی سخت اور نیڑھی ہوتی ہے اس لیے اگر اسے سخت سے موڑا جائے تو یہ ٹوٹ جائے گی اس لیے زمی ضروری ہے۔" آریان اسے بہت زمی اور پیار سے اپنی بات سمجھا رہا تھا جو سیدھی اس کے دل میں اتری جا رہی تھی۔

"تمہیں پتہ ہے مرد کی غیرت کو کیسے جانچا جاتا ہے؟" انہوں نے سوال کیا۔

"پتہ نہیں۔" وہ یہی کہہ سکی۔

"میں بتاتا ہوں۔" مرد کی غیرت کو اس کی بیوی یا بہن کے لباس اور، ہم سنن کے طریقوں سے پچانا جاتا ہے جب کوئی عورت نجک اور مہین لباس پہن کر باہر نکلے ہے تاں تو سب اس عورت سے زیادہ اس کے ساتھ موجود مرد پر انگلیاں اٹھاتے ہیں کہ کیسا بے غیرت مرد ہے جو عورت کو اس طرح لے کر جا رہا ہے، ہر ایک کی نظریں اس عورت کے جسم کے آر پار ہوتی ہیں خود میں بھی ایسے مردوں کو بے غیرت کہتا ہوں اور میں ہرگز

نہیں چاہتا کہ کوئی مجھے کبھی خداخواست بے غیرت کہے یا میری بیوی کی طرف کسی کی ملکیت کا گھٹا کرے۔" وہ جذباتی ہو رہا تھا شدت جذبات سے چہرہ متغير ہو رہا تھا۔

"کیا تمہیں اچھا لگے گا کہ لوگوں کی گندی نظریں تم پر اٹھیں یا لوگ تمہارے شوہر کو بے غیرت بولیں؟" وہ براہ راست اس سے پوچھ رہا تھا الجد و ہمیا اور پیار بھرا تھا۔

"نہیں بالکل نہیں.....!" وہ بے اختیار بولی تھی۔ "گذجھے تم سے بھی امید تھی۔" وہ خوشدلی سے بولا تھا۔

"اک اور بات تم جانتی ہو ہمارے معاشرے میں اتنا بگاڑ کیوں پیدا ہو رہا ہے؟ کیوں آئے دن ایسی روح فرسا خبریں سننے کو ملتی ہیں کہ جن کو سن کر روح کا پاٹ اٹھتی ہے؟ کیوں رشتؤں میں لقدس ختم ہوتا جا رہا ہے؟ اس کی وجہ آج کل کی عورتوں کی اسلام سے دوری ہے، ظاہر سے جس وہ بے باکانہ غیر مناسب لباس پہن کر باہر لکھیں گی جس سے غیر مردوں کی نظریں اُن پر اٹھیں گی تو پھر اس سب بگاڑ کی ذمے دار عورت ہی ہوئی تا۔"

اگر عورت اپنے گردھنقتی آن دیکھا حصہ بنالے خود کو سمیٹ کر ڈھانپ کر باہر نکلے تو، خدا کی قسم کسی بھی مرد کی محال نہیں کہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے سکے۔ بی بی فاطمۃ الزہرہ سے کسی نے پوچھا کہ عورت کے لیے سب سے بہترین عمل کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ نہ کوئی ناخرم عورت کو دیکھنے نہ ہی عورت ناخرم کو دیکھے۔ مزید فرمایا۔

"عورت کو سورج کی مانند ہونا چاہیے کہ کسی

کی بھی نظر اس پر اٹھنے کے۔

آریان لمحہ بھر کو حب ہوا، عائشہ کا سر شرمدگی سے جھکا، ہوا تھا آریان لتنی اچھی سوچ کے مالک ہیں اور وہ انہیں کیا سمجھ رہی تھی۔

”کیا آج کے دور میں بھی ایسے مرد ہیں جو گناہ و ثواب کا اتنا خیال رکھتے ہیں، یقیناً یہ سب نماز کی برکت ہے کیونکہ آریان نماز کے پابند ہیں اور بے شک نماز بے حیائی سے روکتی ہے، یہ سب نماز کا ہی کرشمہ ہے کہ آریان تعلیم یافتہ اور اس دور میں ہونے کے باوجود فاشی اور برائی سے دور ہیں اور مجھے بھی رکھنا چاہتے ہیں، میں تو بڑی قسمت والی ہوں کہ مجھے آریان جیسے شوہر ہے۔“ وہ دل ہی دل میں آریان کی قصیدہ گوئی میں معروف تھی آریان نے اس کی خاموشی محبوس کر کے اسے پکارا۔

”عائش.....!“ جواب ندارد.....!

”عائش.....!“ پھر پاکرا تو چونکہ رجی بولی۔
”کیا میری بات تکمیل بری گئی ہیں تمہیں؟ تم اس طرح خاموش کیوں ہوئیں؟“ وہ شاکی لمحہ میں بولا۔

”نمیں، نہیں آریان کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ خدارا مجھے شرمدہ نہ کریں، آپ تو بہت اچھے انسان ہیں میں تو اپنی سوچ پر پیشان ہوں کر آپ جیسے انسان کے بارے میں لکھتا غلط سوچ رہی تھی، آپ کو تجا نے کیا کیا سمجھ رہی تھی۔“ وہ سر جھکائے شرمدگی سے بول رہی تھی اس کے منہ سے ایسے الفاظ ان کر آریان کے سینے میں ٹھیک اترنے لگی وہ نور اشونخ ہوا۔

”نمیں بتا دو میں بالکل بر انہیں مانوں گا۔“
شوخی برقرار ہی عائشہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔
”وہ..... دراصل میں آپ کو ٹھک نظر اور ٹھکی

تم کا مرد سمجھ رہی تھی۔“ اس کے مضمومیت سے بوکے پر وہ قہقہہ لگانے پر مجبور ہو گیا۔

”سمجھ رہی تھی مطلب.....؟“

”مطلب آپ ایسے نہیں ہیں۔“

”اچھا پھر میں کیا ہوں؟“

”آپ..... آپ تو بہت اچھے انسان ہیں، میں تو خود کو بہت عام کی سوچ والی ادنیٰ کی لڑکی سمجھ رہی ہوں جو آپ کو سمجھے ہی نہیں سکی۔“ اس کے لمحہ میں دکھ پیشیاں اور محبت ایک ساتھ دکھائی دے رہے تھے، آریان سرشار ہونے لگا، اس نے محبت سے اس کے دونوں ہاتھ خام لیے اور اس کے جھکے ہوئے سر کو تھوڑی سے اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھا لکتے ہوئے بولا۔

”مجھ سے پوچھو پاگل لڑکی کہ تم میرے لیے کیا ہوتا ہے میری عزت میری زندگی اور میرے جیسے کی وجہ ہو، دیکھو آج ہماری زندگی کی حیثیت شروعات ہونے جا رہی ہے مجھ سے وعدہ کرو، ہمیشہ میرا مان رکھو گی۔“

”جی میں بھی آپ کو دلکایت کا موقع نہیں دوں گی اور خود کو ہر طرح سے آپ کی پسند میں ڈھال لوں گی، کیونکہ آپ میرے مجازی خدا ہیں میری محبت ہیں اور میرا سائبان ہیں۔“

وہ بھکھے ہوئے سر سے محتبوں کا اقرار کر رہی تھی، اس پل عائشہ آریان کو دنیا کی حیثیت تین عورت لگ رہی تھی، وہ دل سے اس کا ہو چکا تھا کہ اس نے آج آریان کا مان بڑھا کر اسے مجرم کر دیا تھا، وہ خود کو خوش قسمت سمجھ رہا تھا کہ اسے عائشہ جیسی بیوی ملی جو پہلی ہی رات اس کے رنگ میں رنگ گئی تھی۔ یقین، اعتبار اعتماد اور محبت کے رنگ میں.....!

☆☆.....☆☆



تاقب لکھوی کا خیال

باغبان نے آگ دی جب آشیانے کو میرے
جن پہ تکریہ تھا، وہی پتے ہوا دینے لگے

دشمن شہزاد

قل کی واردات ہائی کورٹ کے وکیل فیاض تھانے انجارج غازی پور عمار سیال موقع پر پہنچ کاہلوں کے گھر میں ہوئی تھی۔ اطلاع پاتے ہی گئے۔ معلوم ہوا وکیل صاحب کے گھر میں رہنے



لیے جلے گئے۔ ساجد تو لیٹتے ہی ڈھوکی نیند سو گئے۔ آیاں بھی سو گیا، مگر نہ جانے کیوں میری آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ رات بارہ بجے ڈورنیل بختے پر میں نے دروازہ ڈھوکا تو دیکھا۔ ڈھوکی سامنے نکرا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک نوجوان اور تھا۔ ڈھوکی بے حد ضروری کام کا حوالہ دے کر ساجد بھٹی سے ملنے کی صدر کرنے لگا تو میں نے انہیں جگایا اور خود چائے لینے کے لیے چکن میں چلی گئی۔ ”اتا کہہ کر پنکی پھر تسلیکی۔

”وو منٹ بعد ہی میں نے ساجد کے چھینے کی سکھی گھٹی آوازیں نہیں۔“ پنکی نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میں چکن سے دوڑ کر بیٹھ روم میں گئی۔ میں نے دیکھا۔ ڈھوکی آیاں کے پیٹ سے ساجد کے سر پر اور کر راتھا۔ میں نے ان دونوں سے شوہر کو بجاں کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوئی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے دم توڑ دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں صدمے سے بے ہوش ہوئی۔ پوری رات میں بے ہوش پڑی رہی۔ صبح پانچ بجے بے ہوشی نوٹی تو دیکھا۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ لہذا چکن میں جا کر میں نے کھڑکی سے شور چایا تو مکان مالک اور بڑوی آئے۔ ان میں سے ہی کسی نے پولیس کو فون کر دیا ہوگا۔“

آگے کی تحقیقات میں پنکی نے بتایا کہ ڈھوکی کو اُس نے پہلے بھی نہیں دیکھا تھا۔ نہ اس کے بارے میں ساجد نے بھی کوئی ذکر کیا تھا۔ پنکی نے اتنا ضرور اعتماد سے کہا کہ ڈھوکی اور اس کے ساتھی کے سامنے آنے پر وہ انہیں پچھان سکتی ہے۔ بہر حال موقع پر قانونی کارروائی کرنے کے بعد عمار سیال نے ساجد بھٹی کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی۔ اس کے بعد پنکی کو مدی ہنا کر 5 دسمبر

والے کرائے دار ساجد بھٹی کا قتل ہوا ہے۔ عمار سیال نے موقع کا معائنہ کیا۔ لہوہان لاش تیسری منزل پر واقع کمرے کے بیٹھ پر پڑی تھی۔ لاش کے پاس ہی بچوں کے کھینچے والا لکڑی کا کرکٹ بیٹٹ ٹوٹا پڑا تھا۔ کمرے میں ایک چادر بھی خون سے لٹ پت ملی تھی۔

تحقیقات سے علم ہوا کہ مقتول نے وکیل فیاض کا ہوں کے مکان کی دوسری اور تیسری منزل کرائے پر لے رکھی تھی۔ جس میں وہ اپنی بیوی پنکی اور چچہ سالہ بیٹھ آیاں کے ساتھ رہتا تھا۔ شوہر کے قتل کے صدمے سے پنکی نے حال تھی۔ عمار سیال نے تسلی دلاسدے کر پوچھ چکی تو اس نے یہ بیان دیا۔

”گزر ہفت روپ زینی 4 دسمبر 2014ء کی شام کو چار بجے ایک نوجوان میرے شوہر سے ملنے آیا۔ چونکہ اس وقت ساجد بھٹی گھر میں نہیں تھے۔ اس لپے جاتے جاتے وہ کہہ گیا تھا کہ آپ کے شوہر آئیں تو بتا دیا کہ ڈھوکی آیا تھا۔ شام پانچ بجے ساجد بھٹی واپس لوٹے تو، میں نے بتا دیا کہ کوئی ڈھوکی ان سے ملنے آیا تھا۔ اس کے بعد شام چھ بجے ہم تینوں جناح کالوںی چلے گئے اور وہاں سے رات گیارہ بجے واپس لوٹے۔“

”کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ لوگ پانچ گھنٹے تک جناح کالوںی میں کیا کرتے رہے؟“

umar siyal نے اُس کوٹوک کر پوچھا۔

”جناح کالوںی میں میرا میکہ ہے۔“ پنکی نے آنسو پوچھتے ہوئے بتایا۔

”میرے بھائی فرید علی کی بیٹی کی سالگردہ تھی، گھر بیٹھ پاری تھی۔ اس لیے لوگ گھانا کھانے کے بعد گھر آئے تھے۔ کپڑے بدلتے کے بعد ہم تینوں تیسری منزل کے بیٹھ روم میں سونے کے

کی صحیح نامعلوم اشخاص کے خلاف مقدمہ درج کر لیا۔

وہ بے رحم قاتل ڈھونکی، جس نے میراہگ اجاڑا ہے۔

عمار سیال نے گوجرد میں انس کے گھر پر چھاپے مار کر اسے اٹھایا۔ تھا نہ میں اس سے پوچھ پچھ کی گئی تو اس نے ساجد بھٹی کے قتل والے جرم سے صاف انکار کر دیا۔ یہی نہیں اُس نے اپنی بے گناہی کے ثبوت بھی دیے۔ یہ بھی بتایا کہ وہ حادثہ والی رات کہاں تھا۔ عمار سیال نے اُس کے بیان کی تقدیم کرائی تو ساری باتیں حق تھا۔

ہوئیں۔

”چلو مان لیا کتم نے ساجد بھٹی کو نہیں مارا۔ سچائی کی تھہ تک جانے کے لیے عمار سیال نے انس سے سوال کیا پھر اُس کی گھروالی تھیں قاتل جیوں ٹھہرای ہی ہے۔“

انس کی آنکھیں خلا میں تکنے لگیں اور ماضی کی ایک ایک بات اس نے یاد کر کے عمار سیال کو سب بتا دیا۔

had شے پندرہ دن پہلے کی بات ہے۔ ایک صحیح ساجد بھٹی اپنے اٹچ کے ساتھیوں کے ساتھ ایک پروگرام کو فناش کر رہا تھا اور اس کے بعد ریبرسل بھی ہوتا تھی۔ اس میں شام بھی ہوتی تھی۔ تقریباً گیارہ بجے ساجد بھٹی کو اچانک کچھ یاد آیا وہ پونک کے پاس بیٹھے انس کو دیکھنے لگا۔

”گھر میں بزری گوشت بالکل نہیں ہے۔“

اس نے انس سے کہا۔

”اور مالے بھی ختم ہو گئے ہیں۔ پنکی نے صحیح لست بنایا کر دی تھی۔ میں یہاں پھنس گیا اور شام سے پہلے نکل بھی نہیں سکتا۔ ایسا کرو تم سارا سامان بازار سے خرید کر پنکی کو دے آؤ۔“ یہ کہہ کر اُس نے پنکی کی دی ہوئی لست انس کو دے دی۔ لست میں تحریر سامان خرید کر انس ساجد بھٹی کے گھر

ڈھونکی تک پہنچنے کے لیے مقتول کا ماضی اور حال جانتا ضروری تھا۔ عمار سیال نے اپنے طریقے سے تفتیش کی تو پہنچ چلا کہ 48 سالہ ساجد بھٹی آپائی طور سے شورکوٹ کا باشندہ تھا۔ عمار بھٹی نامی اس کا ایک چھوٹا بھائی بھی تھا۔ سالوں قبل دونوں بھائی روزگار کی ملاش میں ٹوبہ پنک سکھ آئے تھے۔ زندگی کی دوڑ میں عمار بھٹی چہاں پھیل کر پیچھے رہ گیا تھا۔ وہیں ساجد بھٹی نے کامیابی کی منزل پائی تھی۔ ٹوبہ پنک سکھ میں اس نے نام کے ساتھ دام بھی خوب کیا۔ ایک این جی او میکٹ ہونے کے علاوہ وہ اٹچ ادا کار بھی تھا۔

مذکورہ معلومات سے عمار سیال نے دو نکتے نوٹ کئے پہلا یہ کہ ساجد بھٹی 48 سال کا تھا۔ جبکہ پنکی ت بشکل 27، 28 سال کی لڑکی تھی۔ دیکھا جائے تو دونوں کی عمروں میں بیس سال کا فرق تھا۔ دوسرا نکتہ یہ تھا کہ مقتول اٹچ سے بھی وابستہ تھا۔ اُن کی نولی میں دوسرے کارندوں کے علاوہ ڈھونک بجانے والے بھی ہوا کرتے تھے۔ جنہیں عام بول چال میں ڈھونکی کہتے ہیں۔ عمار سیال نے اسی سمت سے تفتیش آگے بڑھائی تو انہیں معلوم ہو گیا کہ گوجرد کا رہنے والا اُس ناہی نوجوان مقتول کے اٹچ کے رجسٹر کو روگراموں میں ڈھونک بجا تا ہے۔ اسی لیے لوگ اسے انس ڈھونکی کہتے ہیں۔ اتفاق سے عمار سیال کو ساجد بھٹی کے زنگار نگہ پروگرام کے کچھ ایسے فنوٹل گئے جن میں اُس ڈھونکی موجود تھا۔ عمار سیال نے پنکی کو اُس کا فنوٹ دکھا کر شناخت کرائی تو اس نے فنوٹ میں دوسرے فنکاروں کے ساتھ نظر آرہے اُس ڈھونکی کے پر انگلی رکھ دی کہ یہی ہے

کے لیے۔“ بے خوف انس نے مسکرا کر کہا۔
”تینکن مجھے کیا پڑھتا کہ یہاں کیا معاملہ جل
رہا ہوگا۔“

پنکی انس ڈھونکی کی دیدہ دلیری پر حیران رہ
گئی۔ پھر کچھ سوچ کر بولی۔

”اندر آؤ۔“ انس پنکی اور طارق کے پیچھے
کمرے میں چلا گیا۔ پنکی نے بیٹھ پڑا پوس کھول
کر اس میں سے سوسو کے کچھ نوٹ نکالے اور
انہیں انس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

”یہ لو اور بھول جاؤ کہ تم نے کیا دیکھا تھا؟“
لیکن انس نے پیسے لئے سے انکار کر دیا۔ تب
پنکی نے مزید نوٹ دینے کی کوشش کی، مگر انس
انکار کرتا رہا۔ آخوندگی بولی۔

”تو پھر انہام نہ بندر کھنے کا کیا لوگے؟“
”آپ سے کبھی کبھی ملاقات.....!“ اس
نے دیدہ دلیری سے کہا تھا۔

پنکی نے اسے نفرت سے گھورا جبکہ طارق
مٹھیاں بھیجن کر دانت پیٹتے ہوئے اس کی طرف
لپکا، وہ قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”طارق جی! مجھ پر حملہ کرنے کی غلطی بھول
کر بھی نہ کرنا۔“ انس نے تنیپہ کرتے ہوئے کہا۔

”ذرا سوچ پورا محملہ تماشا دیکھے گا، لوگ
جھکرے کا سبب پوچھیں گے تو کیا جواب دو
گے؟“

ایک لمحے میں طارق کا غصہ جھاگ کی مانند
بیٹھ گیا۔ پنکی اور طارق انس کو منانے لگے مگر وہ
پنکی سے کم پر سمجھوتے کرنے پر راضی نہیں تھا۔ بجاوہ
کا کوئی دوسرا پہلو نہ دیکھ رہی تھی نہ فی الوقت انس
کی شرط مان لیتا ہی مناسب سمجھتا تھا۔

”ٹھک ہے میں تمہاری بات مان ہی لیتی
ہوں۔“ پنکی نے کہا۔ لیکن اس ملاقات کے لیے

پہنچا تو دوسری منزل والے حصے میں اسے پنکی نہیں
ملی۔ پنکی کو کوہ ہونہ تاہو انس تیرسی منزل پر پہنچا تو
بیڈ رومن کا دروازہ بند تھا۔ کھڑکیاں بھی بند ہیں مگر
اندر سیلک فین چل رہا تھا۔ پنکی کو بلا نے کے لیے
انس نے جو نبی دروازہ بجانے کو باہم اٹھایا، اسے
سرہوش کن لمحے میں پنکی نی آواز سنائی دی۔ اس کے لیے یہ
سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ گھر میں اسکے لیے ہونے کا
فائدہ اٹھا کر پنکی کی آشنا کے ساتھ گل چھڑے اڑا
رہی تھی، انس نے اصل معاملہ جانے کے لیے
ادھر ادھر دیکھا تو اسے کوئی کھڑکی نظر نہ آئی۔
دروازے کے اوپر چھٹت سے لگا ہوار و شن دان تھا
جو کھلا ہوا تھا، مگر چبوں کے بل کھڑے ہو کر اس
سے دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔ انس کی نظر پاس ہی بکھی
بیٹھی پر پڑی۔ اس نے آہستہ سے تھیلاز میں پر
رکھا اور بیٹھی اٹھا کر روشن دان سے لگا دی۔ اب
سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا پنکی ایک
مرد کے ساتھ موجود تھی، اور دونوں شیطانی جذبات
میں مغلوب تھے۔ پنکی مرد کو طارق، کہہ کر خاطب
کر رہی تھی۔ انس یہ شیطانی مظہر دیکھ ہی رہا تھا کہ
یتھی ہوا کا جھونکا آیا اور روشن دان پر جمی دھول اڑ
کر اس کے نتفوں میں ساگھی۔ اس سے انس کو
چھیتکیں آنے لگیں۔ وہ مسلسل آنے والی اپنی
چھیتکوں کو روک نہیں سکا۔ چھیتکوں کی آواز پنکی
اور طارق نے سنی تو ان کی نظر میں روشن دان کی
طرف اٹھ گئیں، اور اس کو دیکھتے ہی دونوں گھبرا
گئے انس بھی جلدی سے بیٹھی سے اتر آیا تھا۔
چند لمحوں بعد دروازہ ٹھکل گیا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ پنکی نے غرا کر
پوچھا تھا۔
”میڈم! میں آیا تو تھا گھر بیوی سامان دینے

وہنی طور پر تیار ہونے کے لیے مجھے مہلت دینا ہوگی۔"

"نوپر ابم، بولو کتنے دن کی مہلت چاہیے؟"

انس نے پوچھا۔

"پندرہ دن کی۔" پنکی نے کچھ سوچ کر کہا۔

"اوکے لیکن سو ہویں دن ہماری ملاقات پی

ہوئی چاہیے، ورنہ سوچ لیتا کہ انجام کیا ہوگا۔"

انس دھمکی دے کر چلا آیا تھا۔

اپنے بیان میں انس نے عمار سیال کو بتایا کہ وہ پنکی کے عاشق طارق کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ تین دن پہلے اس نے پنکی کو اپنا وعدہ یاد دلایا تھا۔ جواب میں پنکی مسکرائی تھی اور کہا تھا۔

"میں جانتی ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے؟"

اپنے تجربے سے عمار سیال سمجھ رہے تھے کہ انس ڈھونگی جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ اس لیے کچھ پابندیوں کے ساتھ اسے گھر جانے کی اجازت دے دی۔

اپنے ذرائع سے عمار سیال کو معلوم ہوا کہ تقریباً میں سال پہلے ساجد بھٹی کی شادی سمندری کی رہنے والی بیوی سے ہوئی تھی۔ دونوں کی ازدواجی زندگی خوشگوار تھی۔ جناح کالونی میں رہنے والی پنکی کے بھائی بھی اسی تجھ پر گراموں میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اس ناطے ساجد بھٹی سے اُن کی قربت تھی۔ ساجد بھٹی کا اُن کے گھر آجائنا تھا۔

2004ء میں اُن کے گھر پر ہی ساجد بھٹی نے پنکی کو دیکھا۔ اُن دونوں پنکی غیر شادی شدہ ہونے کے باوجود اپنی بد اعمالی کی وجہ سے ماں بننے کے مراحل میں تھیں، پنکی کی شارقتی آنکھوں میں جانے ایسا کیا جادو تھا کہ ساجد بھٹی اس پرفدا ہو گیا۔ دل ہی دل میں ساجد بھٹی نے پنکی کی خطاؤں کو بھی

معاف کر دیا۔ پنکی نے ساجد بھٹی کے سامنے شادی کی شرط رکھی کہ وہ اپنی بیوی بیلی کو منیے بھیج دے۔ ساجد بھٹی نے وہی کیا جو پنکی چاہتی تھی۔ زور زبردستی سے اس نے بیلی کو طلاق دے کر میکے بھیج دیا۔ اس کے بعد اس نے ایک نر سنگ ہوم میں پنکی کو اُس کے گناہ سے نجات دلائی اور اس سے شادی کر لی۔

پنکی سے شادی کے بعد ساجد بھٹی نے تو پور کے باشندے فیاض کا ہلوں ایڈو و کیٹ کے مکان کی دوسرا وی تیسری منزل کرائے پر لے لی اور وہاں رہنے لگا۔ وہیں پر پنکی نے چھ سال قبل آیاں کو جنم دیا تھا۔ عمار سال نے ساجد بھٹی کے بڑو سیلوں اور اُس کے اتنی کے ساتھیوں سے پوچھ پچھہ کی تو علم ہوا کہ دو تین سالوں سے ساجد بھٹی اور پنکی کی ازدواجی زندگی میں نہ جانے کس سبب سے زہر گھلا ہوا تھا۔ پنکی پوری طرح تک کے دائرے میں تھی۔ اسی دوران میں بھی خرطی کہ پنکی ساجد بھٹی کے قتل کے بعد گھر چوڑ کر ہمیں چل چکی ہے۔

پنکی پر قانونی تکمیل کرنے کے لیے عمار سال نے سرو لانس تھی مدد لی۔ اس سے معلومات ملیں کہ یوں تو پنکی کے پاس دو مویاں تھے لیکن وہ ان پر پانچ سو کارڈ استعمال کر رہی تھی۔

پنکی نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ رات بارہ بجے سے صبح پانچ بجے تک وہ شہر کے قتل کے صدے سے ہے ہوش رہی تھی جبکہ سرو لانس کی رپورٹ بیارہی تھی کہ اس نے اپنے مویاں کا کام کارڈ بدل کر ایک نمبر پر تین چار بار بات کی تھی اور اس نمبر سے بھی پنکی کو دو بار کال کی تھی اس کے بعد سو کارڈ نکال کر دوسرا اُال دیا گیا تھا۔ ظاہر تھا کہ پنکی کے ہاتھ اپنے شوہر کے خون سے رنگے تھے اور وہ پولیس کو گمراہ کر رہی تھی۔ سرو لانس سے

کر کے ایک تیر سے دو شکار کرنے کا پروگرام بنالیا۔ ساجد بھٹی کو قتل کرنے اور اس جرم میں اُس ڈھونکی کو پھنسانے کا فیصلہ کر لیا۔

منسوبے کے مطابق 4 دسمبر کی شام کو طارق لوڈھی نو تپہ بیک سنگھ آ گیا۔ چونکہ اُسے پنکی کا پروگرام معلوم تھا۔ اس لیے وہ ڈبائنوالہ ریلوے اسٹیشن پر ہی رُکارہا۔ رات کے گیارہ بجے پنکی اپنی بھیجنی کی برتحڑے بارٹی سے گھر لوٹی اور ساجد بھٹی لیٹھتے ہی سو گیا تو پنکی نے طارق لوڈھی کو فون کر کے بلا لیا۔ ایک گھنٹے میں طارق لوڈھی آ گیا۔ پنکی اسے بیدروم میں لے گئی۔ طارق لوڈھی نے بے سددہ ہوئے ہوئے ساجد بھٹی کے منہ پر تنکیر کر کر اس کا دم گھونٹنے کی کوشش کی مگر جان بجائے کے لیے ساجد بھٹی نے طارق لوڈھی کا انگوٹھا چپالیا۔ طارق لوڈھی تکلیف سے چیخنا شروع کیا۔ محبوب کو تکلیف میں بلبلاتے دیکھ کر پنکی نے شوہر کے بال پکڑ کر اس کا سر پچھے کھینچا۔ ساجد بھٹی کا منہ کھلا تو اس کے منہ سے طارق لوڈھی کا انگوٹھا نکل گیا۔ غصے سے بوکھلا کر طارق لوڈھی نے کرکٹ بیٹ اٹھا کر انہادہندوار کر کے ساجد بھٹی کا سر پھاڑ دیا۔ اس کے بعد چادر سے اس کا گلا گھونٹ دیا۔ ساجد بھٹی کی موت سے مطمئن ہونے کے بعد طارق لوڈھی بیدرورم کا دروازہ باہر سے بند کر کے چلا گیا تھا۔

پنکی نے عمار سیال کو یہ بھی بتایا تھا کہ اس دن طارق لوڈھی بھی تپہ بیک سنگھ آیا ہوا ہے۔ اس لیے اس کی نشاندہی پر طارق لوڈھی کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ 17 اگست کو پنکی اور طارق کو عدالت میں پیش کیا گیا جہاں سے وہ جیل بھیج دیے گئے۔ تادم خرید دنوں اپنے جرم کی سزا پانے کے لیے جیل میں تھے۔

☆☆.....☆☆

آگے کی معلومات سے یہ بھی صاف ہو گیا کہ حادثہ والی رات تقریباً ایک گھنٹے تک اس موبائل کی لوکیشن پنکی کے موبائل کی لوکیشن کے ساتھ تھی۔ مطلب یہ کہ فون کا مالک پنکی کے ساتھ تھا اور یہ موبائل نمبر جاتی والا کے باشدہ طارق لوڈھی کا تھا۔

16 دسمبر 2014ء کو مجرم سے عمار سیال کو اطلاع ملی کہ پنکی تپہ بیک سنگھ لوٹ آئی ہے اور مکان خالی کرنے کے لیے سامان پک کر رہی ہے۔ عمار سیال نے بلا تاخیر ماختوں کی تیم بھیج کر آیا۔ آیاں سمیت پنکی کو تھانہ غازی پور بلا لیا۔ عمار سیال نے آیاں کو الگ کر کے میں لے جا کر پیار سے پوچھ گچھے کی جس کے جواب میں آیاں نے جو پتا اس کا خلاصہ ہی تھا کہ پنکی اور ساجد بھٹی میں آخر جھٹڑے ہوتے رہتے تھے۔ انہی مجرموں کے نتیجے میں پنکی نے طارق لوڈھی انکل کے ساتھ مل کر ساجد بھٹی کو جان سے مار دیا۔

ان پکڑ عمار سیال نے پنکی کے خلاف سارے ثبوت سامنے رکھ کر اس سے پوچھ گچھے کی تو اس اس جرم سے اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ اس کے بعد پنکی نے جو بیان دیا اس سے واقعہ کی تصویر صاف ہو گئی۔

ایک دن طارق لوڈھی اور پنکی کو رینگ ریلیاں ملتے ہوئے اُس نے دیکھا تو اس نے بھی پنکی کو حاصل کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ پنکی اُس کی خواہش پوری نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے ذہنی طور سے تیار ہونے کے بہانے پیدراہ دن کی مہلت لے لی۔ طارق لوڈھی اور پنکی کی محبت جنون پر تھی۔ وہ دونوں شادی کرنا چاہتے تھے۔ ان کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ساجد بھٹی تھا۔ اس کے ساتھ اُس بھی درمیان میں پکڑا تھا۔ اس لیے دونوں نے آپس میں مشورہ

بخاران کا رشیق

فرحت عباس شادی فیگر

تو ہے سورج تجھے معلوم کہاں رات کا ڈکھ
ٹوکری روز میرے گھر میں اتر شام کے بعد

شیم حمر

”اڑے بد جنت چپ ہو جا بے شرم کچھ تو لتاڑا جو منی کے لپ اسک لگا کے کام پر جانے پر
لماڑ کر لے بہن ہے تیری۔“ اماں نے مشائق کو اُس کو باقیں سنارہا تھا۔



اب رو نے گئی تھی۔

”چپ ہو جا میری بچی۔“ اماں نے منی کو اپنے گلے سے لگایا۔

”میں کیا کروں اُس خبیث کا، ہزار دفعہ کہا کہیں دفعہ ہو جا مگر یہ تو ہماری جان لے کے چھوڑے گا۔ تو اُس کے منہ نالگا کر، بس چپ ہو جا۔“ اماں نے اُس کا سر تھپکاتے ہوئے گہا تھا۔

☆.....☆.....☆

ایک کچی بستی کے دو کروں والے گھر کی روز کی آہانی تھی، جس کے چار نقوش تھے۔ اماں، ابا، مشاق اور منی، جب تک اب ار ہے وہ گھر چلاتے رہے، مشاق کے لئے انہوں نے بہت جتن کے گر نہ اُس نے پڑھ کر دیا اور نہ کام پر لگا۔ اب انہیں اُسے کسی کی دکان پر بھایا وہاں سے بھاگ آیا، پھر گیراج میں لگایا وہاں تھی چار دن کام کر کے چھوڑ دیا، وہ سارا دن اپنے دوستوں میں بیٹھا رہتا، ابا بیچارے اس فکر اور شیش میں گھلتے رہے کہ میرے بعد بیوی اور منی کا کیا ہو گا۔ اور اسے ساتھ لیے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے، ابا کے جانے کے بعد گھر کے معاشری حالات بہت خراب ہو گئے،

مشاق سدا کا لاپرواختا، اماں نے ہی کچھ گھروں میں کام کرنا شروع کر دیا اور جیسے یعنی زندگی کی گاڑی پھر رواں ہو گئی، وہ تو شکر تھا کہ قیلی چھوٹی تھی اور گھر بھی اپنا تھا اس لیے روکی سوکھی کھا کر بھی زندہ رہنے کی کوشش کامیاب رہی، منی یہ سب حالات دیکھتے ہوئے بڑی ہوئی تھی، اُس کا دل اماں کو کام کرتا دیکھ کر بہت دھکتا تھا۔ سبھی وجہ تھی کہ وہ جب آٹھ جاع عینیں پڑھ کر تو اُس نے اسکوں چھوڑ کے گھر سنبھال لیا کہ اماں کا بوجھ کسی طرح کم ہو ورنہ باہر کے کام کرنے کے بعد آ کے

”بس اماں یہ تمہاری ہی ڈھیل ہے جو پہ اتنا بکواس کرتی ہے ورنہ کون اپنے بڑے بھائی کو جواب دیتا ہے۔“ مشاق نے جواب اماں کو بھی سنا دیا۔

”کیا بکواس کی ہے میں نے میں نے؟ بتانا ذرا؟“ منی نے بھی دو بدو سوال کیا۔

”بس چپ ہو جا درستہ سمجھ کے ماروں گا۔“ مشاق نے پانی پیتے ہوئے جو گلاں اُس کے پاتھ میں تھا وہیں سے منی کو دھکانے کے لیے دکھایا۔

”ہاں ہاں! ما رو مگر یہ سوچ لینا کہ تمہارا کیا ہو گا؟“ منی نے لکا را۔

”چل بس رہنے دے خود کو کیا سمجھتی ہے تو نہیں ہو گی تو کیا ہم بھوکے مر جائیں گے؟“ مشاق اس تھرا سائے بجھ میں بولا۔

”ایسا ہی ہو گا کوئی مفت میں نہیں کھلاتا یہ حراموں کو۔“ منی بھی چپ رہنے والی کہاں تھی اور پھر آ..... آ..... منی نے اچاک چین ماری اور ماتھے پر ہاتھر کئے تیٹھی چلی گئی۔ مشاق نے اُس کے پڑھام کہنے پر وہ سلوک کا گلاں دے مارا تھا، جو اُس کے ہاتھ میں تھا۔

”ارے خبیث تھے خدا کی یار، بد جنت غرق ہو گئیں۔“ اماں نے مشاق کو چل کھینچ ماری، جس سے وہ پچھتا ہوا باہر نکل گیا۔

اماں منی کو اٹھانے لگیں، جس کے ماتھے پر فروڑی گورنر نکل آیا تھا۔

انہوں نے فوراً ہی دو پشہ منہ پر رکھ کر گرم سانسوں سے پھوٹک ماری اور منی کے ماتھے پر بکور کرنے لگیں۔

”دیکھ لے اماں سارا دن محنت کر کے اس گھر کو چلاتی ہوں اور گالیاں بھی کھاتی ہوں۔“ منی

بھی اماں آرام سے بیٹھنے پاتی تھیں۔

”منی تو نے خواہ مخواہ پڑھائی چھوڑی، بیٹا دس

جھائیں تو پڑھ لیتی۔“ اماں کو منی کے پڑھائی

چھوڑنے کا بہت دکھ تھا۔

☆.....☆

منی نے تو کری شروع کردی تھی گھر کے حالات
میں ہوڑا ساہی فرق پڑھا۔

”آئے ہے نور جہاں اب کیا بھی سے تو کری
کرواؤ گی؟“ پڑوس کی خالہ ناک پر ہاتھ رکھے اماں
سے پوچھ رہی تھیں۔

منی نے آنکھ کھولتے ہی انہیں دیکھا تھا وہ
بالکل اماں کی سگی بین کی طرح تھیں ہر دکھ سکھ میں
شریک اور دیے بھی چھوٹے علاقوں میں رہنے
والوں کے درمیان اپنا نیت زیادہ ہوتی ہے اور وہاں
کے رہنے والے ایک دوسرے کے گھر بیوی معاملات
میں بھی اپنے رائے دیتے ہیں جیسے یہاں کے گھر کا
ہی مسئلہ ہو بھی وجہ تھی کہ جب انہوں نے دوچار دن
تک منی کو روزانہ ایک مخصوص نام پر آتے جاتے
دیکھا تو فوراً بھی گئیں، اوار کا دن تھا منی گھر پر ہی
تھی۔

”ہاں! تو خالہ کیا کریں اماں سے تو اب کام
نہیں ہوتا پھر کون کھلانے گا ہمیں؟“ اماں کے
مجاہے منی نے جواب دیا۔

”ایے وہ مختار نہ کہاں گیا اُس کو بولو وہ
کیوں نہیں کرتا کام۔“ خالہ نے جواب کہا۔

”خالتم جاتی تو ہو سب پھر بھی یہ بات کہہ رہی
ہو۔“ منی نے ٹکھوہ کیا۔

”ارے مجھے کب شوق ہے اپنی بچی سے تو کری
کرانے کا وہ غبیث کی کام کا ہوتا تو یہ نوبت ہی نہ
آتی۔“ اماں نے آہ بھری۔

”میں تو کہتی ہوں اُس کی شادی کرا دے دیکھا
کیسا تیرکی طرح سیدھا ہو جائے گا۔“ خالہ نے اپنے

”رہنے والے اماں ہم جیسے لوگ دس کیا میں
جھائیں بھی پڑھ جائیں نا تو بھی پکھ فائدہ نہیں تو
فکر نہ کریں آرام کر، اب میں کروں گی سب۔“
منی نے اماں کو تسلی دی اور خود روٹی پکانے لگی۔

☆.....☆

اماں اب تھکنے لگی تھیں اس لیے منی نے ایک
دن پچکے سے پڑوس کی ذکیرہ باہی جو گارمنٹ
فیکٹری میں کام کرنی تھیں سے اپنے لیے بھی کام
کے لیے کہا، جنہوں نے دوچار دن کے بعد ہی منی
کو خوشخبری سنادی کہ اُن کے ہاں دھاگے کاٹنے
کے لیے کچھ لاڑکوں کی ضرورت ہے اور انہوں
نے منی کی بات کی سے اتنے ماکان سے۔

”ارے منی تو کیسے گرے گی تو کری؟“ میری
بچی ابھی تو بہت چھوٹی ہے۔“ اماں کو جب پتہ چلا
تو انہوں نے اسے روکنا جاہا۔

”نہیں اماں مجھے نوکری کرنے والے بھائی
سے تو کوئی امید نہیں ہے اور تم بھی تو اب بہت
تھک جاتی ہو بس جیسے ہی میری نوکری لگے تم کام
چھوڑ دینا۔“ منی نے اماں کے ہاتھ دباتے
ہوئے کہا۔ اماں ابھی کام سے آکے چارپائی پر
لیٹی تھیں۔

”مگر.....“ انہوں نے کچھ کہنا جاہا۔

”بس اماں تو مجھے ہی اپنا بیٹا سمجھ لے۔“
منی نے اماں کو تسلی دی تو وہ منی کو بیکھتی رہ گئیں
اُن کی بیٹی کتنی حساس اور سمجھدار تھی اور ایک وہ نکلا
جس نے ایک دھیلا بھی کما کے نہ دیا، ایسا نہیں تھا کہ
وہ غلط محبت کا عادی یا کسی نئے میں گرفتار تھا۔ اُس وہ

طور پر مسئلے کا حل پیش کیا۔

”تاجی نا میں کسی کی بھی کو کیوں کنویں میں دھکلیوں، اس لئے ہڑام سے بیاہ کر۔“ اماں تو بہت ہی ماں ہیں۔ ”میرے بھی آگے بھی ہے۔“

”خالہ ہم تو چاہتے ہیں کہ بھائی کوئی کام کا ج کرے، اس کا گھر نہیں چاہئے، مگر بھائی کو خود ہی کوئی خواہیں نہیں؛ اگر اسے دُپھی ہوتی تو کام کرتا۔“ منی نے سمجھایا تو پھر خالہ بھی چپ ہو گیں۔

☆.....☆.....☆

وقت کسی کے لیے بھی بھی نہیں ٹھہرتا اس کا کام بھاگنا ہے اور وہ بھاگ جا رہا ہے اس بات سے بے خبر کسی کو کیا ملتا ہے اور کیا چھن جاتا ہے۔ ایک دن اماں کو چکر آیا اور وہ عسل خانے میں گر گئیں، خالہ اور مشتاق فوراً اماں کو اسپتال لے گئے مگر بڑھاپے کی چوت خیڑناک تابت ہوئی، اماں کے کوئے کی بھی ٹوٹ گئی تھی اور یہ شدید چوت لگنے سے اماں ہمیشہ کے لیے بستر پر پڑ گئیں۔

غربت بھی اپنا واغری بیوں پر ہی کرتی ہے منی بے انتہا ہبڑا گئی اب کیا ہو گا اماں کو کون دیکھے گا؟ مگر کام الگ؟ منی نے بخت بھر کی چھٹی لے لی تھی، اسے پتہ تھا کہ اس چھٹی کے پیسے میں گئے گر میں اماں کے پاس رہوں تو پھر مگر کیسے چلے گا منی باور پچی خانے میں بیٹھی سوچ رہی تھی۔

”اب میں ایسا کروں گی صبح ہی صبح اٹھ کر کام کر لیا کروں گی اور شام میں واپس آ کر کھانا بنالیا کروں گی، اور خالہ کو کہہ دوں گی دن میں اماں کو دیکھ لیا کریں۔“ منی نے دل ہی دل میں اپنے سارے دن کام معمول بنالیا، کیونکہ اسے کل سے کام پر جانا تھا۔ ابھی ابھی ذکیرہ باجی کہہ گئیں تھیں کہ اس کی چھٹیاں ختم ہو گئیں، اور کل سے کام پر آتا ہے۔

☆.....☆.....☆

منی نے صبح اٹھ کر جلدی سے اماں کو چاہئے دی اور خود بھی ساتھ ہی چاہئے کے ساتھ دوپائے کھالیے پھر جلدی سے اماں کے لیے دروٹیاں ڈال کر اماں کے قریب ہی رکھ دیں تا کہ اماں خود اٹھا کے کھا سکیں۔ مشتاق سو رپا تھا منی خالہ کو اماں کا خیال رکھنے کا کہا اور کام پر چلی گئی۔

فینٹری میں بھی سارا دن منی کو اماں کا خیال ہی آتا رہا شام کو چھٹی ہوتے ہی وہ گھر کی طرف بھاگی گھر میں داخل ہوتے ہی اُس کو کچھ اچھا سا احساس ہوا، مگر سمجھ میں کچھ نہ آپا وہ سیدھی اماں کے پاس گئی تو اماں اُسے دیکھ کر سکر میں تو اُس کا رکا ہوا سانس بحال ہوا اس نے ارد گرد نظر دوڑا تو گھر صاف ستر انگا، اماں کے ہاس دوسرا چار پائی پر مشتاق لیٹا ہوا تھا، منی نے اماں کو دیکھنے کے بعد باور پچی خانے کا رخ کیا ابھی وہ آٹا گوند ہٹنے کے لیے نکالنے ہی گئی تھی۔

”منی نے آٹا گوند دیا ہے۔“ مشتاق کی آواز ہر منی نے مڑ کے دیکھا اُس کی نظر وہ میں حیرت دیکھ کر وہ بولا۔

”منی تو جانتی ہے مجھ سے تو کری نہیں ہوتی میں شرمندہ ہوں تھے اور اماں سے، مگر اب تو بالکل فکر نہ کر، اماں کو اور گھر کو میں دیکھ لوں گا۔“ منی یہ سب باتیں سن کر حیران کھڑی تھی۔

”منی تو مجھے ایسے نہ دیکھیں مانتا ہوں میں نے تم لوگوں کو بہت نگل کیا ہے۔ مگر اب تو دیکھنا بس گھر کی طرف سے پریشان نہ ہو اور دیکھنا اماں بھی ٹھیک ہو جائیں گی۔“

منی کی آنکھوں میں آنسو آگئے آخ رکھا تو وہ اس کا بھائی ہی نا، کیسے نا ترپتا ماس بہن کی تکلیف پڑ پھر مشتاق نے جو کہا کر دکھایا وہ اماں کو کھانا کھلا دیتا۔ گھر کی صفائی بھی کر لیتا اور سان ہی جیسے تیئے

”منی وہ اچھا آدمی ہے، میں اس سے مل آیا ہوں، بُک تو اللہ پر بھروسہ رکھ ٹھیک ہو گا دیکھ تیری عمر اگر زیادہ ہو گئی تو پھر بہت مشکل ہو گا تو سمجھ رہی ہے تا میں کیا کہر رہا ہوں، ہمارے گھر کے حالات میں یہ رشتہ غنیمت ہے۔“

منی نے ہاں کر دی نکاح سادگی سے کرتا تھا بس تھوڑی بہت تیاری ہونے لگی منی خالہ کے ساتھ جا کر کچھ ضرورت کی چیزیں لے آئی تھی، مشاقب بہت خوش تھا اور بھاگ بھاگ کے کام کر رہا تھا کہ ایک دن اسی طرح بازار سے کچھ سامان لاتے ہوئے کسی گاڑی سے نکلا گیا موقع پر موجود لوگ اسے اپتال لے گئے منی کو جیسے ہی اطلاع ملی وہ فوراً ہی خالہ کے ساتھ اپتال پہنچی اور بھائی کو خون میں لٹ پڑ کیکھ کر بے ہوش ہو گئی اور پھر اسے ہوش میں آنے پر پتا لگا کہ اس کی ریڑھ کی بندی میں ایسی ضرب لگی ہے کہ اب اس کا نالر انداز میں اپنے بیرون پر کھڑا ہو نا تھا، اماں جان گئی تھیں کہ اُن کی وجہ سے شاید اُن کی ممکن تھا، یہ جان لیوا خبر سن کر منی کی چیخ ہی تو نکل گئی اُس وقت فیروز احمد بھگی وہاں موجود تھے، انہوں نے اس دوران میں منی کا بہت ساتھ دیا تھا۔

☆.....☆

مشاقب اب اپتال سے گھر آ گیا تھا اس افرافری میں منی کے نکاح کی تاریخ بھی سر پر آ گئی تھی۔

”بیٹا کچھ یاد ہے ناکل.....!“ خالہ کہتے کہتے رُک گئی تھیں۔

”ہاں یاد ہے۔“ منی نے بالکل ٹھنڈے اور سپاٹ لبجھ میں کہا تھا۔

”بیٹا تاؤ پھر کیا کروں؟“ خالہ نے اس کے بال سینئتے ہوئے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”فیروز کافون آیا تھا۔“

”غالباً آپ انہیں منع کر دیں۔“ منی آہستہ سے

بنائیتا، منی صبح اٹھ کر ناشتہ بناتی اور تینوں مل کر ناشتہ کرتے، پھر وہ کام پر چلی جاتی اور رات کو وہ صرف روٹی بناتی تھی۔ منی اب گھر اور مشاقب کی جانب سے بہت مطمئن ہو گئی تھی، اُس کے سر سے جیسے بوجھ کم ہو گیا تھا۔

کئی سال گزر گئے منی اور اس کے گھر کا وہی معقول تھا اماں اب دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھیں، اُن کو منی کی شادی کی فکر بھی تھی، جس کی عمر اب آہستہ آہستہ بڑھنے لگی تھی خالنے کی رشتہ بتائے تھے مگر دو کروں کا عام سا گھر اور اُس میں پڑا معمولی سامان آنے والوں کو بتا دیتا کہ اس گھر سے صرف لڑکی ہی آئے گی لہذا وہ پلٹ کرنا آتے گو کہ منی کی خواہش تو تھی کہ اُس کا گھر بس جائے مگر اماں کو کون دیکھے گا؟ اس سوال نے اُس کے اس خواب کو بھی ختم کر دیا تھا اور اس نے خالکواب کوئی بھی رشتہ لانے کا منع کر دیا تھا، اماں جان گئی تھیں کہ اُن کی وجہ سے شاید اُن کی بیٹی کا گھر نہ لے گا اس لیے وہ ایک دن چکے سے دنیا سے منہ موڑ گئیں، یہ صدمہ دونوں بہن بھائیوں نے ایک دوسرے کے ہمارے جھیل لیا تھا۔

☆.....☆

منی کی اب وہی روشن تھی البتہ مشاقب میں جو بدلا داؤ آیا تھا وہ برقرار رہا وہ اب منی کا بھی بہت خیال رکھتا تھا زیادہ وقت گھر میں رہتا، منی کی شدید خواہش تھی کہ وہ گھر میں رہے اور بھائی نوکری کرے، مگر اب تو عرصہ ہو گیا تھا کہ وہ یہ خیال آنے پر سر جھٹک دیتی تھی۔

منی اب بتیں کی ہو گئی تھی برسوں بعد خالہ منی کے لئے پھر ایک رشتہ لے کے آئی تھیں، فیروز احمد کی بیوی مرچکی تھی اور ایک بچی تھی شریف آدمی تھا خالہ کا اصرار تھا کہ منی ہاں کر دے مشاقب نے بھی اُسے سمجھایا۔

بولی تھی مباراہ بھائی سن نالے۔

”بھئی..... خالہ جیران ہوئیں۔

”یہ کیا کہہ رہی ہے منی؟“

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں میں بھائی کو اس
حالت میں چھوڑ کے نہیں جا سکتی۔“ خالہ نے بہت
سمجھایا مشتاق نے بھی بہت زور دیا۔

”منی مجھے اور شرمندہ نہ کر میں نے ساری
زندگی تیرے لیے کچھ نہیں کیا اب میں تیری یہ خوشی
نہیں چھین سکتا، دیکھنی انکار نہ کر۔“ گرفتار کا فیصلہ
اٹل تھا۔

”بیٹا تو نے بہت مشکل فیصلہ کیا ہے، خدا تیری
مد کرے۔“ خالہ نے منی کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی
اور چالیں گئیں۔

☆.....☆.....☆

خالہ نے فیروز احمد تک منی کے انکار والی یہ بات
پہنچا دی تھی، اُدھر سے کوئی جواب نہ آتا تھا۔

”ہونہے.....“ منی استہرا سیئی ہتھی تھی۔

”اللہ نے میرے نصیب میں کوئی خوشی لکھی ہی
نہیں ہے۔“ رات کو آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے
اس نے سوچا تھا۔

منی کے شب دروز پھر سے وہی ہو گئے، وہ صح
بھائی کو ناشتہ کرائے کام پر چلی جاتی اور شام میں
آکے کھانا پکایتی، مشتاق بہت مشکل اور تکلیف سے
لئکر انگڑا کے کام کرنے کی کوشش کر لیتا تھا، جس پر
منی اسے بہت منع کرتی تھی مشتاق بہن سے بہت
شرمندہ تھا اکثر وہ اُس کا انٹہا رکھی کرتا تھا اُس کا بس
نہیں چل رہا تھا کہ وہ منی کی خوشی کے لیے کیا
کرے۔ اس دوران میں خالہ اکٹھاں کے گھر کا چکر
لگاتی تھیں۔

ایک دن منی گھر آئی تو خالہ بیٹھی ہوئی تھیں۔

”سلام خال.....“ اُس نے تھکی سی آواز میں کہا

برکات ہائی ناشاد

اور وہیں بیٹھ گئی۔

”بھیتی رہ میری بچی۔“ خالد نے اُس کے سر پر
ہاتھ پھیرا۔

”بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہے۔“
”ہاں خالد.....!“ منی نے لبی سانس لی۔

”اللہ جنہے صغا کو بہت اچھی تربیت کی ہے تم
دونوں کی۔“ خالد نے بات کا آغاز کیا۔

”جتنا تو بھائی کا خیال رکھتی ہے اسے بھی تیرا
اتنا ہی خیال ہے۔ وہ کڑھتار ہتا ہے تیرے لیے۔“
خالد نے وقفہ لیا۔

”پر بیٹا تو ایسا نہ کر کچھ اپنے لیے بھی سوچ۔“

”کیا کروں خالد سب تھجھ تو تمہارے سامنے
ہے، میں بھائی کو کس کے سہارے پر چھوڑ کے جلی
جاوں؟“ منی نے آہستہ سے کہا۔

”بیٹا اس کا ایک حل ہے۔“ خالد نے اُس کو بغور
دیکھا۔

”کیا؟“ منی نے سوالی نظر وہ سے پوچھا۔

”وہ یہ کہ تم شادی کر کے بھی رہو۔“ خالد کا
جواب سن کر منی پھر حیران ہوئی۔

”کیا کہہ رہی ہو خالد وہ کیسے ہو گا۔“

”وہ ایسے کہ آپ اپنے بھائی اور میری بیٹی کو
سنجنانا اور میں تم سب کو ہم سب مل کے بھی تو رہ
سکتے ہیں نا۔“ آواز پر منی ایکدم اچھل پڑی، منی کے
گھر میں مشتاق کے ساتھ کمرے میں موجود فیروز
احمد اب باہر آ کر اس کے سامنے کھڑے تھے۔

”آپ۔“ وہ ایک دم گھبرا گئی۔

”جی میون تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں اتنا خود
غرض ہو سکتا ہوں اسے گھر کو بانے کے لیے کسی کو
بھی پریشان کروں، تھجھے تمہاری پریشانی اور قربانی
دونوں کا احسان ہے اور میں اس کی قدر کرتا ہوں
اور اس کا حل میں نے یہ سوچا ہے کہ اپنا گھر کرایہ پر

☆☆.....☆

”سچی کہانیاں“ پڑھنے والوں کو اگر پرچہ ملنے میں دشواری ہے تو ”سچی کہانیاں“ کے دفتر فون کر کے مطلع کریں ہم آپ کو پرچہ آپ کے گھر کے پتے پر ارسال کریں گے اور اس کے ساتھ ساتھ آپ کا نام قرعدہ اندازی کے لیے بھی شامل کر لیا جائے گا۔

پہلا انعام..... موبائل فون

دوسرا انعام..... 6 ماہ کے لیے ”سچی کہانیاں“ جاری تیسرا انعام..... 3 ماہ کے لیے ”سچی کہانیاں“ کے ساتھ ”دوشیزہ“ کی بھی اعزازی کا پی ارسال کی جائے گی۔

اس کے علاوہ آپ آن لائن بھی پرچہ منگوا سکتے ہیں، مزے سے گھر بیٹھے بٹھائے آپ کا پسندیدہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں.....

ایک بہت ہی خاص منفرد موضوع پر لچک پڑھیں



(دوسری قسط)

غیاث الدین غیاث کا خیال

نقاشہ وقت کا ہے یہ کہ لکھو
لکھیں گے ہم کہ ہم راتم ہوئے ہیں

روشنائی سبھیں مہاروی

جم کرنے کے بعد وہ ابھی اپنے روم میں آیا ہی تھا۔ جہازی سائز بیڈ پر بے دردی سے ناول اچھالا اور کانوں سے ہیڈفون اتارے اُس کا مودہ بے حد آف ہو رہا تھا۔ صبح صبح بازغہ سے ہوئی بحث نے اُسے سخت کوفت میں پبتلا کر دیا تھا۔

”کیا بھی لڑکیاں اتنی ہی جھگڑا لو ہوتی ہیں؟ او گاؤ، پلیز سیوی۔“ وہ بھنوں میں اچکاتا ہوا بڑا بڑا یا اور اسکیرز کے تی کھولتے ہوئے اپنے پیروں کو آزاد کر کے خود کو قدر رے ریلیکس کیا۔ سامنے دیوار پر انہائی نشیں وڈور کیا گیا تھا، جس میں فل سائز Curved LED TV بہت مہارت سے آؤزیں کی گئی ہی، اور ساتھ ہی ڈی وی ڈی DVD پلیسٹر کھا گیا تھا۔ وڈ کا مقشش کام اتنی باریک بیٹھ اور نفاست لیے ہوئے تھا کہ ایک لمحہ کو دیکھنے والے لحر زدہ ہو جاتے۔ اُس میں مدھم مدھم لامیں یوں نصب کی گئی تھیں، جیسے کسی دیوالی میں بہت سے روشن ٹائماتے دیے ایک ساتھ رکھ دیے ہوں۔ اُس نے اپنے کمرے کا انتری میز خود کیا تھا، جس میں رواں پن کے احساس کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ جدت کا حسین امتراز بھی کیا گیا تھا۔ اُس میں بلاکی Aesthetic Sense تھی۔

اب وہ کاؤچ پر نیم دراز تھا، پاٹھ بڑھا کر لکڑی کی گول تپائی سے ریکوٹ اٹھایا، اور میوزک سسٹم آن کیا۔ کمرے میں Beyoncé (امریکن سنگر) کی خوبصورت آواز گوئی بخوبی۔ وہ میوزک کاریا تھا۔ اُس کے پاس دنیا کی بہترین میوزک کلیکشن تھی۔ دفعتاً مو بائل کی بیس نے اُس کا ارتکاز توڑ دیا۔

اُس نے کلمندی سے مو بائل فون اٹھایا تو باز نہ کامبر بلنک کر رہا تھا۔ اُس کا مودہ مزید خراب ہو گیا۔ ”کچھ کسر رہ گئی ہے؟“ راتیہ بحال ہوتے ہی وہ اُس پر بر سے لگا۔ خوب کلاس لینے کا مقصد کیا، دوسری طرف وہ پٹ آنسو بھاری تھی۔



”او..... کم آن یار..... پلیز نومورٹینش.....“ وہ چڑھا۔

”میں جانتا تھا کہ اپنے تم ضرور و نادھونا مجاو کی، آئی نو دیری ویل..... ابھی تسلی تم سب لے کیاں پا گل ہوتی ہو۔ سلسلے خود ہی لڑتی ہو اور پھر خود ہی مظلوم بن جاتی ہو۔ آئیم سک آف دس۔“ اُس کے غصے کا گراف ذرا بھی نیچے نہ آیا۔

”آئم سوری معید..... مجھے یکدم ہی اتنا زیادہ غصہ آگیا تھا۔ جب بھی میں تم سے پھر نے کا سوچتی ہوں..... میری جان نکلنے لگتی ہے، بھجہ بھیں آتی کہ مجھے کیا ہو جاتا ہے۔“ بے بھی سے کہتے ہوئے اُس کی آواز زندہ گئی۔

اور معید خان..... اُس کے چہار سو چیزوں جلتر گل بجھے لگے۔ کرے کی ہرشے چیزوں میکانے لگی۔ سازِ محبت اُس کے وجود کے گرد قصائص تھے۔ جس کے آنسو بھی اُسے زم نہیں کر پائے تھے اُس کی جاہت کے اس معصوم اظہار پر وہ یکدم زم پڑ گیا تھا۔ اُس کے غصے کی آتش کو محبت کی محنڈی میٹھی پھوار نے جھوٹوں میں ٹھنڈا کر دیا تھا۔

”کیا ہو جاتا ہے میری جان کو؟“ اُس کے تیور ہی نہیں؛ اُس کا لبچہ بھی بدلتا گیا تھا۔ یہ بے باکانہ اندازِ تکلم پاز غد کو پالی پانی کر گیا۔

وہ فطرت ہی شریملی تھی۔ تین سال میں اُس نے معید خان کے سامنے کہی کھل کر اپنے جذبوں کا اظہار نہیں کیا تھا۔ پھر بے ساختی میں یہ کیسی بے اختیاری ہوئی تھی؟ وہ بری طرح بیش کر گئی۔ اُس کی خاموشی پر معید خان گویا ہوا۔

”اگر مجھے اظہار کا یہ نصیب ہو گیا ہے تو جانا اپنے جذبوں کو آج اذن گویاں دے دو..... یہ کترانا کیوں..... یہ شرمانا کیسا؟ یہ کھبر اہٹ کیوں نہیں؟ تمہارا ہوا ہوں، پورے دل و جان کے ساتھ..... تو مان لو ناں کہ تم بھی میری ہو..... میری بننا چاہتی ہو.....“ وہ جادوئی جھوٹوں کا اسیر ہونے لگا۔ اُس کا پرسوں لبچہ بازنہ جدون کے ہوش اڑا گیا۔

”معید خان..... پلیز.....“ وہ بے بھی سے بولی۔

”جان معید.....“ وہ ترپا۔

”تم بہت بڑے ہو۔“ وہ خفا ہوئی۔

”او تم بہت اچھی۔“ وہ جیسے تھک گیا۔ چاہتوں کی شدتوں کا بوجھ ڈھونتا آسان کہاں تھا۔

”معید خان..... محبت اعزاز ہوتی ہے،“ اور جب انسان یہ آئی رکھتا ہو، کہ اپنے محبوب کے لیے وہ صرف محبت کے آسان پر چکنے والا ستارہ نہیں، بلکہ پورا آسان ہے تو اُس کے قدم زمین پر نہیں لکتے۔“ وہ ناصحانہ انداز میں کہہ رہی تھی، حرف حرف میں آن دیکھا کرب آٹھ کار تھا۔ لیکن میرے نصیب میں شاید ہر خوشی ادھوری ہے۔ میں حرمائی نصیب، تمہاری محبت پر نا زال ہونے کے ساتھ ساتھ بہت احساس جرم بھی لیے ہوئے ہوں۔“ دردکی اوس میں بھیگا لبچہ معید خان کو کل کر گیا۔

”باز نہ جدون! ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، محبت بھیک نہیں ہوتی،“ کہ کسی کی جھوٹی میں یونہی ڈال دی جائے۔ سارا کھل نصیب کا ہے، اس دل نے صرف تمہارے لیے دھڑکنا سیکھا ہے۔ تمہارا عشق لہو میں

حلول کر گیا ہے، میری دھڑکنیں صرف تمہارے نام کی مالاچیتی ہیں تو اس میں میرا کیا قصور..... میرے ہاتھوں کی لکیروں میں بھی پریشے خان آفریدی نہیں لکھی۔ ”معید خان کا لہجہ آجھے دے رہا تھا۔ ”لیکن میں بہت گلٹ میں ہوں معید! پریشے جیسی پیاری لڑکی کا حق چھین رہی ہوں وہ لڑکی کھرے سونے جیسی ہے جس کا کوئی مولیٰ نہیں پھر میں اس جرم کی مرکب کیسے ہو گئی؟ یہ احساس جرم مجھے چین نہیں لیئے دیتا۔ ” وہ خخت مضطرب ہی۔

”پریشے خان کا مجھ پر بھی کوئی حق نہیں رہا“ اور نہ ہی میں نے اسے کبھی یہ حق دیا کبھی بلکہ ساکوئی اشارہ بھی نہیں کر میں اپنے دل کے کوئی خاص میں اسے کوئی خاص مقام دیتا ہوں۔ اس کا مجھ سے منسوب ہوتا، خاندان کے بڑوں کا مخفی ایک جذباتی فیصلہ تھا اور کچھ نہیں اور یہ سب میں تمہیں بارہا سمجھا چکا ہوں۔ ” وہ عاجز آ گیا تھا۔ سوتھی انداز میں دونوں بات کر رہا تھا۔ چھٹے گئی دن سے اُن کے درمیان یہ موضوع تنازع کا باعث بنا ہوا تھا۔

”معید! لڑکیاں بہت نازک اور حساس دل کی مالک ہوتی ہیں، وہ بچپن سے تم سے منسوب ہے اُس نے جانے کتنے خواب تمہارے نام کے اپنی پلکوں تلنے سینت رکھے ہوں گے۔“ اُس کی سوتی ابھی بھی وہیں اکنہی ہوئی تھی۔

معید خان آفریدی کے ضبط کا پیانہ چھکلنے کو بے تاب تھا۔ ماتھے کے بل مزید گہرے ہو گئے۔ ”اوے پلیز زیادہ سینٹی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اُس نے بازنگو بیری طرح جھٹک دیا۔ ” وہ تمہاری طرح بے وقوف نہیں ہے وہ بے حد **Sensible** اور پیچور ہے، اور بہت **Understanding** اہمیت نہیں رکھتی ہوں گی اور میں مانتا ہوں کہ پریشے بہت اچھی اور پیاری لڑکی ہے، میں اُس کا بے حد احترام کرتا ہوں لیکن مجبت؟ دل کے معاملوں پر اختار کہاں؟“ وہ خخت کیدی خاطر ہو رہا تھا۔ اگرچہ پریشے خان بچپن سے اُس کے ساتھ منسوب تھی اور وہ اُس کی سکی پچازادتی۔ لیکن اُن میں کبھی مجبت تو دور دوستی بھی نہ ہو پائی۔ ہیلو ہائے سے زیادہ کی نوبت بھی نہیں آئی تھی۔ وہ خود میں مُنْ رہتا تو وہ بھی لیے دیے انداز میں رہتی البتہ بی بی جان اور آغا جان سے اُس کا لگاؤ والہا نہ پن لیے ہوئے ہوتا تھا۔

”آئی ایم سوری معید وہ اکچھے نئیلی جب سے بی بی جان میری ماما کو ملنے آئی تھیں اور تمہاری اور میرے بھائی کی شادی کو لے کر ایکسا بیٹھنڈ ہو رہی تھیں اُسی دن سے۔“ وہ اُس کے غصے سے خائف رہتی تھی، گھبراہٹ میں بات ادھوری رہ گئی۔

”اوے کے ناؤ ریلیکس لیوات ہمیں اپنے دن کو اب مزید **Spoil** نہیں کرنا جائیے۔ میں فریش ہولوں، شام میں بات کرتے ہیں۔“ اُس نے خود کو کپوز کرتے ہوئے مجبت سے اسے نئی دی جانتا تھا کہ وہ بے وقوف لڑکی کس درجہ حساس ہے۔ اور اب وہ اسے مزید نئیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

”اوے کے تم خفا تو نہیں ہو نا۔“ بازنگ نے ڈرتے ڈرتے جیسے یقین دہانی چاہی۔

معید خان کے لبوں پر اک بے ساختہ گھبراہٹ ریکھ گئی۔

”نہیں..... بابا..... تم سے خفار ہنا میرے بس میں نہیں..... پاکل لڑکی۔“ معید نے محبت سے ڈالنا تو پاز غم کی آکھیں اُس کے بے تھا شاہ پیار پر جھلما گئیں۔
 ”اپنا خیال رکھنا..... بائے۔“ پاز غم نے لائن کاٹ دی۔ تو معید خان و اش روم کی طرف بڑھ گیا۔ معاون افواں و خیزان سی پریشے ہاتھی کا نپتی اُس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بھونچ کا سا و اش روم کے دروازے میں ایستادہ تھا۔

”معید..... وہ بابا جان کا فون آیا تھا۔ وہ تیمور.....“ پری کی آواز گلے میں رندھنی۔

”تیمور..... کیا ہوا تیمور کو؟“ معید خان گھبرا کر آگئے بڑھا۔ پریشے کے لرزتے ہونٹ اور کان پتھر ہاتھ کی انہوںی کا پتھر دے رہے تھے۔ ورنہ اس سے پہلے وہ بھی اُس کے بیڈروم میں یوں نہیں آئی تھی۔
 ”ICU..... تیمور..... اماں ادھر کمرے میں بے ہوش۔“ وہ بے حد خوفزدہ تھی اُس کے حلق سے بیشکل آواز نکل رہی تھی۔ لفظ لوث پھوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔

”پریشے..... فارگاڈ سیک! خود کو سنجنالو..... اور مجھے بتاؤ کہ تیمور کہاں ہے؟ اور جاچی جان؟“ وہ اتنی وحشت زدہ ہو رہی تھی کہ معید خان نے اُسے بازوؤں سے پکڑ کر جھنجور دیا۔ اُس کے ہم لفظوں نے معید خان کو حواس باختیہ کر دیا تھا۔

وہ اُس کے بازو پر سر نکا کر پھوٹ کر رودی۔ معید ضبط کے کٹے مرحل سے گزر رہا تھا۔
 وہ انتہائی درجہ محتاط طبع لڑکی اس وقت شدید بے نی میں تھی۔

”تیمور کو گولی لگ گئی ہے معید اور وہ آئی سی یو میں سے..... اماں ادھر ہاں میں بے ہوش ہو کر گرگئی ہیں..... تم پلیز..... ہمیں فوری پاس پیٹل لے چلو۔“ وہ سکتے ہوئے جانے اور بھی کچھ کہہ رہی تھی۔
 لیکن معید خان کی ساعیں تو جیسے مزید پوچھنے سے انکاری ہو گئی تھیں۔

”تیمور کو گولی لگ گئی ہے.....“ اُس کے ارد گرد جیسے بلاست ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

زمالة نے اپنی گرے کلر کی فورڈ فوکس ریورس گیئر میں ڈالی اور معیز کی طرف گذ بائے کس احتجاتی ہوئی گاڑی بھالے گئی۔ وہ ایلنگ سے تقریباً 5 کلومیٹر درساو تھے ہاں میں لیڈی مارکیٹ روڈ پر ہتھی جہاں زیادہ تر پاکستان اور انگلین کیوٹی تھی۔

خنک شام میں لمحہ بہ لمحہ سردی کی شدت بڑھ رہی تھی، گھرے ہوتے پا دلوں نے یکا یک پورے آسان کو یوں سیاہی مائل دیز انڈھیرے سے ڈھک دیا، گویا شام رات کے کواڑ پر دستک دینے کو بے تاب ہو رہی ہو۔

دراز قامت سامعیز خان Soviet کی چیزیں پرڈارک براؤن لیدر جیکٹ پہننے ہوئے تھا۔ گزرے لمحوں کی چاشنی ابھی تک اُسے مسرور کر رہی تھی۔ خمار آلو دلمچے جنوں خیزی لیے ہوئے تھے۔ اُس نے دونوں بازووں میں یوں پھیلانے، گویا پوری کائنات کا عشق اپنی دھڑکنوں میں سینئے کا خوبیاں ہو۔

وہ ارد گرد کی ہرشے سے بے نیاز تھا، اور اس پات سے بے خبر بھی کہ کسی کی عقابی نظریں اُسے اپنے سخت حصار میں لیے ہوئے ہیں۔ اک لبی سانس بھر کر اُس نے طلبانی لمحوں کی قید سے جیسے خود کو آزاد

کرایا، اور اپنی تھیلیاں رگڑتے ہوئے جیکٹ کی زپ اور چڑھائی لبے لبے ڈگ بھرتے ہوئے اب اُس کارخانے کی کارکی طرف تھا۔

معام سوپاکل کی بیس پر اُس کے ہاتھ اپنی سائیڈ پاکٹ کی طرف بڑھا، سعودی عرب سے بی بی جان کی کال تھی۔ وہ ڈرائیور گ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ بی بی جان اپنے مخصوص لب والہی میں مغلے ہمکوؤں کی پیڑاری کھولنے کے بعد اب اُس کی خوب کلاس لے رہی تھیں۔ وہ بچپن سے ہی انتہائی ضدی، خود سراور سر ش طبیعت کا تھا، لیکن بی بی جان اپنی پہلوائی کی اولاد پر جان نچھاوار کرتی تھیں، البتہ آغا جان اُس کی عادات و حوصلے سے سخت خلاف رہتے تھے۔ وہ بھی ماں سے سببناز یادہ لگا گواہ کھٹا تھا۔ اس وقت بھی کان دبائے اُن کی ڈانٹ چپ چاپ سن رہا تھا۔ بیوں برلنیشن مسکراہٹ رقصائی تھی۔

اُسے فون پر مصروف دیکھ کر ایک لامبا ٹکڑا دیویکل آدمی چیتے کی سی برق رفتاری سے اُس کے عقب میں کھڑی BMW میں جا بیٹھا، اور فون پر کسی کو ہدایات دینے لگا۔

”لڑکی، یہاں سے جا بچکی ہے..... اب وہ اکیلا ہے..... اور شاید اپنے گھر کے لیے نکل رہا ہے.....“
معیر خان کی گاڑی کو کینہ توڑ نظر وہی سے دیکھتے ہوئے وہ سخت لمحہ میں بولا۔

”اوکے.....“ دوسرا طرف سے مختصر جواب آیا۔
”میں مسلسل اس پر نظر رکھے ہوئے ہوں، یہ کافی ہوشیار لگ رہا ہے مجھے..... تم اپنے آدمیوں کے ساتھ ہار و سڑیب کے قریب رہنا۔“ اب کی بار اُس کا لہجہ سختی کے ساتھ ساتھ تھکمانہ انداز لیے ہوئے تھا۔
وہ ایک مقامی آدمی تھا، جس کا نام موئی تھا۔

معیر خان کا گھر باوز لوشنرل میں بنیل روڈ پر تھا، اور ہار و سڑیب (PUB) اُس کے گھر کے راستے میں پڑتا تھا۔ موئی نے معیر خان کے بارے میں چیدہ چیدہ معلومات اکٹھی کر کھی تھیں۔ وہ کہاں رہتا تھا؟ اس کی ایکٹھی شیش کیا تھیں؟ اُس کے پوینٹری آئنے جانے کی نائیگ اور یہ کہ وہ کس سے ملتا ہے؟ یہ ساری اتفاقیں میشنز اُس نے پچھلے ایک بختے میں اکٹھی کی تھیں۔

”ہم اس وقت PUB کے قریب ہی ہیں، بس تم خال رکھنا کہ اُسے تم پر ڈرا بھی شک نہ ہو کہ تم اسے فوکو رہے ہو۔“ فون کے دوسرا طرف سے اُس کے ساتھی ہیری کی سفاک آواز ابھری۔

”ڈونٹ وری!“ میں جانتا ہوں ہمارے کام میں ذرا سی لاپرواہی ہماری جان لے سکتی ہے۔“ موئی کا سرد لہجہ روکھاپن لیے ہوئے تھا۔ وہ چہرے مہرے سے ہی انتہائی ظالم اور سفاک لگ رہا تھا۔ اُس کے چہرے کے نقوش بے حد پتھر لیے اور رختی لیے ہوئے تھے، داہنے گال پر اک گہرا زخم کا نشان اُسے مزید بیبیت ناک بنا رہا تھا۔

موئی اور ہیری ایکٹھن (اینگ سے تقریباً 2 کلو میٹر دور ایک علاقہ) کے مشہور ڈرگ ڈیلر تھے جو قتل و غارت گری کے علاوہ مار پیٹ، غنٹہ گردی اور ہر طرح کے جرم میں ملوث تھے۔ موئی جانتکن تھا جبکہ ہیری نسلائی ہو دی تھا۔ اندر رو لذت میں دونوں کا یارانہ اور سنگدی مشہور تھی۔

معیر خان نے ایکٹھن میں چاپی گھمائی، گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔
”بی بی جان آپ اپنا خیال رکھنا، میں گھر جا رہوں آپ سے رات میں بات کرتا ہوں۔“ اُس نے

دلار سے کہا۔

”چل جھوٹا کہیں کا..... رات کو خاک فون کرے گا..... کئی کئی دن ماں کو فون نہیں کرتا..... ہم جانتا ہے، تم کو اپنی ماں کی ذرا بھی یاد نہیں آتی۔“ ان کا لہجہ گلوکیر ہو گیا۔ معیر سے ان کی محبت کا یہی عالم تھا۔

”اوی بی جان..... بلیوی..... میں آپ سے بہت پیار کرتا ہوں اور یاد تو انہیں کرتا ہے، جنمیں وہ بھول گیا ہو۔ آپ تو ہمیشہ میرے دل میں رہتی ہیں۔“ اُس کے لہجے میں سچا یاں تھیں۔

لبی بی جان اُس کی ذات کے اس ثابت بدلا و پر تحریز دہ ہونے کے ساتھ ساتھ خوش بھی تھیں کہ وہ ان کی ڈائٹ کے جواب میں کس قدر حلاوت سے بات گر رہا تھا۔ انہیں اپنے صدی سے بیٹھے پر ٹوٹ کے پیار آیا۔

”خوش رہ میرا چھ..... جیتا رہ۔“ ان کے لہجے میں متا کا غور تھا۔

”آج تمہارا یو ٹیورٹی کا آخری دن تھا تو؟“ وہ مزید گویا ہو گیا۔

”لبی بی جان، میرا فائل مسٹر تھا، اسی لیے تو اتنی مصروفیات کے باعث آپ کو کال نہیں کر سکا۔“ اُس کا جاتا ہوا انداز شرارت بھرا تھا۔

لبی بی جان کے لمبے پر اک جاندار سکراہٹ ٹھہر گئی۔

”بے شرم کہیں کا..... اپنی ماں کو ستاتا ہے۔“ انہوں نے لاڑ بھری ڈائٹ پلاٹی۔

”اب ہم فون رکھتا ہے..... تم اپنا خیال رکھنا۔“ انہوں نے اُسے دعاوں کے حصار میں باندھتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

”شاید وہ بدل رہا ہے.....“ لبی بی جان موبائل ہاتھ میں تھامے خوش فہم سوچوں میں گھرنے لگیں۔

بھوولی سی لبی بی جان اس بات سے انجانان تھیں، کہ ان کے بیٹھے عشق کا رنگ چڑھ گیا ہے۔

اور عشق تو اپنی ذات کو بھی بھلا دیتا ہے، پھر معیر خان کی خنت گیر فطرت زماہوں میں کیسے نہ ڈھلتی۔

مونی کا ایک ہاتھ اسٹرینگ پر تھا جبکہ دوسرا ہاتھ سائیڈ پاکٹ میں رکھے 12 بور کے پسل کی طرف ریکھ رہا تھا، وہ خاصا چوکنا ہو کر اُس کا پیچھا کر رہا تھا، سرتا پا وہ سیاہ لمباں میں ملبوس تھا، ہاتھوں پر دستانے چڑھا رکھ کے تھے اور گلے میں سیاہ اونی مفلوج جیکٹ کے کالر میں یوں لپٹا رہا تھا کہ اُس کے کافنوں کے ساتھ ساتھ اُس کا چھر بھی کافی حد تک ڈھکا ہوا تھا۔ پہلی نظر میں اُسے شناخت کرنا مشکل تھا۔

معیر خان خوش دلی سے بہت ریلیکس موزیں ڈرائیور کر رہا تھا جسے اُسے گھر پہنچنے کی قطعاً جلدی نہ ہو۔

مونی بہت محتاط انداز میں ڈرائیور کرتے ہوئے کان کے قریب ٹھی Bluethuth آن کر چکا تھا۔

”چند منٹ کے توقف کے بعد وہ ہارو شریب کے قریب پہنچے والا ہے۔ Am Leaving I..... اب باتی کا کام تمہارا ہے..... ناؤ اُس یورٹن.....“ بی کیسر فل..... اینڈ ڈونٹ فور گیٹ..... اُسے جان سے نہیں مارنا..... ورنہ جمارے 5000 پاؤ ڈنٹ ہاتھ سے نکل جائیں گے..... اور پولیس کے جھمیلے الگ سے ہوں گے۔“ اُس کی سردوپاٹ آواز اتنی دھیمی تھی، جیسے کوئی لمبی غرار ہی ہو، شاید اُس کا انداز تھا طب نچرلی ہی اتنا پتھر یا لیا اور تھامنا نہ تھا۔

”Oh Dont Wory Man“ ہیری اچھے طریقے سے جانتا ہے کہ اُسے اپنا کام کیسے کرنا

ہے۔ اس کی ایک بھی بڑی سلامت نہیں رہے گی، ایسے لوگوں کو کیسے سبق سکھانا ہے میں خوب جانتا ہوں۔“
سفاک تیز بچہ کس کی شکاری کی سی عیاری لیے ہوئے تھا۔
”اوکے.....“ موٹی نے راطھ منقطع کرنا چاہا۔

”Hay Listen“
”Are You Sure“ کوہہ اپناراستہ نہیں بدلتے گا..... اہو سکتا
ہے کوہہ ہارو سڑیب کے قریب سے گزرنے کے بجائے.....!“ ہیری نے کسی خدشے کے تحت پوچھا۔
اُس کی ادھوری بہم بات نے بھی موٹی کو طیش دلادیا۔

”ایمیٹ! اوہ ہر روز ادھر سے ہی گزرتا ہے..... ہارو سڑیب اُس کے گھر کے راستے میں پڑتا ہے۔“
موٹی کا بچہ کھر درا اور بختی لیے ہوئے تھا۔
ہیری نے منہ بنا کر فون کاٹ دیا۔

”بلڈی راسکل.....!“ اُس کے ہونزوں سے بے اختیار گالی نکلی۔
”احمق آدمی!.....!“ موٹی دل میں اُسے کوستا ہوا بڑی بڑی ایسا۔
معاشرخان کی چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجا یا..... اُسے کسی انہوں کا احساس ہوا..... سڑک پر اکا
ڈکاڑیکھ گئی..... جبکہ ایک BMW کی سیرین مکمل اسے فولکرہی تھی۔
”شاہد میر اوہم ہو۔“ اُس نے عقابی نظروں سے بیک دیور سے دیکھا۔

وہ فطری طور پر مجبوط اعصاب کا مالک تھا، اور بلا کا چالاک بھی..... بچپن سے ہی آغا جان نے اُسے
قبائلی رسم و رواج کے مطابق ہر طرح کے قدیم وجید اسلوک کا استعمال سکھا رکھا تھا۔ کچھ وہ فطرتی ہی جرأت
مند اور دلیر تھا، اور ڈول میں بھی مجبوط قد و قامت کا تھا۔ سہر طرح کے نامساعد حالات میں بھی
اپنے حواس تخلی نہیں ہونے دیتا تھا۔

اس وقت بھی اُس نے بغور حالات کا جائزہ لیا اور خود کو کپور رکھا۔ بظاہر اُس کی کسی سے دشمنی نہ تھی.....
یونیورسٹی میں چند بار کچھ ناخوبگوار واقعات ہوئے تھے، لیکن ان کی نوعیت اتنی عجیب نہیں تھی کہ بات یہاں
تک پہنچتی۔

اُس کا ذہن تیزی سے دوڑنے لگا۔ لیکن اس سے پہلے کوہہ کچھ سوچتا، اُس کے عقب میں آنے والی
گاڑی نے تیزی سے یوڑن لیا اور فرائی بھر تی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ لب پکل کر رہ گیا۔
معیرخان نے اپنی گاڑی کی رفتار زیاد ہی کر لی۔

وہ ہارو سڑیب سے چند فرلا گئک، ہی آگے پہنچا تھا کہ اسی اثاثا میں سامنے سے آتی 4X4 جسے اُس پر
چڑھ دوڑی، معیر نے یک لخت بریک لکائی، تو گاڑی لہر اگئی، اور اسٹریٹر گک آؤٹ آف کنٹرول ہو گیا، معیر کا
دماغ لمحہ کے پڑا دیں حصے میں جیسے بھک سے اڑ گیا، بھی تو وہ گزشتہ صورت حال کو سمجھنیں پایا تھا کہ یہ نی
افتاد آن پڑی ہی۔ اُس نے بکشکل گاڑی پر قابو پایا لیکن انہائی کوشش کے باوجود بھی گاڑی فٹ پاتھ پر
چڑھ گئی اور ایک جھلکے سے بند ہو گئی۔

معیرخان کی گاڑی کی رفتار اتنی دھمکی تھی کہ غلطی کی کوئی سمجھائش نہ تھی، چہ جائیک یوں ایک سینٹ کی نوبت

آتی۔ معیر کا فطری غصہ عود آیا اس نے غرما کر پیچھے دیکھا۔

”بے یوبا سڑہ۔“ اس نے پیچھے مرکڑ رائیور کو لکارا، جوشاید رکھ تھا۔

اک لمحہ کو خالف گاڑی کے ناٹر چرچ رائے، گاڑی کا جناتی سائز اجنب گزگڑایا، اور ڈرائیور نے پوری قوت سے گاڑی ریوس کی۔ معیر کی گاڑی کے بالکل قریب جا کر اس نے بریک لگائی اک جھٹکے سے سیٹ بیٹھ اٹاری، اور دھم سے دروازہ کھول کر باہر آیا۔

سرمی سڑک پر اس کے لانگ شوز کی دھمک سے فضاؤں کا سکوت جیسے منتشر ہو گیا، اسی اثنامیں اس کے ساتھی بھی باہر نکل آئے۔ اب وہ تعداد میں چار تھے۔ بیٹنگے اور خطرناک..... ان کے ہاتھ میں ڈمل پپرل شارت گزرتھیں۔ اپنی ڈیل ڈول اور رقمامت سے وہ معیر خان کو کسی کلب کے بانسر لگے یا شاید ان کا تعلق اندرورلہ مافیا سے تھا۔ معیر خان ابھی کر رہا گیا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے شاید وہ اسے کھیرے میں لینا چاہ رہے تھے۔

معیر خان بھگ گیا کہ اسے ٹریپ کیا گیا ہے۔ اس کے اب سختی سے اک دو جے میں پیوست ہو گئے۔

”کم آوث۔“ خلاف گاڑی کے ڈرائیور نے درشت لبھ میں کہتے ہوئے معیر خان کی گاڑی کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھولا۔ اس کے خدوخال سے جیسے خوت پیک رہی گئی۔

معیر خان بناڑرے پورے اعتاد کے ساتھ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے تند نظروں سے اسے بھسم کرتا ہوا بہر نکلا۔ اس کی جرأت پر ایک لمحے کے لیے مدقابل تجیر زدہ رہ گیا۔

معیر نے ایک طاری نگاہ ان پرڈائی وہ چاروں اسلخ تھاے ہوئے تھے جبکہ ان کے مقابل وہ نہتا تھا اس کے ذہن نے تیزی سے Plan Of Action پینتا شروع کیا۔ ان چاروں میں سے ایک چہرہ اُسے قدرے شناساں گا کچھ دیکھا بھالا سا۔..... ان چاروں کا گھیرا اس کے گرد تجھ ہونے لگا۔ وہ اسے تیز نظروں سے گھوڑتے ہوئے جھینٹنے کو بے تاب تھے۔

”Abused Me“ تک جیسے اس کی بات پہنچی ہی نہیں اس کی نظر اپنے دہنی طرف کھڑے اس آدمی پر بھری گئی، جس کا چہرہ اُسے جانا پچانا لگ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک جھما کہ ساہوا۔

”بھری.....“ اس کے لبوں سے بے ساختہ چھسلا۔ بھری نے چوک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھیں جیرت سے پھیل گئیں۔

☆.....☆.....☆

تیمور خان آفریدی اس صورت حال کے لیے قطعی تیار نہ تھا۔ فضا ایک زور دار دھماکے کی آواز سے گونج آئی۔ رپٹر کے فائر سے اس کی گاڑی کے پچھلے دونوں ناٹر برست ہو گئے تھے۔ فضائیں بارو دکی خوشبو پھیل گئی۔ لینڈ سلا نیڈ گلکی کی وجہ سے سڑک پر بے حد پھیلن ہو رہی تھی۔ رفتار تیز ہونے کی وجہ سے تیمور خان گاڑی کا توازن برقرار نہ کھسکا۔ ذہنی طور پر اس کی حالت انتہائی مندوش ہو رہی تھی۔

”تو کیا میرے خدشات حقیقت کا روپ دھارنے والے ہیں۔“ اس نے متوجہ ہو کر بابا کی طرف دیکھا۔

اُن کے ماتھے پر پینے کے چکتے ہوئے قطرے اس امر کی گواہی دے رہے تھے کہ یہ سب اُن کے لیے بھی غیر متوقع تھا۔
 گھر میں زرین گل کے علاوہ کوئی بھی اس بات سے آگاہ نہ تھا کہ پچھلے کئی دن سے اُن کو دھمکی آمیز ٹیلی فون کا لڑا اور پیغامات موصول ہو رہے تھے، لیکن نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی اُن کے گمان میں بھی نہ تھا۔

تیمور نے Glove Box میں سے نکالا ہوا 12 بور کا سطل اپنے زیر جامے میں اُڑس لیا ہوا تھا۔ ”میں بابا کی حفاظت کے لیے اپنی جان لڑادیں گا۔“ اُس نے دل میں مصمم ارادہ باندھا۔ اُس کا آفریدی خون جوش مار رہا تھا۔

روڈ پر گاڑی پھلتی جا رہی تھی بریک پر اُس کے پاؤں کا دباو بڑھا، لیکن شاید بریکس فیل ہو گئی تھیں۔ پچھلے دونوں نارے مکمل طور پر ناکارہ ہو گئے تھے۔ اور آخرا کردا ایک دھماکے سے گاڑی سڑک کے کنارے چڑھ کے درخت کے چوڑے تھے سے جاگلگائی۔ زور دار آواز سے گاڑی کا بونٹ ایک جھکٹے سے کھل گیا اور وہ اسکرین کرچی کر چی ہو گئی۔ تیمور خان کا سر اسٹینر گنگ وہیل سے گلرا یا اور کئی کرچیاں اُس کے گردن اور بازوؤں میں چھپ گئیں۔ لیکن اُس کے لمبوں سے ایک ہلکی سی کراہ تلک نہیں نکلی۔ دانتوں پر دانت جمائے اُس نے درد کی شدت کو روکا۔

”بابا..... بابا..... آپ ٹھیک ہیں ناں؟“ اپنی تکلیف کی مطلق پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ اُن کی طرف جھکتا۔

گلاں پیس رکنے کی وجہ سے آدم خان کا چہرہ لہو لہاں ہو رہا تھا۔ اُن کے سر سے بھی خون بہرہ رہا تھا، شاید سر پھٹ گیا تھا۔ اُن کی ایسی حالت پر تیمور خان کے دل پر قیامتیں بیت گئیں۔ خواب بھی ہوتے ہیں..... بابت ہو گیا تھا۔

”تو کیا بابا کو کھودوں گا میں.....؟“ اس سوچ نے ہی اُس کا دل درد بھر بے کراں میں جیسے غرق کر دیا۔ ”ڈونٹ وری بابا..... میں ہوں ناں..... میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔“ وہ اُن کو تھامتے ہوئے شدت جذبات سے چلا یا۔ آدم خان نے چونک کرائے دیکھا۔

اُن کا چھوٹا سا تیمور خان کب اتنا بڑا ہو گیا تھا..... اتنی گرگوں حالت میں بھی اُن کا دل سرست و طمانتیت کے احساس سے لیا بھر گیا۔

یہ خون کے رشتے بھی کئئے عجیب ہوتے ہیں ناں..... اُن کی جان پر خطرہ منڈلار ہاتھا اور اُن کے بیٹے پر یہ راز خود ہی مکشف ہو گیا تھا۔

”تم میری ٹکرمت کرو بچہ میں ٹھیک ہوں۔“ پدرانہ شفقت سے مغلوب ہو کر وہ نقاہت سے بولے ایک ہاتھ سے انہوں نے کنٹی کو دبارکھا تھا جہاں سے سطلہ لہو آب کی مانند بہرہ رہا تھا، دونوں ہاتھ بھی خون آلوہ ہو رہے تھے تیمور خان تکریز دہ ساہیں انہیں دیکھ کر رہا گیا۔

اسی اثناء میں جملہ اور اُن کے سر پر ہمچیخ پکے تھے۔ وہ چاروں طرف سے اُن کے گھیرے میں تھے..... وہ سب جدید اسلجے سے لیس تھے، اُن کے چہرے ڈھکے ہوئے تھے، سو اُن کی پہچان ناگزیر تھی۔

”آدم خان باہر آئے.....“ اُن میں سے ایک کرتی بدن والے شخص نے آدم خان کو گن پوائھ پر لیتے ہوئے شستہ انگریزی میں کہا۔

تیمور خان نے یکدم چوڑک کر اُس کی طرف دیکھا۔ یقیناً وہ شخص مقامی نہیں تھا۔ وہ شخص انگریزی میں بات کر رہا تھا اور وہ بابا کا نام بھی جانتا تھا۔ تیمور کے لیے یہ اچھے کی باغث تھا، اُس نے الجھ کر بابا کو دیکھا، جو بابا وہ نظریں چڑھے۔ اور خاموشی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

”تم بھی پاہر نکلو۔“ اب کی بار اُس نے بار عابر انداز میں تیمور خان کو حکم دیا۔ اس کے انداز نے تیمور خان کو گویا آگ لگادی۔ اُس کا جوان خون کھول اٹھا۔

تیمور کا ہاتھ پسل پر ریغئے لگا۔ اُس نے ایک اچھتی نگاہ اُن پر ڈالی وہ تقریباً اس آدی تھے، جو تھیار تھا میں چوکے کھڑے تھے۔ اُن سے لڑتا بے دوقت تھی۔ وہ بزرد لذتھا، لیکن تدیر سے تقدیر کو جیتنے کی تگ و دو میں تھا۔

”آہ..... میرا سر.....“ وہ کراہتے ہوئے جھکتا چلا گیا۔ مد مقابل کوشاید اس رد عمل کی توقع نہ تھی۔ اُس نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا جو سرعت سے تیمور کی طرف لپا۔

تیمور کو صرف چند لمحے درکار تھے، اُس نے تیزی سے ایک میسج ناٹپ کیا۔

”ہم خطرے میں ہیں۔“ اور موپائل کوڑن آف کر کے ڈرائیور گیٹ سٹی کے نیچے اچھال دیا۔ اس وقت وہ ایک ایسا انداز ہا جواری بن گیا تھا جس کی یہ چال اگر اٹپی پر جاتی تو اُن کی داؤ پر گلی زندگی مزید خطرے میں پڑ جاتی، لیکن اُس کے علاوہ اُس کے ماس کوئی آپشن نہیں تھا۔

”خبردار..... جوز یادہ ہوشیاری دکھانے کی کوشش ہی۔“ حملہ آور کے ساتھی نے بھی روائی انگریزی بولتے ہوئے درجھکی سے کہا اور اسے تقریباً ہمچنہتے ہوئے باہر نکلا۔

ایک لمحے کو تیمور کا دل چاہا کہ ساری مصلحت بالائے طاق رکھتے ہوئے اُس کا تیپا نچھ کر دئے، لیکن اُس نے فی الوقت خود پر ضبط رکھا۔

”خدا کرے سمندر خان (سکیورٹی گارڈ) وہ میسج بروقت دیکھ لے۔“ تیمور نے شدت سے دعا مانگی۔

اس وقت وہ دونوں اُن کے نشانے پر تھے۔ اور اُن کے نہ موں ارادے ڈھکے چھپنے تھے۔

”آدم خان ہم آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے، ہمارا مقصد صرف اُن کا غذاء کا حصوں ہے جو آپ کی دسیز میں ہیں..... آپ وہ کاغذات ہمارے حوالے کر دیں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں آپ کو اور آپ کے میئے کو کوئی گزند پہنچائے بغیر خاموشی سے واپس چلے جائیں گے۔ انکار کی صورت میں آپ جانتے ہیں کہ آپ کو اس کا کیا خمیازہ بھگتنا ہو گا۔“ سپاٹ لجھ میں بات کرتے ہوئے آخر میں اُس کا الجھ دھمکی آمیز ہو گیا۔

وہ شاید اُن کا لیڈر یا باس تھا جو آدم خان کو عین تنازع کی دھمکی دے رہا تھا۔

”تمہیں لگتا ہے کہ وہ انتہائی اہم دستاویزات میں ساتھ لے کر گھومتا ہوں، جو تمہارے حوالے کر دوں گا۔“ آدم خان نے اُس کی آنکھوں میں آکھیں ڈال کر استہزا یہ لمحے میں کہا۔

آن دونوں کے ماہین ہو رہا یہ مکالمہ تیمور کو مجھے میں ڈال گیا۔ اُس نے استفہا میں نظر دوں سے بابا کو

دیکھا، لیکن وہ ذرا بھی اُس کی طرف متوجہ نہ تھے۔ وہ مل کھا کر رہ گیا۔ آخربابا کیا چھپا رہے تھے؟ اور یہ کہ کاغذات کا تذکرہ ہو رہا تھا؟، اُس کا ذہن ابھی تھا۔ اُس پر پرستزادہ بھی تک سمندرخان کی جانب سے کوئی پیش رفت سامنے نہیں آ رہی تھی۔ اُس پر شدید یکنیت طاری ہونے لگی۔

”اب مجھے ہی کچھ کرنا ہو گا۔“ وہ تیزی سے اپنے دماغ میں لا جعل ترتیب دینے لگا۔

”آدم خان.....“ اُن کی جرأت گفتار پر حملہ آور پیغام تاب کھا کر رہ گیا۔ غصے سے اُس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

”آپ غلطی کر رہے ہیں آدم خان..... آپ شاید جانتے نہیں کہ آپ کا سامنا کن لوگوں سے ہے۔“ چاچا کا کہتے ہوئے وہ انہیں باور کروارہاتھا۔ گویا ان ظالموں کے پاس اُن کے لیے کوئی رعایت نہ تھی۔

”ہاں..... میں نہیں جانتا کہ آپ لوگوں میں لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ آدم خان بھی غدار نہیں ہو سکتا۔“ وہ ایک غیور اور بُجھن پڑھان تھے۔

”چاہے میری جان چلی جائے لیکن میں وہ راز تمہارے حوالے کبھی نہیں کروں گا۔ میں اپنی قوم کو کبھی دھوکہ نہیں دے سکتا، میرے لیے ملکی سلامتی سے بڑھ کر کچھ نہیں۔“ آدم خان پر غور لجھے میں بو لے۔

”بلدی فول..... یہ پاکستانی قوم انہائی احمق اور جذبائی ہے۔“ مدد مقابل شخص انہائی طیش سے بے ساختہ بولا۔

”پاکستانی قوم.....؟“ تیمور خان کے ساتھ ساتھ آدم خان بھی بری طرح چونک گئے۔ معاں شخص کو بھی فی الفور اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اُس نے انہائی سرعت سے اپنی گن کارخ آدم خان کی طرف کیا۔

”اوکے..... اب تمہارے سامنے موت کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔“ بے چک لہجہ سانپ کی اسی پھنکار لیے ہوئے تھا۔

”خبردار..... جو میرے بابا کی طرف ایک قدم بھی بڑھایا تو.....“ تیمور نے ساری مصلحت بالائے طاق رکھتے ہوئے اُسے للاکارا۔

پانی سرے اور بیکن پیغام چکا تھا اب مزید انتظار بے سود تھا۔ حملہ آور کی پیش قدمی وہیں رک گئی۔ تیمور کے ہاتھ میں پسل دیکھ کر وہ ایک طریقہ نہیں پہنچا۔ ”یہ چھوٹا سا لڑکا..... یہ جوزہ..... تمہیں ہم سے بچائے گا..... ہاں؟“ وہ آدم خان کی طرف رخ کرتے ہوئے تحریر آمیز لجھے میں بولا۔

”جب تک وہ کاغذات میرے پاس ہیں تم کبھی مجھے جان سے نہیں مارو گے۔“ یہ بات میں جان گیا ہوں۔ آدم خان اُس کی طرف دیکھتے ہوئے پر یقین انداز میں بو لے۔

ایک لمحے کو اُن کی اس درج درست قیافہ شناسی مدد مقابل کوڈ گما گئی، لیکن اُس نے لمحوں میں خود کو کپوز کیا۔ تیمور خان بدستور پوزیشن لیے کھڑا تھا، جبکہ اُسے گھیرے میں لیے ہوئے حملہ آور کے ساتھی بھی پوری طرح سے الٹ تھے۔

اس صورت حال پر آدم خان کے اعصاب کشیدہ ہو رہے تھے، لیکن انہوں نے ایک لمحے کو بھی خود کو

کمزور نہیں پڑنے دیا۔

”ہم مم..... ہم آپ کو واقعی جان سے نہیں مارنا چاہتے، ہاں لیکن آپ کو اپنے ساتھ تو لے جاسکتے ہیں ناں؟“ وہ پر اسرار بجھ میں بولا۔

”اوہ..... یعنی حملہ آوروں کا پلان اُن کی کذبینپنگ تھی۔“ آدم خان فوراً معاطلے کی تہہ سٹک بخیج گئے۔ پھر یونہن گھمیرتے ہوئی جاری تھی۔

”اوہ..... ہاں..... آپ کے اس لعل بواۓ کو تو جان سے مار سکتے ہیں ناں؟“ آدم خان کو سوچنے سمجھنے کا موقع دیے بغیر سکنڈ سے پہلے اُس نے تیور کی طرف فائر کھول دیا۔

تیور چست اور تو انداز کا تھا، وہ آل ریڈی اُس کی طرف سے ہونے والی پیش قدمی کا منتظر تھا، اس سے پہلے کہ گولیاں اُس کا سینہ چھلنی کرتی ہوئی گزر جاتیں اُس نے جھکائی دے کر خود کو بچایا، اور بھاگتا ہوا گازی کی اوٹ میں ہو گیا۔

اُسے گھیرے میں لینے والوں میں سے دو آدمیوں نے انتہائی پھرتی سے اُس کے پیچھے جمپ لگائی۔ تیور نے اُن میں سے ایک کوز و دار کک لگائی، جو اُس کے سینے پر لگی، اور وہ تیور اکرالٹ گیا، جبکہ دوسراے آدمی کو اُس نے زبردست پیچ رسید کرنے کی کوشش کی، لیکن اُس کا مکا ہوا میں لہرا گیا۔ مد مقابل شخص شاید مارشل آرٹ کا ماحر تھا۔ اُس نے تیور کے گھونے کا وار اپنی کھنی پر روکا، اور اتنے ہاتھ سے اُس کی گردن پر وار کیا۔ وہ درد سے کراہ اٹھا۔ پسل اُس کے ہاتھ سے دور جا گرا۔

”اٹھو کم آن ہٹت می۔“ وہ آدمی اچھل کر کھڑا ہو گیا اور اب ہاتھ کے اشارے سے تیور کو اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پیچ کر رہا تھا۔

فائنگ میں اُس کے ماہر لینڈ واؤ بیچ ظاہر کر رہے تھے کہ وہ انتہائی تربیت یافتہ ہے جبکہ اُس کے مقابل تیور خان بالکل کجا کھلاڑی تھا، سمجھی لمحوں میں چاروں شانے چت ہو گیا تھا۔

”تمہاری دشمنی مجھ سے ہے..... میرے بیٹے کو جانے دو..... اُسے چھوڑ دو۔“ آدم خان بے اختیار بیٹے کی طرف بڑھے۔

حملہ آوروں کے باس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور اس سے قبل کروہ تیور کے قریب جاتے انہیں دونوں بازوؤں سے آہنی گرفت میں جکڑا گیا۔ باس نے آگے بڑھ کر اُن کے پھرے پر ایک زور دا تھپڑ رسید کیا۔ آدم خان کا ہونٹ بری طرح پھٹ گیا اور خون رنسے لگا۔ تیور خان کے لیے یہ منظر قیامت خیز تھا۔

”بابا.....“ وہ چلایا۔ اُسے سنبھلنے کے لیے چند لمحے درکار تھے۔ وہ عقاب کی سی تیزی سے قریب کھڑے آدمی پر چھٹا، اور آؤ دیکھانہ تاڑ اور اسے کوں اور ٹھوکروں کی زد میں لے لیا۔ بابا کو یوں ناگفتہ باحالت میں دیکھ کر وہ پاگل ہو گیا تھا۔ اُس میں جنوں کی سی طاقت بھر گئی تھی۔ اُس کیم حیم آدمی کے لیے اُس کا یہ دعلم غیر موقع تھا۔ وہ بھوپنچارہ گیا۔

”مارو اس باسڑو کو.....“ باس کی عصیلی آواز پر اُس نے صرف چند لمحوں میں ہی اپنی بوکھلا ہٹ پر قابو پالیا اور جو ایسا تیور کو کک کرنے کے بعد اس بری طرح زمین پر چمٹا کہ چند سکنڈ میں ہی اُس کی خوب درگت

پنادی۔ وہ شم جان سا ہو گیا، تو اس کی گردن میں بازو ڈال کر اپنی گرفت اتنی سخت کردی کہ اسے سانس لینا دشوار ہو گیا۔ آدم خان بے نسبے اپنے بے قصور بیٹے کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ وہ اس وقت خود کو سخت لا چار محسوس کر رہے تھے۔

”اللہ مد.....“ انہوں نے شدت سے رب کو پکارا اور یقیناً وہ لمحہ قبولیت کا تھا۔

دور سے ایک دھول اڑاتی جیپ لمحہ قریب آ رہی تھی۔

”سمندر خان.....!“ آدم خان زیر لب بربڑائے۔ غیب سے مدد آئی تھی۔ ان کے دل میں امید کی کرن جاگی۔ پاس بھی قریب آئی جیپ کو دیکھ کر یکدم چونک گیا۔

”موو..... موو..... بیک..... راست ناؤ.....“ اُس نے چیخنے ہوئے اپنے آدمیوں کو حکم صادر کیا۔ شاید فی الفور وہ مزید کسی بکھیرے میں الجنہانیں چاہ رہے تھے۔ انہوں نے سرعت سے آدم خان کے ہاتھ پاندھے اور انہیں تقریباً گھستہ ہوئے گاڑی میں ڈالا۔ آدم خان نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ انہوں نے خود کو جیسے مکمل طور پر حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔

معا جیپ قریب آ کر رکی، اور سمندر خان عبد الجنحی کے ساتھ مزید چار اسلحہ بردار آدمیوں کو لیے جیپ کا دروازہ کھول گردھم دھم کرتا باہر نکلا۔

”بابا.....!“ تیمور نے زمین سے اٹھنے کی کوشش کی، لیکن لڑکھڑا گیا بابا کو روکنے کے لیے اُس کا اٹھا ہوا ہاتھ ہوا میں لہر اگیا۔

”چھوٹا صاحب.....!“ سمندر خان بچلی کی سی تیزی سے اُس کی طرف بڑھا تو باس نے موقع سے

آپ کیسا، سچی کہانیاں، چاہتے ہیں؟

قارئینِ کرام اور لکھاری دوستو! سچی کہانیاں آپ کا اپنا

ماہنامہ تھا، ہے اور رہے گا۔ آپ سچی کہانیاں میں کیا

تبدلی یا اضافہ چاہتے ہیں؟ فوری طور پر خط تحریر کریں

یادفتری نمبرز پر گروپ ایڈیٹر سے فوراً رابطہ کریں۔ ہم

آپ کی قیمتی آراء اور مشوروں کے منتظر ہیں۔

فائدہ اٹھا کر ایک بار پھر نشانہ باندھتے ہوئے تیمور پر فائز کرتا چاہا۔

آدم خان نے بروقت اپنی پشاوری مچل سے بس کی ناٹک پر زور دار ضرب لگائی، وہ بے اختیار جھکا اور نشانہ خطا ہو گیا۔

دفعتاً تیمور خان نے اپنی ساری ہمتیں یکجا کیں اور قلابازی کھاتا ہوا در پڑے مسلسل تک پہنچا۔

”سمندر خان بابا کو بجاو۔“ تیمور نے سمندر خان کو تیزی سے کہتے ہوئے دور سے نشانہ لیا۔ حملہ آور آدم خان کو بری طرح زد و گوب کر رہے تھے۔

تیمور خان کا نشانہ پا چکا۔ وہ آفریدی قبیلے سے تھا اور اپنے رسم و رواج کے مطابق نشانے بازی میں مہارت رکھتا تھا۔

گولی باس کے بازو پر لگی تھی۔ خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔

اب حملہ آور فور پوزیشن لے چکے تھے۔ جبکہ سمندر خان بھی اپنے ساتھیوں سمیت انہائی سرعت سے درختوں کے پیچھے اپناٹھکانہ بن چکا تھا۔ دونوں طرف سے فائزگ کا تباadelہ ہو رہا تھا۔

نشانے میں گولیوں کی تترزاہٹ سے گونج آئی۔

آدم خان موقع سے فائدہ اٹھا کر حملہ آوروں کی گاڑی سے بھاگ نکلے تھے۔ تیمور نے سمندر خان سے کلاشکوف لی اور سڑک کنارے لے گئی، چیز کے درختوں کی اوٹ سے مسلسل فائزگ کر رہا تھا۔ حملہ آوروں کے دو آدمی شدید رُخْنی ہوئے اور ایک سنتا تی ہوئی گولی تیمور خان کا سینہ چیرتی گز گئی۔

اس کی آنکھوں تلنے اندر ہرا چھا گیا اور گن اس کے ہاتھ سے دور جا کری۔ اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

”بابا.....“ اس کے لبوں سے ایک دھیسی سرگوشی آہ بن کر نکلی تھی۔

سمندر خان بھی انہائی رُخْنی حالت میں تھا۔ اس کی ناٹک میں گولی لگی تھی۔

”چھوٹا صاحب..... تیمور خان..... ام تم کو کچھ نہیں ہونے دے گا۔“ وہ لکھرا تا ہوا اس طرف بھاگا۔

”خان کو اٹھاؤ..... جلدی.....!“ اس نے دھاڑتے ہوئے عبدالحی اور اپنے ساتھیوں کو مدد کر کہا۔ اسی اشاعت میں حملہ آور موقع سے فائدہ اٹھا کر بھاگ نکلے۔

کئی گاڑیوں کے ناٹر ایک ساتھ چرچائے اور پھر ایک سکوت ساٹھ ہر گیا۔

☆.....☆.....☆

وہ بری طرح نوٹ گئی تھی۔ پچھلے کئی دن سے موسم حزن جیسے اس کے وجود میں ذیرے ڈالے ہوا تھا دل کا ایک حصہ ہمیشہ بے جیلن رہتا۔ زرمیں کے علاوہ کون تھا؟ جو اس کی شدتلوں کا گواہ تھا۔

”لئی دن سے مجھے لگ کر رہا تھا کہ کچھ برآ ہونے والا ہے..... کوئی انہوںی..... میری دھرکنیں رُک جاتی تھیں..... میری سانیں تھنے لگتی تھیں..... دل سہا ساتھا..... اور..... اور تم نے سن لیا تاں زرمیں میرے سب وابستے سارے خدشات سچ ثابت ہو گئے تاں؟“ وہ زرمیں کے شانے پر سر رکھے بری طرح بکھر رہی تھی۔

”خود کو سنجا لافروا..... پلیز.....“ زر مینے سے اُس کی بے چارگی دیکھی نہیں جا رہی تھی..... وہ دم بخود تھی۔

فردا کی شدتیں اُسے ہولائے دے رہی تھیں۔ پہلی بار یہ بکھر فرد جنون اُسے خوفزدہ کر رہا تھا۔

”خدا یا..... یہ کیا الہامی عشق تھا۔“

تیمور خان آفریدی مشکل میں تھا، اُس کی جان پر بن آئی تھی۔ اور سانسیں اُس کی رک رہی تھیں اُس پاگل لڑکی کی جس کے پاگل جذبوں سے وہ بکسر انجان ان تھا۔

زر مینے کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اُس کی پلکوں نی چھارل پر کئی موتنی امک گئے۔

”اگر تیمور کو کچھ ہو گتا تو میں مر جاؤں گی“ زر مینے میں حق میں مر جاؤں گی وہ عجیب ہیلے خود سر لجھ میں بولی۔ اُس کی آنکھوں میں سرکشی تھی اور لجھ میں پاگل پنے کی خود سری زر مینے کو لگا وہ عشق و خرد سے بیکانی ہوتی جا رہی ہے۔

”یہ کیسی بہکی بہکی پاتیں کر رہی ہوتی فروادا..... ہوش میں آؤ..... تیمور کو کچھ نہیں ہو گا۔“ زر مینے نے فروادا کی بانیں پکڑ کر اُسے جھنجور ڈالا۔ وہ زمین پر بیٹھنی چل گئی۔

زر مینے نے بھی سے اُسے دیکھ کر رہی تھی۔

وفتا فروادا کی می کرے کا دروازہ کھولے دھیرے سے اندر داخل ہوئیں، انہوں نے ہاتھ میں نازک فینی ٹڑے اخمار کھی؛ جس میں بھاپ اڑاتے دودھ کے گلاں رکھے ہوئے تھے۔

کمرے کا ماحل عجیب تناول اور یاسیت لیے ہوئے تھا۔

فردا کو اس دھشت زدہ حالت میں دیکھ کر وہ مخترب ہو کر آگے گئے بڑھیں، وہ کارپٹ پر گھنٹوں میں سردیے بیٹھی تھی، لانے بال کلپ سے نکل کر یوں بھرے ہوئے تھے جسے اُس کی حالت زار پر مام کتاب ہوں۔

”بیٹی! کیا ہوا؟ ایسے کیوں بیٹھی ہو؟ ایسا کیا ہو گیا؟“ بیٹی کو ایسے اجزی حالت میں دیکھ کر اُن کا دل یکبارگی ڈوبتا تھا۔

”غمی..... وہ..... تیمور.....“ ماں کو دیکھ کر بے اختیار وہ بلک اٹھی۔

”کیا ہوا تیمور کو..... اور تم..... یہ کیا حالت بنا رہی ہے؟“ اُس کے بھرے بالوں کو سیستھے ہوئے انہوں نے اُسے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ وہ سخت حواس باختہ ہو رہی تھیں۔

”غمی..... تیمور..... مجھے ابھی سید و شریف جاتا ہے۔“ وہ شدتوں سے رو دی۔ گمی کا ضبط اُس کی بے ربط بالتوں سے جواب دیئے لگا۔

”کوئی مجھے کچھ بتائے گا؟ آخ راجرا کیا ہے؟“ اب کی باروہ برس پڑیں پریشانی اُن کے چہرے سے مترسخ تھی۔

”خال..... تیمور کو گولی لگ گئی ہے..... وہ بہت کر نیکل حالت میں آئی سی یو میں ہے۔“ آخ زر مینے کی چپ کی بکل کھل گئی۔

”وہاٹ.....؟“ وہ یکدم بھوجنگی رہ گئیں۔

(اس دلچسپ نادل کی تیسری قطعہ آئندہ ماہ پڑھیے)

ناقابل یتیں کہانیاں

اسی کہانیاں جو انسانی قتل اور سرچ سے مادراہیں

بیچھوروانی اور الائچیوں

فرحت عباس شاہ کا خیال

ایک اک کر کے خادث بڑی ترتیب کے ساتھ
مرطہ وار مرا ساتھ نہانے آئے

حیرا سید

میں جو کہانی سنانے والی ہوں وہ میری خالہ کی ماں ہیں۔ میری امی کو ملا کر چھے بہنیں اور تین بھائی ہیں۔ میرے نانا ماہر تھے۔ جب ان کی



پہلی شادی ہوئی تو شادی کے ڈیڑھ سال بعد میری پہلی نانی میری سب سے بڑی خالی کی پیدائش کے بعد انتقال کر گئی تھیں۔ اتنی سی بچی کی ذمے داری نانا خود نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اس لیے گھر والوں نے انہیں مشورہ دیا۔

”بھائی کریم! اب تم دوسری شادی کرو۔“ پر وہ نہیں مانتے۔ مسلسل انکار کرتے رہے۔ کہنے لگے۔

”میں ماں اور باپ دونوں بن کر بچی کی پرورش کروں گا۔“

میرے نانا کی ماں (جنہیں آگے میں ہر جگہ اپنی پر نانی کہوں گی) نہیں مانیں۔ انہوں نے کہا۔

”بینا! نادافی کی باتیں نہ کرو۔ تمہارے بہن بھائی خیر سے اپنے اپنے گھروں والے ہیں۔ باپ تمہارے حیات نہیں ہیں اور میں بڑھیا لاجاڑ کیسے اتنی سی بچی کو پالوں کی؟ تم ذرا ہوش مندانہ فیصلہ کرو۔ اپنے لینہیں صرف اپنی بیٹی کے لیے سوچو۔ لڑکی کے مسائل لڑکے سے مختلف ہوتے ہیں۔ چلو جب تک میں زندہ ہوں تب تک تو ٹھیک ہے۔ میں اس کی دیکھ بھال کروں گی پر جس دن میری آنکھیں بند ہو گئیں اس دن کے بعد تم اپنی ڈیوٹی دو گے کہ زگس کی رکھواں کرو گے؟“

میری پر نانی نے بالآخر اپنے بیٹے کو دوسری شادی کرنے کے لیے راضی کر ہی لیا۔ دوسری بیوی جو نانا کی دہن بیٹیں، وہ میری نانی تھیں جن کا نام نور النساء تھا۔ میرے نانا بیمار سے انہیں نور ن کہہ کر بلاتے تھے۔ نانا نے انہیں پہلے دن ہی سمجھا دیا تھا کہ تمہیں زگس کو حقیقی ماں کا پیار دینا ہو گا۔ میری نانی نے اپنے گھر اپے اور سمجھداری کی بنا پر

بہت جلد ہی ساس دیورِ مندوں اور شوہر کے علاوہ زگس کا بھی دل جیت لیا۔ اب توہر کوئی بس میری نانی کے ہی گھر گاتا پھر تھا۔

جب میری نانی میں پہلی دفعہ ماں بننے کے آثار پیدا ہوئے تو میری پر نانی جیسے اپنی ہر تکلیف و غم بھول سکیں اور میری نانی کو جیسے باخنوں کا چھالا بیالیا۔ اپیانہ کرتا، ویسا نہ کرتا، بیہاں نہ بیٹھتا، نہ یہ کھانا، وہ کھانا اور ساتھ ساتھ میرے نانا کو بھی ہدایت کر دی کہ ان کا خاص خیال رکھیں۔ میرے نانا کو بچوں کا بہت شوق تھا اس بات کا ذکر وہ کہی بار میری نانی سے کرچکے تھے۔

”جب زگس کی پیدائش کے بعد فاطمہ چلی گئی تو مجھے بہت افسوس ہوا تھا، پر اب نہیں۔ خدا نے چاہا تو میری مراد تم سے پوری ہو گئی۔“

آخرا کاروبار وہ دن آیا ہی گیا جب میرے نانا ایک پیارے سے میئے عبدال قادر کے باپ بن گئے۔ اب میری نانی کی ذمے داری بڑھ گئی۔ اس طرح وقت گزرتا چلا گیا۔ یہ دونوں وقتاً فوقاً تو عدو بچوں کو خدا کی طرف سے دی ہوئی نعمت جانتے ہوئے ان کی تعلیم و تربیت اور پرورش کرنے میں لگے ہوئے تھے کہ اسی اشاعت میں میری پر نانی کا انتقال ہو گیا۔ جس کا سب کو افسوس تھا مگر زیادہ افسوس میری نانی کو تھا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ یہ میری ساس نہ تھیں بلکہ ماں سے بھی بڑھ کر تھیں جن کے ساتھ میں رہ کر وہ اپنے گھر والوں کو بھی بھول گئی تھیں۔

رفت رفتہ وقت کا پہیہ گھومتا رہا پہلے بچے چھوٹے تھے پھر بڑے ہوتے گے۔ گھر میں میئے کی شکنی نہ تھی کیونکہ میرے نانا کی اچھی توکری کی وجہ سے ان کی تغواہ میں بھی اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ بچوں کی شادی کا وقت آیا تو سب سے پہلے زگس

محبوبی ہے۔ امبر اور ارم کی شادی الگ الگ دن ہو گئی۔

پس کرنا نانے وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگیں۔

"ہمارے گھر ایسی شادی راس نہیں آتی۔"

دونوں جوڑوں میں سے کسی نہ کسی کون تھا انہما پڑتا ہے۔ برائے مہربانی آپ لوگ ہمارا ساتھ دیں۔"

ہم آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ ہم دونوں دن نہیں، میں ہی باراتی لاکیں گے تاکہ آپ کو پریشان نہ اٹھانا پڑے۔"

یہ بات سن کر ما موس وغیرہ تو احتجاج کرنے لگے مگر کافی بجھ تھیں کے بعد ان کی بات مان لی گئی۔

شادی چونکہ دو مینے بعد رکھی گئی تھی اس لیے نانا نے سب بچوں کے ذمے ان کے کام لگادیے تھے ہم لوگ بخوبی انعام دے رہے تھے۔

جمرات والے دن امبر خالہ کی شادی طے پائی تھی، اس لیے جمرات کو امبر خالہ رخصت ہوئیں اور اگلے روز ارم خالہ بھی رخصت ہو گئیں مگر ابھی ارم خالہ کو رخصت ہوئے دس منٹ ہی اگز رے تھے کہ دہن کی کار واپس آگئی۔ جو لوگ ہال سے پاہر کھڑے تھے وہ حیران ہو کر دیکھنے لگے کہ دہن کیوں واپس آگئی ہے۔ نانا تک یہ اطلاع گئی ہی تو وہ بھی پریشان ہو گئے کہ الہی یہ کیا ماجرا ہے؟

جب معلوم کیا تو پتا چلا کہ نکاح سے پہلے جب ارم خالہ کو با تھروم جانے کی ضرورت محسوس ہو گئی تو انہوں نے اپنی انگوٹھیاں اٹا رکر وہیں با تھروم میں رکھ دی تھیں اور انہما بھول گئیں اب یاد آیا تو لینے آئی ہیں۔ یہ بات جب ای کو معلوم ہو گئی تو انہوں نے فوراً انگوٹھیاں ان کو دے دیں اور بتایا۔

کی شادی ہوئی پھر اس کے بعد جس کا نمبر تھا وہ فارغ ہوتا چلا گیا۔ ہمارے نانا کی دو بیٹیاں، امبر اور ارم جو کہ سب سے چھوٹی تھیں۔ ان کی عروں میں دو دو سال کا فرق تھا۔ وہ بھی اب خیر سے بالغ ہو چکی تھیں، پر ابھی تعلیم حاصل کر رہی تھی اور ارم چھوٹی، وہ مقامی کاٹج میں بی اے کی طالبہ تھی جب میری نانی نے دنیا سے منہ موزیا۔ نانا تو اس حادثے سے جیسے نیم پاگل ہو گئے کہ اب کیا ہو گا؟ مگر رفتہ رفتہ نانا کو صبر آہی گیا۔ انہیں اپنی دو بیٹیوں کے فرض کو بھی پورا کرنا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ بچیاں بڑی ہو گئی ہیں۔ اگر ان کی ماں حیات ہوتی تو انہیں کوئی فخر نہ ہوتی پر اب ایسا نہیں تھا۔ انہیں یہ کام خود کرنا تھا مگر اللہ نے ان کی مشکل آسان کر دی اور ان کی دونوں بیٹیوں کا رشتہ ایک ہی گھر سے آ گیا۔

پروفیسر ریاض الدین میرے نانا کے دوست اور دور کے رشتے دار بھی تھے۔ ان کے تین بیٹے تھے۔ بیٹی کوئی نہیں تھی۔ بڑے دونوں ایک بیٹی میں ملازم تھے۔ چھوٹا بیٹا ابھی زیر تعلیم تھا۔ دونوں بڑے بھائیوں کی شکل آپس میں بہت ملتی تھی مگر امبر کے شوہر یوسف کا رنگ گورا اور ارم کے شوہر کا رنگ ذرا دبا ہوا تھا۔ پُرکش ہونے کے باعث وہ یوسف خالو سے بھی اچھے لگتے تھے۔

ایک دن ہلکی پھلکی تقریب کا اہتمام کر کے نانا نے خالاؤں کی معمقی طے کر دی اور شادی کے لیے دو مینے کے بعد کی تاریخ طے پائی۔ اسی دن خالہ کی ساسی ہمارے نانا سے کہنے لگیں۔

"ویکھیے بھائی جان! ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ بس ہماری ایک شرط ہے کہ ہمارے گھر میں ایک دن میں دو دلنشیں بیا کر دیں آتیں۔ آپ کو مشکل تو ہو گی کہ دو دن انتظام کرنا پڑے گا پر یہ ہماری

”جب تم دہاں سے واپس آئی تھیں تو میں چھوٹے بچے کو فارغ کروانے لے کر گئی تھی تو سامنے رکی ہوئی انکوٹھیوں پر نظر پڑ گئی۔ نئی ہونے کی وجہ سے فوراً پچھاں میں آئیں اس لیے میں نے اپنے پاس رکھ لی تھیں۔“

انکوٹھیاں لے کر دوبارہ دہن رخصت ہوئی۔ دوسرے دن ولیم تھا۔ دونوں خالائیں بہت پیاری لگ رہی تھیں۔ بہت خوش تھیں پھر حسب روایت دونوں کی اطلاع آئی کہ دونوں کچھ عرصے بعد نئی خوبخبری سنانے والی بیان۔ خالکے گھر میں کوئی چھوٹا بچہ نہ تھا جس کی وجہ سے ان کے ساس سرتوگن کرنے کا دن کاٹ رہے تھے۔ پہلے سے بچوں کے کھلونے، کپڑے اور استعمال کی چیزوں لا لا کر رکھ لی تھیں اور پھر خدا کے فضل و کرم سے دونوں ایک ایک پیارے سے بیٹی کی ماں بن گئیں۔ بچوں کے نام عالموں سے پوچھ کر آصف اور اویس رکھے گئے۔ ساس سرسست گھر کا ہر فرد بچوں کا دیوانہ تھا۔ وقت آرام اور سکون کے ساتھ گزر رہا تھا۔ دوسال بعد دونوں خالائیں دوبارہ امید سے ہو گئیں۔ اس دفعہ ارم خالکی طبیعت تو ٹھیک رہی گراں خال کوڈا اکٹھنے پر آپ شیش تباہ تھا جس کی وجہ سے وہ بہت زیادہ پریشان اور اپنے آپ سے غافل رہنے لگی تھیں۔ بہوں کی ایسی حالت دیکھ کر ان کی ساس نے گھر میں کام کرنے والی ماںی رکھ لی۔ اس دفعہ ارم خالہ پہلے فارغ ہو گئی تو ان کے گھر جزوں ایسی بیٹا پیدا ہوئے۔ کچھ عرصے بعد امبر خال کو اسپتال میں داخل کروادیا گیا اور انہوں نے ایک پیارے سے بیٹے کو جنم دیا۔ بیٹا تو ٹھیک ٹھاک تھا خالہ کی کندیشیں خراب ہو گئی۔

”اب میں بہت بد صورت ہو گئی ہوں۔ آپ کا دل مجھ سے بھر گیا ہو گا اس لیے میں آپ کو دوسرا شادی کرنے کی اجازت دیتی ہوں۔“
یہ بات سن کر خالو خالہ بہت ناراض ہوئے اور کہنے لگے کہ تم تو پاک ہی ہو گئی ہو۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ یہ بیماری تمہیں شادی سے پہلے نہیں ہوئی۔ نہیں تو شادی کا کتنا مسئلہ ہوتا۔ اب تمہیں کیا فکر ہے۔ ماشاء اللہ دو بیٹوں کی ماں ہو اپنا گھر ہے، شوہر ہے، ساری نعمتیں میسر ہیں۔ حسن ہی تو سب کچھ نہیں

ڈاکٹر نے کہا۔ انہیں فوری خون کی ضرورت

کے گھر پر کسی دوسری مخلوق نے آ کر قبضہ جالیا ہوتا۔ ذاکڑوں سے میری اس بیماری کے بارے میں بات ہوئی ہے وہ کہتے ہیں کہ اس بیماری کا علاج دریافت ہو گیا ہے۔ وقت تو ضرور لگے گا مگر تمہاری یہوی جلد و بارہ ملکیک ہو جائے گی۔“ اس طرح دوسرا اور گز رکھنے۔ ارم خالہ خیر سے ایک اور بیٹی کی ماں بن گئیں۔ ان کے بیٹے کا نام عاصم رکھا گیا تھا۔ جب وہ چھ ماہ کا ہوا تو خالہ دوبارہ امید سے ہو گئیں مگر اس دفعہ ان کی طبیعت بہت خراب ہو گئی۔ آخر وقت تک ان کی طبیعت خراب ہی رہی۔ آپ ریشن کے ذریعے ان کا بیٹا ہوا مگر وہ آٹھ گھنٹے زندہ رہنے کے بعد انقلاب کر گیا۔ اس صدمے کے بعد خالہ بہت بیمار ہو گئیں۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے ان کی ساس نے گھر میں قرآن خوانی و میلاد کا اہتمام کروایا۔ اس دوران خالہ کے گھر عجیب و غریب واقعات رومنا ہوئے کہ خالو جس کمپنی میں کام کرتے تھے وہاں سے انہیں نکال دیا گیا۔ ایک دن چھوٹا دیور آفس سے آرہا تھا تو اس کا ٹرک سے ایکیڈٹ ہو گیا۔ چونیں تو بہت آئیں پر خدا کا شکر ہے کہ جان بیٹھنی۔ خود پروفیسر صاحب پر بارث ایک جو۔ بچے بھی اکثر بیمار رہنے لگے۔ گھر میں چوری کی واردات ہوئی۔ ساس بھی بیمار رہنے لگیں۔ ساس نے کئی باررات کے وقت جاگتی آنکھوں سے کسی سائے کو مختلف جگہوں پر کھڑا دیکھا جس کے جسم پر صرف لال نیکر تھا اور پیشانی پر لال بندی تھی۔ بال کم تھے مگر پچھے سے ایک تلی چوٹی کندھے تک جھول رہی ہوئی تھی۔

”دیکھو نیجے! یہ میری ای کا نام ہے) یہ لوگ بڑی کرامت والے لوگ ہیں۔ ان کے علم سے بہت سے لوگوں کو فیض پہنچا ہے۔ تمہارے خالو کے بلانے پر یہ لوگ آئے ہیں۔ میں تمہیں پہلے بھی گھر کے حالات بتا پچلی ہوں۔ بس یہ اسی سلسلے میں آئے ہیں کہ خدا غواست کچھ ہے تو یہ اسے ختم کر دیں گے۔ اس چراغ کے سامنے جو بیٹھے گا اسے بہت فائدہ ہو گا۔ اس چراغ کے اندر جو تیل موجود ہے اگر وہ جسم کے کسی بھی درد والے حصے پر لگایا جائے گا تو شرطیہ فور آرام آئے گا مگر اس تسلی کی پابندی یہ ہے کہ ناف سے یقینے نہ

انہوں نے سر سے کئی بار اس بات کا ذکر کیا۔ انہوں نے پہلے تو اسے اُن کا وہم سمجھا مگر ایک دفعہ خود انہوں نے بھی اس سائے کو محبوس کیا۔ انہوں نے فوراً استخارہ کیا تو معلوم ہوا کہ ان

کو متلی آئے یا بے چینی ہو تو پریشان مت ہوئے گا۔ ہم سب یہاں موجود ہیں۔ جس کی جو کیفیت ہو گی وہ خود سامنے آجائے گی۔ آپ لوگ شور کر کے یا باتیں کر کے میرا دھیان نہیں بٹائے گا۔“

امیر خالد اور ارم خالد اتفاق سے دونوں آگے ہی بیٹھی تھیں۔ ارم خالد کی گود میں ان کا چھوٹا بٹا بیٹھا ہوا تھا۔ عنایت صاحب نے کمرے میں اندر ہمرا کر دیا اور پھر چراغ جلانے کے ساتھ ساتھ انپا عمل شروع کیا تو ہم سب بھی حسب بدایت درود شریف پڑھنے لگے۔ عنایت صاحب کو عمل شروع کے پچھے ہی دری ہوتی تھی کہ ارم خالد جو کہ پچھے لے کر بیٹھی تھیں وہ پچھے ہٹلے گئیں اور ملتے ملتے اپنے بیٹے عاصم کو زور زور سے ملنے لگیں، ہم یہ سمجھے کہ یہ شاید ایسے ہی کہ رہی ہیں مگر ایک دم انہوں نے اپنا دوپھر سے اتار کر پھینکا اور اپنے کھلے بالوں کو جھکا دادے کر زور زور سے بیٹھے بیٹھے جھومنا شروع کر دیا۔ ان کی آنکھیں عجیب سی بڑی بڑی اور لال ہو گئیں۔ خالد کی ساس نے جو یہ مظفر دیکھا تو فوراً ان کی گود سے پچھے لیا۔ پچھے دیے ہی پریشان تھا ان اتفاق سے ایک دم رونے لگا، مگر فیڈر دے کر اسے چپ کر دیا گیا۔ ارم خالد جو عجیب عجیب حرکتیں کر رہی تھیں ایک دم چلانے لگیں۔

”بس کرو عنایت..... بس کرو..... مجھے چھوڑ دو میں اب نہیں آؤں گا۔ چھوڑ دو، تم میرا مقابله نہیں کر سکتے۔ چھوڑ نہیں تو میں تمہارے ساتھ ساتھ اس کمرے میں موجود تمام لوگوں کو ختم کر دوں گا۔“

یہ سب پچھے خالد اپنی آواز میں نہیں بلکہ کسی آدمی کی آواز میں کہہ رہی تھیں اور ایسا محسوس وظیفہ بھی پڑھتا جاؤں گا۔ اگر اس دوران میں کسی

لگے۔ امبر کی طبیعت اتنی زیادہ خراب رہنے لگی ہے کہ مجھے تو اس لگتا ہے کہ اس غربی ب پر ہی پچھے ہو گیا ہے۔ دیکھو کیسی تھی، کیسی ہو گئی ہے؟ ویسے تو آج سب لوگ چراغ کے آگے بیٹھیں گے مگر میرا اصل مقصد امبر کو آگے بھٹانا ہے۔“

اتنے میں ارم خالد آگئیں کہ چلو چائے پی لو۔ مغرب کی اذان ہونے والی ہے۔ ایسا جی کہہ کر گئے ہیں کہ سب لوگ ہال میں جمع ہو جائیں۔ ہم لوگ مسجد سے سیدھے ادھر ہی آئیں گے۔ مغرب کی نماز ادا کر کے ہم سب ہال میں جا کر دیوار سے نیک لگا کر بیٹھے گئے۔ کمرے میں سفید چاندنی پچھی ہوئی تھی۔ دیوار سے گاؤں تکیے لگے ہوئے تھے۔ کمرے میں اگر تھی کاشینڈ، ایک پانی سے بھرا ہو اجک اور ایک چراغ تیل سمیت رکھا ہوا تھا۔ اور پھر کچھ دیری کے بعد عنایت صاحب اور دوسرے مرد حضرات مسجد سے تشریف لے آئے۔ سب کے بیٹھنے کے بعد عنایت صاحب بولے۔

”آج جعرات کا دن ہے۔ چاند کے لاماظ سے نوچندی جعرات ہے۔ یہ تاریخ ہر عالم و عالم کے لیے بڑی اہم ہوتی ہے۔ میں اب کام کرنے کا آغاز کرتا ہوں۔ میرے کام کرنے کا انداز یوں ہے کہ گھر کے تمام افراد ایک کمرے میں جمع ہو جائیں۔ عورتیں ایک طرف ہو جائیں، مرد ایک طرف، عورتیں اپنی چوپیوں کے بلکھوں دیں اور سر پر دوپٹا اچھی طرح جمالیں۔ مرد حضرات تو پی پہن کر رہیں۔ چراغ جلنے سے پہلے کمرے میں اندر ہمرا کر دیا جائے گا۔ میں عمل شروع کرنے سے سلسلے اس کمرے کا حصہ باندھ دوں گا۔ کوئی بھی شخص اٹھ کر باہر نہیں جائے گا اور نہ کوئی اندر آئے گا۔ جب میں چراغ جلاوں کا تو ساتھ ساتھ وظیفہ بھی پڑھتا جاؤں گا۔ اگر اس دوران میں کسی

آگیا کہ چلوگھوم لوں گا۔ اور جب میں نے خصتی کے وقت دہن کو دیکھا تو میں اپنے ہوش گنو بیٹھا۔

یہ دہن مجھے اتنی خوب صورت لگی کہ میں اس وقت سے ہی اس کے ساتھ ساتھ رہنے لگا۔ میں اس سے پچی محبت کرتا ہوں۔ میں اس کو حاصل کرنا چاہتا تھا اور چاہتا ہوں۔ میں تو پہلے ہی دن سے اس پر قابو پانا چاہتا تھا مگر یہ ہر وقت پاک صاف رہتی ہے اور نماز کے علاوہ وظائف بھی پڑھتی رہتی ہے اس لیے میرا اس پر زور نہیں چلا۔ یہ مجھے حاصل نہیں ہوا باری تھی اس لیے میں نے سوچا کہ پہلے ان لوگوں کو تم کروں یا اس کی خوبصورتی کو تم گردوں۔ تب ہی میں نے اس کے خون چڑھانے میں گڑ بڑ کر دی مگر برس ہو جانے کے بعد بھی اس کا شوہر اس سے پیزار نہیں ہوا تو مجھے غصہ آگیا اور میں نے فساد پھیلانا شروع کر دیا۔ میں نے ہی اس کے بچ کو مارا ہے مگر میں جتنے ہنگامے فساد دکھنے کا لیف آئی ہیں، ان سب کا ذمے دار میں ہوں میں آپ سے بھی یہ بنتی (الج) کرتا ہوں کہ اس کو میرے حوالے کر دو اور جو چاہے اس کے بد لے لے لو۔ یہ میری محبت ہے۔

اس پر عنایت صاحب بولے۔

”تو اسے محبت کرنے کا دعویٰ کرتا ہے تو یہ تیری کیسی محبت تھی کہ اس کے گھروں والوں کو اور اسے مسلسل نقصان پہنچانا تھا۔“

اس بات پر اس نے جواب دیا۔

”مجھے پہلی بھی رات ارم کا شوہر پسند نہیں آیا، کہاں ارم کا حسن اور کہاں بشیر کا لیا پھر میں نے اندازہ لگایا کہ میں اس کے ساتھ رہ سکتا ہوں کیونکہ اس کا میاں اتنا پرہیز گار نہیں ہے پھر میں نے اس کے دیور کا ایک ٹینٹ بھی کروایا کہ شاید مر جائے مگر اس کو اس کی جیب میں رہی ہوئی سورۃ

ہورہا تھا کہ جیسے اگلے لمحے وہ عنایت صاحب کا گلہ دبوچ لیں گی۔ اتنے میں عنایت صاحب اپنا وظیفہ روک کر بولے۔

”تو یہاں کب سے ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ پہلے تو مجھے یہ بتا پھر مجھے ختم کرنا اور یہ بتا کہ تو یہاں آیا کیوں؟ تیری یہاں آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ تو کیوں ان گھروں والوں کو تاخت پر بیشان کرتا رہا ہے؟ بول نہیں تو میں بہت ماروں گا۔“

خالہ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور بالکل خاموش ہاتھ باندھ کر منہ بھیچ کر بیٹھ کیں اور عنایت صاحب کو گھومنے لگیں۔ ان کی اس کیفیت کو دیکھ کر میرے تو روئکنے کھڑے ہو گئے کہ اللہ اب کیا ہو گا؟ یہ دیکھ کر عنایت صاحب نے دوبارہ وظیفہ پڑھنا شروع کیا اور چراغ سے جیل نکال کر جو نبی خالہ کے سر پر لگایا تو وہ فوراً چیخنے لگیں۔

”چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو، ابھی بتا تا ہوں۔ اس چراغ سے مجھے نہ جلاو۔“

”یہاں تو آیا کہاں سے ہے؟“ عنایت صاحب نے پھر پوچھا۔

”حیدر آباد سے آیا ہوں۔“

”تو حیدر آباد سے یہاں کیسے آیا ہے؟“ ”میں خود نہیں آیا بلکہ پھولوں کے ذریعہ آیا ہوں۔“

”کیا مطلب؟ صحیح بول، گول مول جواب نہ دے، ٹھیک بتا۔“

اور پھر اس جن نے بتایا کہ وہ ارم خالہ کی شادی والے دن آیا تھا۔ جو سہر خالہ نے پہنچا وہ سہر حیدر آباد سے آنے والے پھولوں سے بتا تھا اور جس باغ سے وہ پھول توڑے گئے تھے اس باغ میں میرا بسیرا تھا۔ پھولوں کے ساتھ میں بھی یہاں

ہوا کے ہاتھ

ہوا کے ہاتھ پر لکھا ہے تیرے نام یہ خط
کہ جس میں اس دل گنما کی کہانی ہے
ادھرے خواب کی رنگی خامشی اوڑھے
اسکی راہ پر پھری ہوئی جوانی ہے

ہوا کے ہاتھ پر لکھے ہیں وہ سمجھی ٹکوئے
کہ جو نظر سے سمجھی کنج لب پر آئے سکے
وہ سب خیال مرے، منتشر ہواؤں سے
کسی بھی نقطہ معنی پر سر جھکانا نہ کے

میں ان ہواؤں سے کہہ دوں کہ ان سے جا کے ملیں
یہ رات اب بھی اسی چاند کو بلاتی ہے
بکھرتے ہیں ستارے جو روپ کا کندن
ناکہ شوق اسی راستے پر جاتی ہے

ہوا کے ہاتھ پر لکھا ہے تیرے نام یہ خط.....

شائستہ مفتی

پتین نے بچالیا۔ عنایت میاں، ایک بات کان
کھول کر سن لے کہ میں اس کا پچھا بیٹیں چھوڑوں
گا۔ تم پچھے ہٹ جاؤ۔“ خالہ یہ کہہ کر بالکل
خاموش ہو گئیں۔ تقریباً پانچ منٹ کے بعد وہ
نارمل آواز میں بولیں۔

”یہ چراغ ابھی تک جل رہا ہے؟“
اس کے بعد خاموشی سے اٹھ کر دوسرے
کمرے میں چل گئیں۔ جب وہ چل گئیں تو عنایت
صاحب نے سب کو جانے کی اجازت دے دی اور
پروفیسر صاحب کو روک لیا۔ خالہ اپنے کمرے میں
جا کر بیدھ پر چادر اوڑھ کر لیٹ گئیں۔

امی نے پوچھا۔

”ارم کیا ہوا؟“

”آپا میں سوؤں گی میں تھک گئی ہوں وہاں
بیٹھے بیٹھے۔“ وہ بولیں۔

امی اور سب بڑوں نے کہا۔

”اچھا سو جاؤ۔ کوئی بات نہیں۔“

پھر ہم ان کو کمرے میں آکیلا چھوڑ کر دوسرے
کمرے میں آگئے۔ ابھی آئے ہوئے تھوڑی دیر
گزری تھی کہ خالہ کے رونے اور چینی کی آواز آئی
ہم فوراً ادھر بھاگے تو دیکھا خالہ زور زور سے رو
رہی ہیں اور جنچینچ کر اول فول بک رہی ہیں۔ وہ
کہہ رہی تھیں کہ عاصم کو بیلاو میں اس کا خون پوں
گی۔ ایسا منظر ہم سب میں سے کسی نے بھی اپنی
زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ ان کی ساس اور امی نے
ہست کر کے انہیں سنبھالنے کی کوشش کی تو خالہ نے
اپنی ساس کو زور سے دھکا دیا اور وہ نیچ گر گئیں پھر
امی کی پیٹھ کراتنے زور سے تھپٹ مار کر ای درد سے
دہری ہو گئیں۔ ای چونکہ اندازہ کر چکی تھیں کہ ان
پر دورہ پڑا ہوا ہے اس لیے وہ آئیتہ الکرسی کا ورد
کر رہی تھیں۔ اتنے میں عنایت صاحب اور تمام

روتے روتے بے ہوش ہو گئیں۔

عنایت صاحب اور دوسرے حضرات پھر دوبارہ اسی طرح بڑے ہال میں جمع ہو گئے اور خالہ کو بھی وہیں بلا لیا۔ خالو خالہ کو گود میں اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گئے اور ہال جا کر لٹا دیا۔ خالو کو عنایت صاحب نے باہر جانے کا اشارہ کر دیا۔ پروفیسر صاحب، عنایت صاحب اور جیلانی میاں، تینوں مرد حضرات خالہ کے ساتھ اندر رہے اور پھر ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ان کو باہر لائے اور کہنے لگے۔

” یہ بالکل نارمل ہیں مگر تمکہ زیادہ گئی ہیں اس لیے ڈاکٹر بلوا کرا کو نیند کا انجکشن لگاؤ کر ان کی نیند پوری کروائیں۔ منج تک بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔“ پھر ہم سب سے بھی بولے۔
” آپ لوگ اپنے اپنے گھروں کو جائیں۔ آرام کریں سب بہتر ہو گیا ہے۔ اب وہ خبیث شیطان کسی نہیں آئے گا۔“

وہ یہ کہہ کر پروفیسر صاحب سے کہنے لگے۔ ”چلیے حضرت صاحب! نماز پڑھنے چلتے ہیں۔ ویسے بھی تھا پڑھنی پڑے گی۔“ اس کے بعد خالہ کو پھر بھی دوڑہ نہیں پڑا۔ وہ اب بالکل ٹھیک ہیں مگر اب بھی ان کو کچھ باشیں معلوم ہیں اور کچھ نہیں۔ اب تو بچے بھی کافی بڑے ہو چکے ہیں۔ بڑے بچوں کو حالات کا علم ہے۔ اس واقعے کو ہم سب تقریباً بھول ہی گئے ہیں۔ جب کسی دوسرے کا واقعہ سنتے ہیں تو یاد آ جاتا ہے۔ امیر خالہ کا برس اب بھی ٹھیک نہیں ہوا ہے غر ان میں احساس مکتری ختم ہو گئی ہے اور اب ان میں اتنا اعتماد پیدا ہو گیا ہے کہ اب وہ سب کا سامنا آرام سے بغیر میک اپ کے کرتی ہیں۔

☆☆.....☆☆

مرد حضرات آواز سن کر اوپر آگئے۔ عنایت صاحب نے فوراً سب کو کمرے سے نکل جانے کا اشارہ کیا اور کہا کہ باہر بیٹھ کر سب درود شریف پڑھیں۔ آپ لوگ پریشان نہ ہوں یہ ٹھیک ہو جائیں گی اور پھر پروفیسر صاحب اور جیلانی میاں سے کہنے لگے کہ آج کام مکمل کرنا ہے۔

پروفیسر راضی الدین صاحب کے پاس حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے موئے مبارک، روضہ پاک کی مبارک مٹی اور بزرگوں کے دیے ہوئے کافی تبرکات میں جوان کے پاس محفوظ ہیں اور جن کو وہ بغیر وضو کے کسی کو ہاتھ بھی لگانے نہیں دیتے۔ وہ تمام تبرکات لے آئے اور ارم خالہ کے اوپر چھاؤ کرتے چاتے اور کہتے جاتے۔

” الہی! میری بیوی کو ٹھیک کر دے۔“ زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے اتنے بڑے آدمی کو اپنی بہو کے لیے روتے ہوئے دیکھا۔ ان سب کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی رونے لگے۔ ارم خالہ پر جسب تبرکات کی بارش کی گئی تو وہ ایک دم نارمل ہو نہیں اور زور سے نیتیں پڑھنے لگیں اور کہنے لگیں کہ تم لوگ بھی پڑھو نہیں تو وہ مجھے مار دے گا۔ نیغمہ آیا مادر آؤ،“ میرے پاس مجھ سے ڈر نہیں، آیا مجھے نہیں چھپا لو۔ پھر یہ کہہ کر رونے لگیں کہ وہ مجھے مار دے گا۔

ان کو کچھ ہوتا دیکھ کر امی نے فوراً آن کے سر پر شفتقت سے ہاتھ پھیرا اور کہا۔

” بیٹی کیا ہوا؟ کیوں رورہی ہو؟“ وہ کہنے لگیں۔

” آپا بہت مارتا،“ کہہ رہا ہے کہ چپ ہو جا نعت نہیں پڑھ نہیں تماروں گا۔ آپا مجھے بچا لو وہ مجھے مار دے گا، ہائے اللہ مار رہا ہے۔ چھوڑ دو، چھوڑ دے خبیث میرے بال چھوڑ دے۔“ وہ

دوشیزہ ڈا جسٹ میں اشتہار کیوں دیا جائے؟

- پاکستان کا یہ واحد رسالہ ہے، جس کا گزشتہ چوالیں (44) برس سے چار نسلیں مسئلہ مطالعہ کر رہی ہیں۔
 - اس لیے کہ جریدے میں شائع ہونے والے اشتہارات پر قارئین بھرپور اعتماد کرتے ہیں۔
 - اس میں غیر معیاری اشتہار شائع نہیں کیے جاتے۔
 - پوری دنیا میں پھیلے اس کے لاکھوں قارئین متوسط اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، جو مستند اور معیاری مصنوعات کی خریداری کو ترجیح دیتے ہیں۔
 - اس لیے کہ دوشیزہ ڈا جسٹ کو گھر کا ہر فرد یکساں دلچسپی سے پڑھتا ہے۔
 - جریدے کے ہر شمارے کو قارئین سنبھال کر رکھتے ہیں۔
 - اس جریدے کے بڑی تعداد میں مستقل خریدار ہیں، جو اندر وون اور بیرون ملک پھیلے ہوئے ہیں۔
 - آپ کی مصنوعات کے اشتہار با کافیت اُن تک پہنچ سکتے ہیں۔
 - جریدے کی اعلیٰ معیار کی چھپائی آپ کے اشتہار کی خوب صورتی میں اضافہ کرتی ہے۔
- شعبا اشتہارات: **دوشیزہ**

II 88-C - فرست نلوں - خیابان جامی کمرشل - ڈینس باؤ سنگ اخواری - فیز-7، کراچی

فون نمبر: 35893122 - 35893121

روزِ انتہا و جلوہ

مرجان جائی گی

جس قدر دمڈلے ہیں چروں کے نقوش
روشی تو اس قدر مدھم نہیں

فوزی فرید

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہونے میں ابھی جانے کی تیاریوں میں مکن ہی۔ اس کی ایس کی
تین دن باقی تھے اور نرہ ابھی سے اپنی نافی کے گمراہ اس بے نابی کو دیکھ کر مسکرائے جا رہی تھیں۔ نمرہ



جانے کی اطلاع دے رہی ہیں۔ تیاریوں کو دیکھ کر تو یوں لگ رہا ہے جیسے آپ کو کوئی اجازت نہ بھی دے تو آپ نے ہر صورت جانا ہے۔ ”ابو کے اس طرح کہنے سے نمرہ شرمندہ ہو گئی اور بولی۔

”ابو! اگر آپ اجازت نہیں دیں گے تو میں نہیں جاؤں گی۔“ ابو مسکنے لگے اور بولے۔

”میری بیٹی نے اتنی ڈھیر ساری تیاریاں کی ہیں۔ میں بھلاسے کیے منع کر سکتا ہوں۔ جاؤ پہلا خوشی جاؤ! مگر اس بات کا دھیان رہے کہ کوئی ایسا کام مت کرنا جو مجھے کوئی شکایت ملے۔“

نمرہ اجازت ملتی دیکھ کر خوشی سے نہال ہو گئی۔ ابو کا شکریہ ادا کر کے اپنے کمرے کی طرف بھاگی کر ابھی تو اور بھی پینگ کرنا تھی۔

☆.....☆

دوسرے دن نمرہ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ہمراہ نانی کے گھر میں موجود ہی۔ نانی کا گھر ایک سو فیں گز پر مشتمل تھا۔ پہلے نانی کا گھر 80 گز کا تھا۔ اسی گھر سے ای کی شادی ہوئی تھی۔ ای کی شادی کے بعد جب کام کاچ کے لیے نانی کو دو شواری ہونے لگی تو نانی نے ماموں کی شادی اپنی بہن کی بیٹی سے کروی۔ مامانی حان معنوی شکل و صورت کی تھیں مگر سیرت کی اپنی تھیں وہ سب کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ نانی کو ان سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی۔

نانی کے انتقال کے بعد مامانی نے نانی کا ہر طرح خیال رکھا تھا اور ان کی دل جوئی میں گئی رہتی تھیں یہاں تک کہ نانی نانا کو بھلانے میں کامیاب ہو گئیں۔ نانی نے پورے گھر کا انتظام مامانی کو سونپ دیا تھا۔ غرض کہ مامانی نے نانی کا گھر بڑے اچھے طریقے سے سنبھال رکھا تھا۔

تین بیس اور تین ہی بھائی تھے۔ نمرہ سب سے چھوٹی تھی سب کی لاڈی تھی۔ اس لیے اپنی ہر جائز ناجائز بات منوانا اپنا تھا اور دو منزلہ تھا۔ چالیس گز پر بنایا ہوا تھا اور دو منزلہ تھا۔

نمرہ کو اپنا گھر بہت چھوٹا لگا کرتا تھا۔ بقول اس کے ان کا گھر مرغی کا ڈری ہے تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ گھر ہوتا نانی کے گھر جیسا کھلا کھلا، ہوا دار بڑے بڑے کروں والا چیا انسان کا دم تو نہیں گھٹ سکتا۔ اسے نانی کے گھر میں بہت مزا آتا تھا وہاں پر اس کے ہم عمر کزن بھی تھے جو سب مل کر گھر کے ایک حصے میں بنے ہوئے چھوٹے سے باغ میں کھیلا کرتے تھے۔ اس باغ میں پھولوں کے پودوں کے علاوہ آم اور چیکو کے درخت بھی تھے کونے میں ایک چھوٹا سا امر و دکار درخت بھی لگا ہوا تھا جس میں تھوڑے بہت امر و نکل آبے تھے۔

بجھ اس میں سے کچھ امر و دکار کو کھا کر ہی انجوائے گریا کرتے تھے۔ آم کے درخت پر جھولا ڈالا ہوا تھا جس پر باری باری پاری پاری پسچ جھولا کرتے تھے آم اور چیکو کے درخت کا سایا پورے باغ کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بچے بڑے سکون سے اس حصے میں اپنی اپنی پسند کے کھیل کھیلا کرتے تھے۔ دن تو ان پھول کا کھیل کو دیں گزر جاتا اور رات کو نانی سے فرمائش کر کے کہانی سننا روز کے معمولات میں شامل تھا۔ یہ تمام ایکی دنیز نمرہ کو بے حد پسند تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ نمرہ کو چھینوں کا بے چینی سے انتظار رہتا تھا۔ خدا خدا کر کے پہ تین دن بھی جیسے تیسے گزر گئے۔ نمرہ نے جب نانی کے گھر جانے کے لیے ابو سے اجازت مانگی تو اس کے ابو بولے۔

”آپ اجازت مانگ رہی ہیں یا اپنے

ہونے لگی اور نانی کا دل بھی بہل گیا تھا باقی کا وقت بہو بیٹھے اور پوتے پوتوں کے ساتھ گزرنے لگا۔ ان کو تمام پوتے پوتوں نواسے نواسیوں میں نمرہ سب ہی کو زیادہ عزیز تھی وہ اس کی کسی بات کو رہنیں کپا کرتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب نمرہ ان سے کہانی سنانے کی فرمائش کرتی تو وہ باوجود طبیعت کی خرابی کے اسے کہانی سنایا کرتی تھیں۔

اس دن نمرہ نے نانی سے کہانی سنانے کے لیے کہا تو وہ بولیں۔ بیٹا ایسا کرو عاشی کو بھی بلا لو وہ بھی تمہاری طرح کہانی سننے کی شوقیں ہے۔ جاؤ بیٹا سے بھی بلا لو۔“ میں عرشی کو بلانے چل دی۔

کچھ ہی دیر بعد ہم نانی کے پیڑ پر بیٹھے ان سے کہانی سن رہے تھے۔ کہانی مکمل ہوتی تو پوتوں، نواسے نواسیوں نانی نے کہا۔

”عاشی تم جاؤ میں نانی کے ساتھ سوؤں گی۔“ عاشی بولی۔ ”میں بھی دادی کے ساتھ سوؤں گی۔“ میں نے عاشی سے کہا تم توہر وقت نانی کے ساتھ رہتی ہو تم کسی اور وقت سو جانا آج مجھے سونے دو۔“ عاشی نے کہا۔

” یہ میری دادی ہیں۔ میں ان کے ساتھ سوؤں گی تم مجھے کیوں منع کر رہی ہو۔ یہ تمہاری نانی بعد میں پہلے میری دادی ہیں۔“

ہماری تکرار سے تجھ آکر نانی نے کہا تم دونوں جاؤ اور مجھے آرام کرنے دو۔ میں نے نانی سے کہا۔

”نانی آپ عاشی سے بولیں یہ اٹھے اور اپنے کمرے میں جائے۔ بس مجھے آپ کے ساتھ سونا ہے۔“ میں نے حتی لمحہ میں کہا۔

نانی کے گھر کے برابر میں کریم الدین صاحب رہتے تھے۔ ان کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی صرف ایک بیٹی تھی اتفاق سے بیٹی بھی گردن توڑ بخار میں جل بی تو کریم الدین اس دنیا میں بالکل تہارہ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے اسی گز گھر کو دھوکوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک حصے کو کارے پر چڑھا دیا تھا جب کہ دوسرے حصے میں انہوں نے چھوٹی چھوٹی کیاریاں بنا کر اس میں مختلف قسم کے پودے لگا لیے تھے۔ آم اور چیکو کے درخت تو پہلے ہی موجود تھے۔ کریم الدین کی تہاری کا یہ اچھا خال تھا وہ سارا وقت ان پوتوں کی دلکش بھال میں لگے رہتے اور کچھ ہی عرصے بعد جب ان پوتوں میں ان کی لگائی ہوئی سبزیاں آتا شروع ہوئیں تو وہ بے انتہا خوش ہوتے وہ اکثر موکی سبزیاں لگاتے اور ان سبزیوں کو ایک جانے والے سبزی فروش کوستے داموں فروخت کر دیتے تھے۔

ان کی دن رات کی محنت کا نتیجہ یہ تکلا کہ ان کا گھر ایک چھوٹے سے باغ میں تبدیل ہو گیا مگر خود ان کی صحت گرتی چل گئی اور ایک وقت ایسا آیا کہ وہ بستر سے جا گئے اس وقت نانانے ان کی دل و جان سے خدمت کی تھی۔ نانا کی خدمت سے متاثر ہو کر کریم الدین نے اپنا گھر نانا کوستے داموں میں فروخت کر رہا تھا اور کچھ دنوں بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

ان کے انتقال کے بعد نانا نے ان کا گھر اپنے گھر میں شامل کر لیا تھا اور باقی کا گھر کرائے پر ہی رہنے دیا۔ کچھ عرصے بعد نانا کا بھی انتقال ہو گیا تو نانی اوس رہنے لگیں۔ نانی نے اپنی ادای دور کرنے کا حل یہ نکلا کہ اس باغ کی دلکش بھال کرنے لگیں اس سے باغ کی دلکش بھال بھی

”اور مجھے بھی تیکی سوتا ہے۔“ یہ کہہ کر عاشی نانی کے برادر میں لیٹ گئی۔

یہ دیکھ کر مجھے بے حد غصہ آیا۔ میں نے ان کے کمرے سے نکل کر باہر آئی اور اپنا تکیری اور چادر اٹھا کر نانی کے کمرے کی دہنی پر اپنا تکیری رکھا اور چادر تان کر لیٹ گئی۔

نانی نے مجھ سے کہا۔ ”نمہرہ بیٹا دروازے کے پیچوں بچ نہیں لینا کرتے۔ آدمی میرے پاس آ جاؤ۔“ پھر انہوں نے عاشی سے کہا۔ ”عاشی بیٹا تم اپنے کمرے میں جاؤ نمہرہ تو کبھی کبھار آتی ہے۔ اسے میرے پاس لیٹ جانے دو تم کل لیٹ جانا، جاؤ بیٹا اچھے بچ بڑوں کا کہنا مانتے ہیں۔“ نانی کے کہنے پر عاشی بیدار سے اتر کر دروازے کے پاس آتی اور رک کر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

”نمہرہ مجھے باہر جانا ہے راستے سے ہٹو۔“ مگر میں اپنے ہی لیٹی رہی اس نے مجھ سے دوبارہ پہنچ کر ہماری میں اسی طرح لیٹی رہی۔ اس نے مزرکر نانی کی طرف دیکھا اور کہا۔

”دیکھیں نانی! نمہرہ مجھے باہر جانے کا راستہ نہیں دے رہی۔ اب آپ ہی بیٹا میں میں کیا کروں۔“ اس نے بے زاری سے کہا۔ نانی نے مجھ سے کہا۔ ”نمہرہ بیٹا میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے پریشان مت کرو آ جاؤ میرے پاس اور عاشی کو جانے دو۔“

میرا موڈ بیری طرح آف ہو چکا تھا۔ اس لیے نانی کی بات بھی میں نے نظر انداز کر دی۔ کچھ دیر تک نانی مجھے آجائے کے لیے کہتی رہیں مگر میری ہٹ وھری دیکھ کر وہ بھی خاموش ہو گئیں۔ عاشی نے بھی جب دیکھا کہ میں اُس سے مس نہیں ہو رہی ہوں تو وہ واپس جا کر نانی کے بیڈ پر لیٹ گئی۔

کمرے میں مکمل خاموشی ہو گئی تو مجھے بھی نینڈ آنے لگی اور کچھ ہی دیر بعد میری بھی آنکھ لگ گئی۔

☆.....☆

رات کا نہ جانے کون سا پھر تھا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے ابھی ابھی میرے چہرے پر لال بیگ چل کر گیا ہو۔ اس کی کائنے دار تانکیں میرے چہرے سے مس ہوئی تھیں جس کی چیزوں سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ لال بیگ کو ماروں معاونجھے اپنے چہرے پر ایک بار پھر وہی احساس ہوا۔ میں نے پھر تھی سے تھا اسے چہرے پر سے جھٹکا۔ مگر کچھ ہی دیر بعد پھر وہی لال بیگ میرے چہرے پر چل رہا تھا۔ میں نے جب اپنے پورے جسم پر یعنی سر سے پیرنک چادر ڈال لی تو اس لال بیگ کا احساس اب بھی ہو رہا تھا۔ میں اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتی تو کچھ نہ ہوتا تھا مگر ہاتھ ہٹاتے ہی پھر وہی محسوس ہوتا اس کے کچھ ہی دیر بعد مجھے اپنے چہرے پر کسی کی انگلیوں کا مارنا محسوس ہونے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی اپنے ہاتھوں کی پوروں سے میرے چہرے پر ضرب لگا رہا ہو۔ ان انگلیوں کے ناخن مجھے اپنے چہرے پر چھتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ میں نے ہمت کر کے ان ہاتھوں کو پر دھکیلا تو وہ میکانی انداز میں دوبارہ میرے چہرے پر آ موجود ہوئے۔ مجھے بہت خوف محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر کوٹش کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے ان ہاتھوں کو دور کیا۔ مگر میری حررت کی اختناہ رہی جب وہ ہاتھ میرے ہاتھ کے ساتھ لگ کر دوبارہ اپنی جگہ پر آگیا اور پھر اسی طرح میرے چہرے پر انگلیاں مارنے لگا۔ خوف سے میرا براحال تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو مجھے اپنے سینے پر کسی کی

ہوئی میرے ساتھ تھی۔ میں چادر سمیت گرتی پڑتی تھی نافی کے بیٹھ پڑھ گئی۔ اس بات کی پرواکے بغیر کہ میرے اس اچاک رعمل کی وجہ سے بے خبر سوئی ہوئی نافی کا کیا حال ہو گا۔ میں بیٹھ پڑ آتے ہی نافی سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میرے رونے کی آواز سن کر دوسرا کمرے میں سوئے ہوئے ماموں اور مہانی بھی گھبرائے ہوئے نافی کے کمرے میں آگئے۔ نافی مجھے خود سے چھٹائے ہوئے بھی پوچھتے جا رہی تھیں کہ آخر ہوا کیا ہے۔ تم بتائی کیوں نہیں ہو۔“

میرے الفاظ جیسے میرا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ میرے منہ سے بے ربط تبلے لکلر رہے تھے۔ مہانی نے عاشی کو پانی لانے کو کہا۔ عاشی پانی لے کر آئی تو مہانی نے مجھے پانی پلا پایا اور مجھے حوصلہ دیا۔ ماموں نے مجھے سے پوچھا۔

”بیٹا کیا بات ہے تم اتنی ڈری ہوئی کیوں ہو اور تم اتنی برقی طرح رورہی ہو۔ ہمیں بتاؤ دکھو پریشان مت ہو، تم سب تھارے پاس ہیں۔ ڈرو ہمیں کیا ہوا تھا جو تم یوں رورہی ہو۔“

سب کو اپنے آس پاس دیکھ کر پھر ماموں کے تسلی کی بدولت مجھے حوصلہ سا ہوا پھر جو کچھ مجھ پر بتا تھا میں نے حرفاً حرفاً سب کے گوش گزار کر دیا اس کے ساتھ ہی میں نے کل ہی گھر واپس جانے کا فیصلہ بھی سنادیا۔

سب ہی ران تھے کہ اسی گھر میں رہتے ہوئے انہیں کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ بھی بھی اس قسم کا کوئی کیسے ہو گیا تھا۔ انہیں اس بات کو لے کر بڑی حیرت تھی مگر میری بدحواس صورت دیکھ کر انہیں یقین کرنا پڑا تھا۔ وہ رات سب نے جاگ کر

موجودگی کا احساس ہوا۔ میری ساری توجہ کیونکہ اپنے چھرے پر تھی اس لیے میں کچھ اور محسوس ہی نہ کر سکی تھی۔ اس دوہری مصیبت کی وجہ سے مجھے اپنا دم گھستا ہوا لگ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے آج کی رات میری زندگی کی آخری رات ہے۔ اتنی بے بی کی موت میں مرنا نہیں چاہتی تھی۔ اسی لیے میں نے ایک بار پھر کوشش کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سے پہلے میں یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ آیا واقعی میرے ساتھ یہ سب کچھ کی غیر مرئی مخلوق کی کارستانی ہے یا کسی کی شرارت ہے۔ یہ جانش کے لیے میں نے اپنے چھرے پر پڑی ہوئی حادر کو با吞وں پر تان کر چادر کے اندر سے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔

باہر کا مظظر میرے اوسان خطرا کر دینے کے لیے کافی تھا۔ خوف سے میرا پورا جسم کا پر رہا تھا پسینے کی وجہ سے میرا پورا جسم تر ہو چکا تھا۔

میں نے جب چادر تان کر باہر دیکھا تو کوئی میرے سینے پر سوار تھا اور وہ تیزی سے آگے پیچھے حرکت کر رہا تھا۔ بھی اس کا چہرہ میرے چھرے کے پاس آ جاتا تھا۔ واپس چلا جاتا، اس وجود کے ارد گرد دو دھیاروں نے ہالا کیا ہوا تھا۔ اس روشنی کی وجہ سے میں اس وجود کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میرے خوف اور اس وجود کی حرکت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس وجود کے وزن کی وجہ سے میری سائنس رفتی جا رہی تھی میں بے بی سے ادھر ادھر ہاتھ پیر مار رہی تھی۔

میرے اندر جینے کی امنگ نے اسی لمحے آخري کوشش کر لینے پر اس کیا میں نے اپنی پوری قوت مجتمع کر کے اس وجود کو پرے دھکلنے کی کوشش کی جس میں، میں کامیاب رہی اور پھر ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر میں اپنی نافی کے کمرے کی طرف دوڑ گئی چادر بھی میرے پیروں میں اٹھتی

گزاری تھی۔

☆.....☆

صحیح ماموں جیسے ہی ناشتے سے فارغ ہوئے تو
میں اپنا بیک لے کر آگئی اور ان سے کہا۔ چلیں
ماموں میں تیار ہوں۔“

انہوں نے میری تیاری دیکھی پھر کہا۔ ”بینا
پہلے ناشتا تو کرو لو۔“ پھر وہ بولے۔

”بینا تم نے سوچا ہے تمہارے یوں صحیح
جانے سے باہمی اور بھائی صاحب سنتے پر بیان
ہوں گے۔ میری بات مانو دو پھر تک رک جاؤ پھر
چل جانا پا پھر شام تک انتظار کر لو میں دفتر سے
آتے ہی تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا۔“

ان کی بات سن کر میرا چھرہ لٹک گیا اس وقت
اس گھر کی کوئی چیز بھی اچھی نہ لگ رہی تھی۔ اس
لیے ماموں کی بات سن کر میں چپ ہو گئی۔

میرے چہرے کے بخشنہ گھلاتے زاویے دیکھے
کر ماموں نے کہا۔

”بینا! پا اس اجھی آپ کو میں آپ کے گھر
چھوڑ کر آؤں گا۔ ٹھیک ہے۔“

میں جانتی تھی ماموں جھوٹ نہیں بولتے تھے۔
اس لیے مجھے ان کی باتوں کا یقین کرننا پڑا اور واقعی
اسی شام کو میں اپنے گھر میں موجود تھی۔ اس واقعے
کے باوجود میں ماموں نے اسی کو خفڑا ایجاد کیا تھا۔

نانی کے گھر سے آنے کے بعد میرا بخار
اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ابو کے ایک
جانے والے نے ابو کو ایک صوفی صاحب کا پتا دیا
تھا۔ ابو مجھے لے کر وہاں گئے تھے۔ انہوں نے
پوری بات سننے کے بعد کہا تھا کہ دن اور رات
کے منوع اوقات میں دروازوں کے درمیان لیٹنا
بیٹھنا نہیں چاہیے۔ پنجی سے بہر حال یہ غلطی سرزد
ہو چکی ہے آپ اسے لے کر دوبارہ اسی جگہ جائیں۔

اسپانڈٹو

برلن کا اسپانڈٹو قید خانہ 1887ء میں تعمیر کیا گیا
تھا اور اس میں 600 قیدیوں کے رکھنے کی گنجائش
تھی۔ تاہم بعد میں ایک وقت آیا جب اسپانڈٹو قید
خانے میں صرف ایک قیدی رہا کرتا تھا۔ وہ قیدی
دوسری بجک عظیم کا نازی محمد روزولف بس
(بیدائش 16 اپریل 1894ء وفات 17 اگست
1976ء) تھا۔ اس خیل خانے کے عملے
کی تعداد 105 تھی اور ان لوگوں پر سالانہ 4 لاکھ
15 ہزار ڈالر خرچ کئے جا رہے تھے۔ 19 اگست
1987ء کو یہ اعلان کیا گیا کہ بس نے بھلی کے تاریکی
مد سے گاہکوٹ کر خود بٹھی کر لی ہے اور اس نے مرنے
سے پہلے ایک تحریر چھوڑی جو قدیم جرمن زبان میں
لکھی ہے۔ اس پانڈٹو کی ایک کال کوٹھری میں اس نے
انپی زندگی کے 40 سال قید تھائی میں گزار دیے تھے
اس کی موت کے دو ماہ بعد یہ قید خانہ مسماں کر دیا گیا۔

اور اسی نائم میں کہ جس وقت اس نے وہاں لینے
کی غلطی کی تھی معافی مانگئے۔“
اس کے علاوہ انہوں نے ایک تعویذ بگئے میں
پہنچنے کے لیے دیا تھا اور دم کیا ہوا پانی بننے کے لیے
دیا تھا۔ ان کے بتائے گئے طریقے پر عمل کرنے کی
وجہ سے آج تک دوبارہ پھر میرے ساتھ اس قسم کا
کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔
اس کے بعد پھر بھی میں نانی کے گھر رکنے
کے لیے نہیں گئی بس دن ہی دن کے لیے جاتی اور
اسی دن واپس آ جاتی تھی۔ اس واقعے کو گزرے
ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ میری شادی ہو چکی
ہے مگر آج بھی اس رات کو پیش آنے والا واقعہ
مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

☆.....☆

ایک نہایت ہی منفرد لمحہ پر اسرارِ سلامہ جسے آپ عرصہ دراٹنگ پار گھسن گے



علامہ سید اجتبی حسین رضوی کا خیال

اس دل کا تحریر تھا آئینہ، اس سر کا تصور تھا موقم
تمثال پر نقطے لکھیے، تصویر بدلتی چلی گئی

(چوتھی قسط)

شاذی سعید مغل

سد صاحب کے پارے میں کچھ باتیں مشہور تھیں کہ بچپن سے جاتا ان کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں، اس میں کتنی چھائی تھی، کتنی نہیں، لیکن ایک بات ضرور تھی کہ جب بھی سید صاحب اپنے کسی بھی قسم کے دورے پر گھر سے لکھے ہوتے تھے، ان دونوں بھی ان کے گھر میں اسرار قسم کے لوگوں نے آمد و رفت کا سلسلہ جاری و ساری رہتا تھا۔

اول تو ان کے پیچے ان کے گھر کوئی جاتا ہی نہیں تھا مگر اگر کوئی رشتہ دار بحالت مجبوری کسی قسم کی مصیبت میں پھنس کر اس طرف بغیر اطلاع کے نکل جاتا تو ان کے مریدین (بقول سید صاحب یہ چند مہاراست قسم کے قد آور انتہائی پر کشش مردوزن ان کے مریدین ہیں) جنگل کی حدود میں داخل ہونے والے اس فرد کا راستہ روک لیتے اور انتہائی ملاحت بھرے ہے تکن چہرے کے ساتھ مکراتے ہوئے اُس فرد کے گوش گزار کر دیتے کہ سید صاحب گھر پر تشریف نہیں رکھتے۔ اس کے بعد کسی رشتہ دار کی کمی ہتھیں پڑی جو وہ ان سے اس سلسلے میں کوئی بھی چوری بھث کرے۔

محسن شیرازی اور صولات یگم نے بھی بھی ان سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ ان کے لیے یہ بات بھی بڑے اعزاز کی تھی کہ ان کے کامدان کی ایک انتہائی معبر اور بزرگ ہستی ان کے اکلوتے بیٹے کی شادی میں نہ صرف شریک ہوئی بلکہ خلافی معمول وہ محسن اور فائزہ کی شادی میں تین دن متواتر ان کے گھر ٹھہرے، ایسا اعزاز سید صاحب نے آج تک خاندان میں کسی کو نہ بخشنا تھا کہ وہ کسی کے بیٹے یا بیٹی کی شادی میں ٹھہرے ہوں۔

ہاں ان کا یہ اصول بداکڑا تھا کہ وہ اپنے خاندان میں خوش اور غم کے موقع میں شرکت ضرور کرتے، اس کے علاوہ چاہے سالوں گزر جائیں وہ کسی کے گھر شاذ ہی جاتے تھے، جیسا کہ ان کے ہاں محسن کی شادی پر آئے تھے اور اب ان کو چار سال ہو رہے تھے، بس فون پر ہی محسن شیرازی ان سے علیک سلیک



کر لیتے تھے۔

اس گھر میں شفت ہونے کے بعد صولت جہاں نے سید صاحب کوفون کیا تھا وہ سید صاحب کو اس نے
گھر میں بلانا چاہتی تھیں، سید صاحب نے دعوت بھی قول کر لی تھی، مگر انہیں فرستہ نہ مل سکی اور یوں ابھی
تک وہ اس گھر میں نہیں آسکے۔ اب جو ان کے گھر میں یہ واقعات ہو رہے تھے تو ان کا ذہن فوراً سید
صاحب کی طرف چلا گیا وہ تو اس وقت اپنی عقل پر ماتم کر رہی تھیں کہ اتنے دن سے انہوں کے دل و دماغ
میں یہ بات کیوں نہیں آئی کہ وہ سید صاحب سے رجوع کر لیں اب وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گئیں کہ رات ہی
وہ اپنے شوہر سے بات کریں گی انہوں نے اب تمام واقعات شوہر کو تفصیل سے بتانے کی تھان لی تھی۔

”کیا..... کیا کہہ رہی ہو؟“ حسن شیرازی نے صولت جہاں کی طرف ایسی نظر دیں سے دیکھا جبے اُن
کو ان کی دماغی صحت پر شہرگز رہا ہو۔

”مگر یہ کوئی ایسی بات تو نہیں ہے کہ آپ سب سن کر اتنا بگزہ رہے ہیں مجھے حیرت ہو رہی ہے اور پھر
میں تو سید صاحب سے بُس مشورہ کرنا چاہ رہی ہوں۔“

”سید صاحب کیا سوچیں گے کتنا فال تو سمجھ رکھا ہے، ہم نے ان کو اوٹ پا گک خواب فضول سوچیں
باتیں، ہمیں تو اب تک ایسی کوئی بات محسوس نہیں ہوئی۔ حسن شیرازی اب تھے سے ہی اکھڑ گئے تھے۔
انہوں نے ناک پر عینک درست کر کے صولت جہاں کو گھوڑا۔

اس وقت وہ ایک تاریخی ناول پڑھ رہے تھے۔ صولت جہاں نے جب بات شروع کی اور تمہید باندھی
کر ایک بہت ضروری بات ہے اور آج ہی کرنی لازمی ہے تو انہوں نے اپنا پسندیدہ ناول ایک طرف دھر
دیا تھا، اور ہم ترن گوش ہو گئے تھے۔

وہ رات میں کچھ درپر مطالعے کے عادی تھے اور پھر اپر ان کا تاریخی من پسند ناول جوانہوں نے کل ہی
شروع کیا تھا، اس وقت کل آنکھ پر تھا کہ صولت جہاں کی پُر اہتمامی سرگوشی کہ بے حد ضروری بات ہے نے
آن کا کل آنکھ توڑا.....

اور پھر ان کی ضروری بات سن کر حسن شیرازی کا ٹھیک ٹھاک مودہ خراب ہو گیا۔ انہوں نے ایک بار
پھر ناول اٹھا کر نشانی لگاتے ہوئے ورق کو نکالا اور ناول منہ کے آگے کر لیا۔

”آپ جانتے ہیں میں وہی نہیں ہوں اور نہ ہی کوئی ڈرپوک قسم کی عورت واقع ہوئی ہوں۔“ صولت
جہاں نے دبے دبے لجھے میں بولا اور چور نظر دیکھا۔ جہاں سے ٹھن کا آدھا حصہ بہ
خوبی نظر آتا تھا، اور وہ آدھا حصہ امتیاز کے درخت پر مشتمل تھا۔

ان کی کھڑکی کے سامنے ٹھن میں امتیاز کا درخت ہوا کی تال پر جھوم ریا تھا، رات کے اس پھر بارہ
بنجے چار ہے تھے ٹھن میں بر قی قلعوں کی ہلکی دودھیاں اسی روشنی اسرار پھیلارہی تھیں۔ اس سے زیادہ ان سے
نظر اڑنے نہیں ہوا آگے بڑھ کر پردہ گرا دیا۔ انہوں نے ایک نظر شوہر کی طرف ڈالی وہ ناول میں از سر نومنہ ک
ہو چکے تھے۔

صولت جہاں نے ایک بار پھر بات جہاں سے نਊ تھی جوڑی، انہوں نے جیسے تھاں ہی لی تھی وہ حسن
صاحب کو آج رات قابل کر کے ہی دم لیں گی۔

”صرف خواب کی حد تک بات ہوتی تو یقین سمجھی میں دو چار دن میں بھول سکتی تھی، مگر آپ ہی مجھے بتائیے کہ بیداری کی حالت میں اپنے پورے ہوش دھواں میں ایسے واقعات کے ایک تسلسل سے گزرا، وہ ماںوں انوکھی مہک جو خواب و بیداری دونوں حالتوں میں اسے ہونے کا ثبوت دے رہی ہے کیا ہے؟ اور اور پھر یہ سب میرے ساتھ تھیں ہورہا ہے۔ مجھے اب بالکل واضح یقین ہو چلا ہے کہ یہ سب میری پونچی میری امتاس سے ہڑا ہے۔ کہتے کہتے صولات جہاں اب روہائی سی ہو گئیں تھیں، پچھے ہی پل تھے آنکھیں برنسے کو تیار تھیں۔

”مجھے ہماری امتاس کچھ انوکھی سی کچھ خاص سی پونچی لگتی ہے، دوسرا بچوں سے مختلف..... ہر ماں باپ کو اپنا بچہ دنیا کے تمام بچوں سے انوکھا اور خاص نظر آتا ہے، اور بعض لوگ تو اس کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں۔“

حسن شیرازی کو صولات جہاں کے گلوکیر لجھے اور ان کی حالت نے ایک بار پھر اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

”دیکھو صولات..... حسن ہمارا اکلوتا بیٹا ہے، میں جانتا ہوں تم نے ہمیشہ سے ایک نعمتی گزیا کے خواب دیکھے تھے، تم اور مگر زیب کے وقت بھی شاید ایسی خواہش اور اس کے لیے بالکل نہ تھیں، جیسا کہ امتاس کے لیے ہوئی یہ نچھل ہے صولات، ہوتا ہے ایسا، اب جا کے تھیں ایک نعمتی گزیا تھی تو تم نے اسے کانچ کی گڑیا بیالیا، انوکھی اور خاص، جب تمہاری سوچ انوکھی ہے خاص ہے سب سے الگ ہے یہ گردش کریں گی تو تمہارے ساتھ واقعات بھی ایسے ہی ظہور پذیر ہوں گے، انوکھے خاص۔“ حسن صاحب نے اپنے تینیں امتاس کے حوالے سے ہونے والے پے در پے واقعات کو صولات جہاں کا امتاس کے حوالے سے اتنا حساس ہونا ثابت کیا تھا۔

”مجھے بے حد افسوس ہے بلکہ دکھ ہورہا ہے کہ میں اپنی بات آپ کو یا یوں کہہ لیں تو زیادہ بہتر ہے کہ اپنی انتہائی پریشانی آپ کو سمجھانیں یا۔۔۔ صولات دلکیر لجھے میں گویا ہوئیں۔

”آپ میری اس تمام پریشانی کو جوان پے در پے ہونے والے پر اسرار و واقعات کی وجہ سے آج انتہائی عروج پر گھنی بالکل بن پھیل کر رہے ہیں۔ ایک مرتبہ بھی آپ میری اس بات پر غور کرنے کو تیار نہیں ہو رہے تو بس ٹھیک ہے۔“ صولات جہاں لکھست خورده لجھے میں بولیں اور تھنکے تھنکے انداز سے چلتی ہوئی بستر تک آئیں اور جیسے ڈھنے ہی گئیں۔

حسن شیرازی کچھ دیر صولات جہاں کی طرف دیکھتے رہے، ان کا دل کچھ ملول سا ہونے لگا تھا اندر سے ایک آوازی ابھری۔

”لیکا مجھے صولات کی باتوں پر غور کرنا چاہیے۔ اور ایسی باتوں کے لیے سید صاحب کو تکلیف دینا بہتر ہو گا؟“

ان کے دل و دماغ میں بلکا سا شور برپا ہو چکا تھا، حسن شیرازی نے یک لخت سر کو جھکا اور خود بھی اب سونے کی تیاری کرنے لگئے دیوار گیر گھری ایک بچے کا عمل دکھار رہی تھی۔

دوسری صبح صولات جہاں خلاف معمول بہت خاموش تھیں، یہ بات سب نے نوٹ کی بیٹھے بہونے

دریافت کیا بھی تو انہوں نے طبیعت کی سنتی موسم کے بدلاو پر رکھ دی، اس بات سے کوئی بھی واقف نہ ہو سکا سوائے حسن شیرازی کے طبیعت کے اس بوجھل پن میں موسم قصور وارنہ تھا۔ انہیں معلوم تھا ساری رات صولت سُونیں تھیں، سوت وہ بھی نہیں سکے تھے، صولت جہاں کو تو انہوں نے کہہ سن دیا تھا، اُن کی پاتوں سے اختلاف کیا تھا مگر دل دماغ میں برپا ہونے والا شور صبح تک اپنی جدت قائم کر گیا تھا، انہوں نے محوس کیا تھا کہ انہیں ایک بار ضرور صولت کی باتوں پر توجہ دینی چاہیے اور اس لمحے پر ایک بار ضرور سوچ لینے میں کوئی حرج نہیں، مگر یہ بات وہ صولت جہاں سے ابھی کہندہ سکتے تھے۔
کیونکہ انہیں محسن کے ساتھ لکھنا تھا اور اس سلسلے میں دیر ہو رہی تھی وہ سوچ کر اٹھے تھے کہ رات میں وہ اپنے فیصلے سے صولت جہاں کو آگاہ کریں گے تو، وہ ضرور سکون محوس کریں گی اور طبیعت کا یہ بوجھل پن ختم ہو جائے گا۔

ناشترے کے بعد حسن شیرازی محسن کے ساتھ آفس کے لیے نکل گئے۔ صولت جہاں کرے میں آکر یہ گئیں۔ بوری رات میں ایک آدھ بار غنوگی ای طاری ہوئی تھی اُن پر، مگر وہ نیند کے حواسوں میں داخل نہ ہو سکی تھیں، ابھی بھی انہوں نے سونے کی بہت کوشش کی مگر نینداً نکلموں سے کوسوں دور تھی۔ باہر سے فائزہ اور محمن دادا کے بولنے کی متواتر آوازیں آرہی تھیں، دونوں دوپھر کے کھانے اور رات کے کھانے کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے، یہ روز کا معمول تھا۔
ناشترے کے بعد جمن دادا کا پنسل سنبھال کر کھانے کی میز پر آ جاتے اور دوپھر رات کے کھانے سے متعلقہ سبزی ترکاری، گوشت، چھلی جو جس کی پسند ہوتی، اس کی لست بناتے اور بازار کا رخ کرتے اس وقت چونکہ صولت بیگم کی ناسازی طبع کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا، چنانچہ وہ فائزہ کے ساتھ بیٹھ کر لست بناتے ہے تھے۔ جمن دادا کی پاٹ دار آواز یکبارگی فائزہ کو کسی بات پر ابھری تو صولت جہاں کے دماغ میں ایک کوئی اسالپا کا۔

”جمن دادا..... جمن، ہاں جمن مجھے اب یہی کرنا ہو گا۔“ یہ سوچ کر تھوڑا سا سکون آیا اور آنکھ لگ سی گئی۔

☆.....☆.....☆

دوپھر کے کھانے کے بعد ایک طویل نشست میں جمن دادا فائزہ بیگم کے مابین کچھ طے پایا تھا۔ پروگرام کے تحت دوسرے دن وہ جمن دادا کے ساتھ ساحل سمندر کی جانب سفر کر رہی تھیں۔ وہ راستے میں تقریباً تین سے چار بار تو پوچھ جھوپی چکلی تھیں۔

”جمن دادا تم کو پیچہ تو اچھی طرح معلوم ہی ہے نا؟“ جمن نے ہر بار اُن کی تسلی کی تھی۔

”ارے صولت بی بی، آپ ناچن پر بیشان مت ہوں، مجھے اچھی طرح معلوم ہے اور گرید، ہمیں ملے گانا ساحل سے پہلے، مگر یہ سے ہمارا ملنا جتنا ہے، ہم جانتے ہیں اس کو۔“
جمن دادا نے تسلی دی تھی۔

صلوٽ جہاں کو فکر راستے کی نہیں تھی، اصلی بات انہیں اندر ہی اندر بہت پریشان کر رہی تھی، اور وہ یہ کہ وہ زندگی میں پہلی بار عہد ٹھکنی کی مرکب ہونے جا رہی تھیں، جب سے اُن کی شادی ہوئی تھی انہوں نے اپنے

شوہر کے علم میں لائے بغیر بنا اجازت کوئی بھی کام نہیں کیا تھا اور آج وہ اتنا بڑا قدم اٹھانے جا رہی تھیں اُن کے شوہر کو اس کا علم تو کجا ایسا قصور بھی نہیں آ سکتا تھا کہ ایک دن اولاد کی محبت میں وہ ایسی عہد ٹھکنی کی مرحلے ہو سکتی ہیں مگر اب تو وہ گھر سے نکل ہی گئیں تھیں۔

کل رات جب حسن شیرازی نے اُن کی بات بری طرح رد کر دی تھی تو انہوں نے جمن دادا سے سارا احوال کہہ دیا۔ جمن دادا غیر نہیں تھے اس گھر کے جدی پشتی نہ ک خوار تھے صولت جہاں کے بڑے بھائی بنے ہوئے تھے سارا ما جرا سن کر ہوں اٹھے تھے اور جب صولت بیگم نے حسن صاحب اور اپنے درمیان الملاس سے جڑے واقع کی گفتگو بیٹائی اور جمن دادا سے کچھ کرنے کو کہا وہ فوراً تیار ہو گئے وہ کافی سوچ قسم کے انسان تھے۔ ہر طرح کے لوگوں میں امتحا بیٹھنا تھا۔ عجیب حیران کن اور عقل سے ماوراء انسانوں کے ساتھ ساتھ چلتی آس پاس بستی دوسرا دنیا وہ پر یقین رکھتے تھے جن کا عام انسانوں کو اور اک یا یوں کہہ لیں احسان نہیں ہو پاتا جب تک ان پر اسرار متوازی چلتی دنیا کے کدار خود اپنا آپ آشکار نہ کرنا چاہیں۔

جمن دادا ایک تھرل پسند طبیعت کے مالک تھے فوراً سے پیشتر صولت جہاں کو کسی عامل بابا سے ملنے اور خود لے جانے پر آمادہ ہو گئے۔ شومی قست کہ حسن شیرازی کو دو دن کے لیے نواب شاہ جانا پڑ گیا۔ جانا تو محسن کو بھی تھا مگر چونکہ ابھی وہ لوگ نئے گھر میں منتقل ہوئے تھے اور جھوٹے بچوں کا ساتھ تھا چنانچہ حسن صاحب نے محسن کو منع کر کے خود جانا پسند کیا اور پھر دوہا کیلئے تھے ان کے ساتھ محسن کا پارٹنر بھی جارہا تھا، چنانچہ وہ اطہیناں سے اپنے کاروباری سفر پر نکل گئے دو دن کی تھی انہوں نے سوچا آ کر وہ صولت جہاں سے بات کریں گے مگر اس کی نوبت آنے سے پہلے ہی صولت جہاں جمن کے ساتھ نکل پڑی تھیں اور اب سارے راستے عجیب سی متصاد کیفیات کا شکار ہو رہی تھیں۔

اس میں سے ایک خیال تو یہی ستارہ تھا کہ جمن اُن کو کسی روایتی عامل بابا سے ملوانے لے جا رہا ہے، انہیں کسی آستانے یا کسی درگاہ مزار وغیرہ پر لے جایا جائے گا۔ جہاں حاجت مندوں کا جم غیرہ ہو گا، عامل بابا کی روایتی تن و تو شیخ خصیت نہ ہوں میں گھوم جاتی، انہیں معلوم تھا کہ طرح طرح کے لوگ باقاعدہ دکانیں سجا کر بیٹھے ہوئے ہیں، جن بھوت آسیب ہوائی چیزوں کے باقاعدہ ماہر کہلاتے تھے خود کو، محبوں کو قدموں میں ڈالنے کا دعویٰ پیک جھکتے دشمن مٹی میں ملا دینے کا دعویٰ کرنے والے، راتوں رات کا پالپتھے کا دعویٰ ہو یا اسے کابر سے لے کر پرانے باٹھ کا نمبر تک میا نے کا دعویٰ کرتے ہیں اور شہر کی دیواریں اپنے نت نے اشتہار کی مفت تریل کا سبب بنتی جا رہی تھیں، کوئی روکنے ٹوکنے والا ہی نہیں تھا، باقاعدہ مانیا کام کر رہا ہو ایسا محسوس ہوتا تھا انہیں بھی بھی اور آج وہ خود اس موڑ پر آگئی تھیں کہ سید صاحب میسے خاندانی معینبرادر پچھے بزرگ ہوتے ہوئے بھی وہ ایک انجان عامل سے ملنے پر مجبور ہو گئیں تھیں۔

صلوت جہاں اپنی ہی سوچوں میں غلطان تھیں کہ جمن دادا نے بھی رکاوی، تیکسی رکتے ہی کچھ فاصلے پر بنی ایک سڑک کنارے نائز شاپ پر کھڑا ایک درمیانی قدم کاٹھ کا لڑکا لیکسی کی طرف بڑھا یا اور ہاتھ کے اشارے سے اُس نے جمن دادا کو اور صولت جہاں کو سلام کیا اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”کوہر چنان ہے گلریر؟“ جمن دادا نے پوچھا۔

گلریز نے سامنے کی طرف اشارہ کیا اور ڈرائیور کو راستہ سمجھانے لگا، دور دوچھوٹی سڑکیں گزرتی تھیں جن کے اطراف قدیم و جدید املاج سے ہم آہنگ بنگلو بنے ہوئے تھے تقریباً ایک ڈبیڑہ کلومیٹر کی ڈرائیور کے بعد، وہ سرسراتے درختوں کے درمیان میانی رنگت اور بد بہیت گیٹ والے بنگلے کے سامنے کھڑے تھے جس کی دیواروں سے جام جام سوکھی ٹیکیں یوں چھپی ہوئی تھیں جیسا کہ کوئی خون آشام بنگلے کے اندر بل کھاتی روشن کے دونوں اطراف جام جام سوکھی پیلی مدقوق گھاس، نہ منڈ رخت تقریباً اجری ہوئی پھولوں کی کیاریاں عجیب سامنظر پیش کر رہی تھیں، سو کے کے پتے ادھر ادھر یوں شور مچاتے پھر رہے تھے جیسے وہ اس اجاڑی احتجاج کر رہے ہوں۔

”اوہ یا را گلریز یہ تو کہاں لے کر آگیا مجھے؟“ ٹیکسی ڈرائیور نے انہیں اتار کر ٹیکسی ایک درخت کے نیچ آگے جا کے لگالی تھی اس بات کے قطع نظر کہ سواریاں کہاں اور کیوں آئی ہیں وہ مکن سا اپنی ٹیکسی کی جھاڑا پوچھ کرتے ہوئے کچھ گفتار ہاتھا۔

ٹیکسی جن دادا نے آنے اور واپس جانے کی طے کی تھی، انتظار کرنے کے پیے الگ سے دینے کا وعدہ تھا، ٹیکسی والا فوراً راضی ہو گیا اس ساحلی آبادی میں سواری مانا کوئی آسان نہ تھا، ویسے بھی ساحل سے دور اس طرف حال حال آبادی تھی۔ صولت جہاں پر پیشان تھیں۔

”لگتا ہے اس مکان میں کوئی نہیں رہتا..... جن واپس چلنا چاہیے، میر ہے ہم نے ٹیکسی روکے رکھی ہے۔“ وہ زیر لب بربادی میں گلریز نے کوئی جواب نہ دیا۔

”اپنے لڑکے ہم تم سے کچھ کہہ رہے ہیں؟“ جن دادا اس مرتبہ تھوڑے طیش میں آئے، گلریز مسکراتا ہوا، انہیں تسلی رکھنے کا اشارہ کرتے ہوئے سیر ہیاں چڑھنے لگا، کیونکہ اس پہ بہت سال خورده گیٹ تک پہنچنے کے لیے چار پانچ سینھڑیاں تھیں۔

گلریز نے اطلامی ٹھنٹی بیباٹی، گیٹ کے پیچھے کھٹ پٹ کی آواز آئی اور گیٹ کھل گیا۔ گلریز نے انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا، جن دادا اور صولت جہاں گلریز کے پیچھے اندر داخل ہو گئے۔

گیٹ تو کھل چکا تھا مگر کسی ذی روح کا وہاں نام و نشان نہ تھا، قطع نظر اس کے کہ بنگلے اجاڑی اور خستہ حال نظر آ رہا تھا، مگر اندر کار پورچ تازہ دھلانظر آ رہا تھا اور ایک شاندار گاڑی کھڑی تھی، گلریز اندر کھینیں کر دیں کم ہو گیا تھوڑی دیر بعد صولت جہاں اور جن دادا آ راستہ پیرا ست ڈرائیکر دم میں کھڑے تھے، باہر کی نسبت گھر کی اندر وہی حالت بہت بہتر تھی، مگر درود یوار و حشت زدہ تھے۔

کمرے کے وسط میں رکھی کری پر ایک ادھیڑ عمر کا ٹھنٹے قد کا کالا بھنگ شخص بیٹھا ہوا تھا، جس کے کانڈوں پر پڑے ہوئے لمبے لمبے ہوئے بالوں آنکھوں میں زردی نے اس کے پھرے کو انہائی خوفناک بنارکھا تھا، ایسا کہ بندہ دیکھے تو لرز کر ہی رہ جائے۔

صلوت جہاں کو اسے دکھ کر اختلاف قلب سا ہونے لگا مگر اب کیا ہو سکتا تھا، تھوڑی دیر میں ہی وہ سارا ماجرہ اببا کے گوش گزار کر چکی تھیں۔

”میں آپ کا گھر دیکھنا چاہتا ہوں اور بچی بھی۔“ اس کا لے بھنگ دیونے بڑی ہی اضطرابی کیفیت میں کھا تھا۔ اس کا اس نہیں چل رہا تھا وہ ابھی اٹھ کر صولت جہاں کے ساتھ چل پڑتا۔

”ارے نہیں میں بچی یہاں نہیں لاسکتی۔“ صولت جہاں بہت پریشان تھیں، اس کی بات سن نہ سکیں شاید۔

”بی بی پھر آنے کا بول رہے ہیں۔“ جمن دادا نے بابا کی بات دھرائی۔
”اوہ گمراہ کیسے؟“

”ایک منٹ.....“ کہہ کر عامل بابا گھرے استغراق میں مشغول ہو گیا، سیاہ مانتھے پر سوچ و فکر کی گہری لکیریں تھیں..... کچھ دیر گزری، صولت جہاں کی طبیعت اب اکتا نے کی تھی۔ ایک تو انہیں یہاں آ کر پہنچتا داہوا تھا اور پھر دھشت کے علاوہ نہ جانے کن کن کیفیات نے گھیر لیا تھا، اگر حسن صاحب ساتھ دیتے تو یوں کی کالے دیوے کے سامنے انہیں اپنے حالات کھولنے نہ پڑتے۔

حسن صاحب کا خیال آتے ہی ایک دکھ افسوس اور غصے کی لہر آن کے اندر اٹھی۔ کیا وہ اور ان کی بات اتنی ارزش تھی کہ حسن صاحب یقین کرنے سے قاصر تو تھے، ہی اس پر ایک بار غور بھی نہیں کر سکتے تھے؟ ہزاروں سوالات ان کے اندر پھر سے شور مچانے لگے، ٹھیک ہے میں بھی اب یہ معذ خود ہی اپنے طور پر انہیں حل کر کے دھکائے دیتی ہوں، صولت جہاں نے از خود خود کو تکلی دی۔

”یاد رہے گی نامیری بات، جمن دادا؟“ اندر کے شور سے گھبرا کے انہوں نے جمن سے سرگوشی کی۔
”حسن صاحب اور حسن کو اس کی بھنک نہیں پڑنی چاہیے۔“

”محض یاد ہے بی بی! امیں بھلا بھول سکتا ہوں کہ یہ بات کس قدر اہم اور کتنا تازک معاملہ ہے۔“

”اوہ ہو..... لس ویسے ہی، ہم تمہیں دوبارہ یاد دو دارے تھے۔ تم تو منہ ہی بنا لیتے ہو فوراً۔“

”ہمارا کام جلدی ہتی ہو جائے گا دیکھ لجیجے گا..... وہ اسلام بیزی فروش جس نے بابا کا بتایا ہے اس کے تو گھر کو میں نے خود دیکھا، سارے بچوں پر ہوائی چیز یکے بعد دیگرے مسلط ہو گئی تھی، بڑا براحال تھا بیجا رے کا..... آس پاس پڑوں سب گواہ ہیں کہ ان ہی عالی بابا نے علاج کیا، آج سب ٹھیک ہے، وہیں مارکیٹ کے ساتھ ہی تو اس کا کوارٹر ہے آپ مطمئن رہیں۔ ہم درست جگہ آئے ہیں۔“

جمن نے پھر سے صولت جہاں کو ساری کہانی دھرائی، اسی لمحے اس بابا نے نظریں اٹھائیں صولت جہاں لرز کر رہ تھیں انہیں اس عامل بابا کی آنکھوں سے آگ کے شعلے لکھتے ہوئے تھے۔

”آپ مجھے اپنے گھر کا اپنیریں دیں، مل میں آپ کے گھر آتا ہوں۔“
”گھر.....“ صولت جہاں، گھر بڑا ہی گئیں۔

”آپ کوئی فکر مت نہیں۔“ وہ کھٹی کھٹی آواز میں بولا۔

”میں سب سنجھاں لوں گا، آپ کے شوہر بیٹا بہو کوئی آپ سے سوال نہیں کر سکتے گا۔“
صلوت جہاں سوچ میں پڑ گئیں، عامل بابا کی شاطر ان نظریں صولت جہاں پر گئی ہوئی تھیں۔ عامل بابا کے نام سے مشہور یہ ایک سفلی گرتقا کا علم کا ماہر، کالمی دیوی کا بچاری کھلا تھا خود کو..... نام چن داں تھا عامل بابا کے نام سے مشہور تھا۔

چن داں جادو لوئے ٹوٹکے کا بہر تھا، کوئی بھی مخفی کام ہو جیسا کہ کالے علم کے ماہر کرتے ہیں اُس سے کرایا جاسکتا تھا۔ صولت جہاں کی بد قسمتی تھی جو وہ کسی جعلی عامل کے تھے نہ پڑھیں جیسا کہ جگد جگد فراڈ

ہوتا ہے عامل کامل کے نام سے، کاش کر وہ کسی جعلی فراڈ یے سے مل لیتیں، قسم دو رکھڑی کف افسوس مل رہی تھی، وہ حقیقت میں چون داس کالی کے داس کے سامنے بیٹھی تھیں، اُس کا جادو سرچ ڈھکر بولتا تھا، بے بڑے لوگ اس کے حلے میں شامل یا با کے حلے میں صولات جہاں جیسی بیگانات کثیر تعداد میں شامل تھیں، جو کام کے عوض بھاری رقم ادا کرتیں تھیں۔ جب میں دادا کو ساری معلومات حاصل ہو چکی تھیں، انہی کے کہنے پر صولات جہاں بھی ایک موٹی رقم اپنے پرس میں رکھ کر لائی تھیں۔

”میں کل آپ کے گھر آ رہا ہوں۔“ عامل بابا کی نظر میں اُن کی پیشانی پر گڑھی ہوئی تھیں۔

”میری ساری امیدوں اور تمناؤں کا مرکز و محور ہے میری اہل..... میرے منزہ میں خاک اگرا سے کچھ ہو گیا تو۔“ اُن کا الجھد کھے بھر گیا، پھر دل کے تمام آبلے پھوٹ پڑے اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، بس بہاں سے اس جادو گر کا راستہ صاف ہو گیا۔ صولات جہاں نے گھر کا ایڈریس دے دیا۔

یہ ایک بہت بڑا قدم تھا یہ، بہت بڑا خطہ، بھی بن سکتا تھا، انہیں رہ رکشوہر کا خیال ستارہ تھا، گر جب وہ وہاں سے اٹھیں تو بس ایک خیال تھا کہ الہام کی سلامتی کی خاطر چون داس کو گھر بلا بینا چاہیے۔ باقی تمام خیالات تو چون داس نے سلب کر لیے تھے۔

لیکن اُن کا باہر انتظار کر رہی تھی راستہ خاموشی سے کٹا، گھر پہنچنے ہوئے خاصاً وقت ہو چلا تھا، وہ فائزہ کو مطمئن کر کے کٹیں تھیں کہ جس کی خالہ کی مزاج پر سی کے لیے جارہی ہیں، مگر گھر میں داخل ہوئیں تو فائزہ لا ورنچ میں ہی مل گئیں پریشانی تھیں۔

”اماں کافی دیر ہوئی آپ کو میں پریشان ہو رہی تھی۔ اب اجان کا بھی فون آیا تھا، آپ کا پوچھر رہے تھے، بس اب پہنچنے ہی والے ہوں گے۔“ فائزہ نے صولات جہاں کو پانی کا گلاں کپڑاتے ہوئے ساری رو داد سنائی۔

”اور وہ کیسی ہیں اب جس دادا کی خالہ.....“ فائزہ نے بیمار کا حال جانا چاہا۔ مگر صولات جہاں بہانہ کر کے لا ورنچ سے اٹھ آئیں، وہ فائزہ سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھیں، جس دادا کتنی میں تھے فائزہ بھی میں چلی گئی۔

صولات جہاں کرے میں آ کر لیت گئیں۔ ابھی وہ لہنی ہی تھیں کہ ایک جھکٹے سے دوبارہ اٹھ بیٹھیں، بلکہ انہی نہیں اُن کو اٹھایا گیا تھا۔ وہ ایک تیز ریل اتھا خوشبو کا، جس نے اُن کو لینے لیتے اپنی لپیٹ میں ایسا لیا، جیسا کہ اُن کو سی نے دھکا دے کر اٹھا کر بٹھایا ہو۔ انہیں لگا وہ خوشبو کے ایک سمندر میں غوطہ زدن ہیں گویا خوشبو مانوس تو تھی مگر آج اس میں انتہائی تیزی تھی۔ اتنی تیزی کہ اُن کو دم گھٹھنے کا احساس ہوا وہ خوشبو کا جھوٹکا پوری قوت سے اپنا اظہار کر کے کرے سے باہر نکل چکا تھا، اس کے باہر نکلتے ہی اُن کا سالس سینے میں بھاول ہوا تو کھانی کا ایک دورہ سا اٹھ گیا، صولات جہاں کے کھانے کی آوازوں سے جس دادا اور فائزہ دونوں ہی دوڑے چلے آئے۔

”کیا ہوابی بی.....“

”ارے کیا ہوا؟“ فائزہ نے پانی کا گلاں صولات جہاں کے منہ سے لگا دیا، اور ایک ہاتھ سے اُن کی پیٹھ سہلانے لگی، کھانے کھانے صولات کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ پانی کے گھونٹ گلے سے

نیچے اترے تو کھانی تھی، وہ گھرے گھرے سانس لئے لگیں۔

”جن فائزہ تمہیں میرے کمرے میں تیز خوبیوں ہو رہی ہے کیا؟ یا باہر جاؤ جن دادا، دیکھو پورے گھر میں۔“ وہ بے ربط سے جملے بول رہی تھیں۔

جن دادا سارا گھر حجان کریا یوں کہہ لیں سونگھ کر آگے گھر کہیں کسی بھی قسم کی خوبیوں کا شاہرہ تک نہیں ملا..... فائزہ نے بھی ہر جگہ گھوم کر گھرے گھرے سانس لے کر دیکھا گمراہی کوئی مہک محسوس نہ ہوئی جس کی وجہ سے بقول صولات جہاں ان کی بہ حالت ہوئی تھی۔
صولات جہاں کی حالت سمجھل چلی تھی۔

”امتاس..... امتاس کہاں ہے؟ جاؤ اس کے پاس ملے گی شاید خوبی۔“ وہ عجیب سے لبھے میں بولیں۔

”اماں؟“ فائزہ نے اُن کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہ انہیں صولات جہاں کی دماغی حالت پر شبہ ہو رہا ہے صولات جہاں کو ہوش سا آیا، وہ تیزی سے دوڑتی خود امتاس کے پاس پہنچیں، امتاس سکون سے سورتی تھی، اور انگریز اس کے پاس بیٹھا کھیل رہا تھا..... صولات جہاں نے لپک کر سوتی ہوئی امتاس کو اٹھالیا، اور سوچنے لگیں امتاس نے کمسا کر آئیں ٹھوول دیں، دادا کو بیچاں کر ہاتھ پر مارنے لگی، خوبیوں یہاں تکیں تھیں، فائزہ یہ سب تماشہ دیکھ رہی تھی۔

”اماں کیا ہو گیا ہے آپ کو لگتا ہے وہی ہو رہی ہیں آج آپ، بہت دیر امتاس سے دوڑ رہی ہیں نا..... اس نے بھی آپ کو بہت مس کیا ہے، یہی تو بتانا چاہ رہی تھی میں، بہت ستایا ہے آپ کی پوتی نے آج مجھ کو۔“

امتاس ایسے قلقاریاں مارنے لگی جیسے اسے سب بچھا آ رہا ہو، صولات جہاں نے امتاس کو پیار کیا اور فائزہ کو دے کر اپنے کمرے میں چلی گئیں، فائزہ نے تو صولات جہاں کی اس بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا، امتاس کو بھوک لگی تھی اور انگریز زیب بھی اس وقت کچھ کھاتا تھا چنانچہ وہ دونوں کو لیے چکن میں چلی گئی، جن دادا نے دونوں بچوں کے لیے کمانے کا انظام کر دیا تھا۔ انگریز زیب کے پسندیدہ سینڈھ چڑ اور امتاس کا نیڈر روتوں تیار تھے..... اور فائزہ واپس کمرے میں جا کر بچوں کو کھلانے پلانے میں لگ گئی۔
اور فائزہ بچوں کے کمرے میں گئی، اُنہر صولات جہاں اور جن دادا اس تازہ و اعتمد پر سر جوڑ کر بیٹھے گئے۔

”جہیں تو میرا لقین ہے نا۔“ صولات جہاں نے انتہائی پریشانی سے جن سے پوچھا۔
”کیسی باتیں کر رہی ہوئی بی۔ لقین ہے کیوں نہیں ہے نہیں، ہوتا تو میں آج آپ کے ساتھ جاتا۔“
جن کا اشارہ عامل بابا کی طرف تھا۔ ابھی وہ اور باتیں کر رہی رہے تھے کہ اطلاقی تھنی کی آواز آئی جن نے صدر دروازہ کھولا تھا۔

حن شیرازی اور جن آپکے تھے دونوں باتیں کرتے آگے پچھے گھر میں داخل ہوئے، اس کے بعد کھانا بچوں کے ساتھ کھیلتا، دو روز کے بعد انگریز زیب نے دادا کو دیکھا تھا وہ اُن کو چھوڑ رہی نہیں رہا تھا، ان سب میں بارہ نئے گئے معلوم ہی نہیں ہوا، سب بہت تھنکے ہوئے تھے۔ نشت برخاست ہوئی اور سب اپنے اپنے

کمروں میں سونے چلے گئے، حسن شیرازی نے صولت جہاں سے بس اتنا کہا کہ کل وہ گھر پر ہی ہیں اور صولت جہاں کو کہیں لے کر جائیں گے۔

صولت جہاں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”چلیں گے.....“ مختصر کہا اور سونے کے لیے لیٹ گئیں۔

رات سکون سے کئی تھی، صحیح اذانوں کے ساتھ آنکھیں کھلی، وہی صحیح کے معمولات شروع ہو گئے ابھی سب ناشستے کی میز پر صحیح ہی ہوئے تھے کہ صدر دروازے کی اطلاعی گھنٹی نے سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔

فائزہ کچن سے نکل رہی تھی، گھنٹی کی آواز سن کر دروازہ ہکولنے جانے لگی، جمن دادا نے انہیں روک کر صحیح میں قدم رکھ دیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے دروازے تک پہنچے ہب معمول اونچا نچا بڑا بڑا بھی رہے تھے، اتنی صحیح کی کام آنا تاگوارنگز رہا تھا انہیں۔

دروازہ ہکولتا تو سامنے عامل بابا، کوکھڑے پایا ساکت سے ہو گئے۔

”پہچانا نہیں دادا؟“ عامل بابا نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

”اتنی سویرے؟“ جمن دادا اپٹھا گئے۔

”نیک کام میں دیر کیسی ہٹوپرے۔“ عامل بابا اندر گھستا ٹھلا آیا۔

”کون آیا ہے جمن؟“ حسن شیرازی اتنی دیر میں خود سلطان ہن ٹک آگئے تھے۔

”یہ ہیں حسن میاں، انہیں نوکری کی از حد تلاش ہے بے چارے بہت پریشان ہیں۔ مجھے ملے تھے ملتے رہتے ہیں مارکیٹ میں، آپ سے ذکر کرنا تھا، آپ چلے گئے۔ بی بی سے ذکر کیا تھا تو انہوں نے کہا بلالوں، آپ کچھ کر دیں حسن میاں ان کا۔“ جمن دادا نے بہت مہارت سے بات بنانی تھی۔ اتنا وقت بہت تھا، جمن داس یونے پورے گھر کا جائزہ صحیح میں کھڑے کھرے لے ڈالا اُس کی نظریں اب املاس کے درخت پر گئی ہوئی گھیں۔

”اچھا..... اچھا..... آئیے بیٹھیں۔“ حسن شیرازی نے اس کے دل کی بات پوری کر دی۔

چون داس اب اُن کے ساتھ املاس کے پیچے بچھے تخت پر بیٹھا تھا۔ اندر سے املاس کے اچاک بے تماشہ رونے کی آوازیں آرہی گھیں۔ فائزہ اُسے لے کر لاوائیں آگئی، صولت جہاں نے املاس کو لے کر اپنے سینے سے لگایا۔ اور بہانے سے انھوں کھن میں آگئیں۔ جیسے ہی وہ رگرام کے مطابق املاس کو چون داس کے سامنے لا کیں۔ موسم برہم سا ہو گیا، سرد ہوا میں تو چل، ہی رہی گھیں جھکڑ چلنے لگے۔ گرد آلود ہواوں نے آسان کو ڈھانپ لایا..... ریت گھنی کہ آنکھوں میں گھنی چلی جارہی تھی املاس کا درخت خطرناک انداز میں جھوم رہا تھا جیسے گھن میں آن گرے گا، موسم کے اتنے کڑے تیور وہ بھی آنا فانا..... چون داس کی آنکھوں میں اس قدر ریت بھر گئی تھی کروتی طور پر اُس نے یہاں سے بھاگنے میں ہی عافیت جانی..... ایسے میں اسے کون روکتا، پھر آنے کا وعدہ کر کے ٹھلے دروازے سے باہر نکل گیا، اس کے گھنی کے آخری سرے سے نکلتے ہی موسم اعتدال پر آ گیا تھا۔

اس نہایت ہی مفترضہ پس پر اسرارناول کی پانچیں قحط کے لیے آئندہ ماہ انتظار کیجیے

اٹھائیسوں دو شیزہ رائٹرز ایوارڈ

وہ تقریب جس کا انتظار کیا جاتا ہے۔

وہ تقریب جس میں ملک بھر سے قلم کاروں کا کارواں، اپنے محبت کرنے والوں کے رو برو ہوتا ہے۔

قلم کاروں کے قلم کا حق ادا کرنے کی ایک ادنی سی کوشش۔

بہت جلد.....

اٹھائیسوں دو شیزہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب اپنے روایتی رنگ میں جلوہ گر ہوگی۔

”یہ تھوڑا سا لذتیار ہے۔“

یہ ہے آپ کی پسند، آپ کا انتخاب

مرتب: اشعر جواد

آپ نے فرمایا۔

”ابو بکر! جب تک تم چپ تھے خدا کا فرشتہ
ہماری طرف سے جواب دے رہا تھا۔ جب تم بول
پڑے تو فرشتہ وہاں سے چلا گیا۔“ اس طرح رسول
اللہ نے بتایا کہ برائی کے جواب میں جب آدمی اپنی
طرف سے کوئی جوابی کارروائی نہیں کرتا تو وہاں خدا
اس کی طرف سے موجود ہوتا ہے مگر جب آدمی خود
بدلہ لینے پر اترائے تو خدا اس کے معاملے کو اس کے
حوالے کر دیتا ہے۔

مولانا حیدر الدین کی تصنیف **بتغیر انقلاب** سے اقتباس
انتخاب۔ شاملہ نویں۔ کراچی

تہآزاد

میرے چاروں طرف آواز کا شور ہے۔ ہر
آواز کے کردار ساتھوں کا ایک ملے ہے۔ ایسے میں
میری تہآزاد از پکھو دیر کو حیران آنکھوں کی طرح ہر
طرف بھکتی ہے اور پھر فضا میں تخلیل ہو کر رہ جاتی
ہے۔ میرے سفر کی کوئی مست زندگی نہ کوئی منزل میرے ہم
سفروں کا کوئی خیہہ نہ زد سفر، آخر کب تک کوئی ایک
دوسرے کا ساتھ دے سکے گا؟ میں کسی محرومی کا
مامتم کروں؟! بھی تو مجھے وسعت صحرائیں رقص کرتے
گپتوں کی طرح نجاتے کب تک اپنی دھن میں مگن
رہنا ہے؟ شعر کہنے کی دھن، رخص کھانے اور مکرانے
کی دھن، ہر لمحہ مرنے اور ضبط کرنے کی دھن، اپنے
آپ کو لوں و فلم کی میزان میں تو نے کی دھن اور سب

امیر اور فقیر

حضرت ابراہیم بن ادھم ہر قسم کے دیناوی لائق
سے بے نیاز تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے نذرانے کے
طور پر آپ کو ایک ہزار درہم پیش کیے گرا آپ نے یہ
کہہ کر اس پیکش کو محکرا دیا کہ میں فقیروں سے کچھ
نہیں لیتا۔ درہم دینے والے نے عرض کیا کہ میں تو
بہت امیر ہوں۔ اس پر حضرت ابراہیم بن ادھم نے
اس سے دریافت کیا۔

”کیا تجھے مزید دولت کی آرزو نہیں ہے؟“
جس پر درہم دینے والے نے اثبات میں سر ہلایا۔
آپ نے اس شخص سے کہا۔

”تو پھر یہ قم لے جاؤ کیونکہ تو فقیروں کا سردار ہے۔“
حضرت فرید الدین عطار کی تصنیف **نذر کرہ اولیاء** سے اقتباس
انتخاب: آصف زیدی۔ کراچی

اخلاقیات

ایک بار حضرت ابو بکر رسول اللہ کے پاس بیٹھے
ہوئے تھے کہ ایک شخص نے آ کر آپ گوبرا بھلا کہا۔
حضرت ابو بکر پہلی بار سن کر چپ رہے۔ اس نے
دوسری بار گوبرا بھلا کہا تو اس وقت بھی آپ چپ
رہے، مگر جب تیسرا بار بذباحتی کی تو آپ ٹھاموٹ
نہ رہ سکے اور جواب میں بول اٹھے۔ یہ دیکھ کر رسول
اللہ کو راؤہاں سے اٹھ گئے۔ حضرت ابو بکر نے پوچھا۔
”اے خدا کے رسول! آپ کیوں اٹھ گئے؟“

تھی ہی ایک نیکی۔ میں نے سوچا کہ میرا تو کچھ بنے گا
نہیں۔ یہ تیرا بندہ کیوں نہ جنت میں چلا جائے۔
حدیث میں ہے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تو نے دوسرے
کا خیال کیا، جاؤ تم دونوں کو جنت میں بھیجا ہوں۔“
سید عبدالجید ندیم شاہ کی تصنیف ”جو اہرات ندیم“ سے اقتباس
حسن انتخاب: مور شاہد حسین۔

چھوٹا کام

رزق کا بندوبست کسی نہ کسی طور پر اللہ تعالیٰ ہی
کرتا ہے لیکن میری پسند کے رزق کا بندوبست نہیں
کرتا۔ میں چاہتا ہوں کہ میری پسند کے رزق کا
انتظام ہونا چاہیے۔ ہم اللہ کے لاد لے تو ہیں لیکن
اسنے بھی نہیں جتنے ہم خود کو سمجھتے ہیں۔ ہمارے بابا جی
کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی آدمی آپ سے سردیوں
میں رضاۓ مالکے تو اس کے لیے رضاۓ کا بندوبست
ضرور کریں کیونکہ اسے ضرورت ہو گی لیکن اگر وہ یہ
شرط عائد کرے کہ مجھے فلاں قسم کی رضاۓ دو تو پھر
اس کو گھر سے باہر نکال دو کیونکہ اس طرح اس کی
ضرورت مختلف طرح کی ہو جائے گی۔ ایک مرتبہ
جب ہم بابا جی کے پاس ڈیرے پر گئے تو انہوں نے
ہمیں مژہ حصیلے رکا گایا۔ میں نے قمری پیش سوت
پہن کر ناٹی لگا کر کمی تھی لیکن مژہ حصیلہ رہا تھا حالانکہ میں
نے ساری زندگی بھی مژہ نہیں حصیلے تھے پھر انہوں
نے ہم حصیلے رکا دیا اور میرے ہاتھوں سے بوآنا
شردوع ہوتی پھر حکم ہوا کہ میتھی کے پتے اور ڈھنل
اگل اگل کرو۔ اس مشقت سے قاب خاتمی بھی
گھبرا تی ہیں۔ ہماری ایک بیٹی ہے زو نیرا اس کو کوئی
چھوٹا سا کام کہہ دیں کہ بھی یہ خط پہنچا دیتا تو کہتی ہے
بابا! یہ معمولی سا کام ہے۔ مجھے کوئی بڑا سا کام دیں
اتباڑا کرے میں آپ کو وہ گر کے دکھاؤں (کوئی مشل
میں جانے جسیا کام شاید) میں نے کہا کہ یہ خط تو
پہنچا دیتی، کہنے لگی یہ تو بابا جی بس پڑا، رہ گیا میرے

سے بڑھ کر اپنی تہائی کا کرب، اپنی آنکھوں میں
گولے کی دھن۔

حسن نقوی کی تصنیف ”عذاب دید“ سے اقتباس
انتخاب، اشعر جاد۔ کراپی

انتخاب

الله ارحم الراحمن ہیں

رسول پاکؐ کی ایک حدیث ہے کہ حشر میں ایک
ایسا آدمی اللہ کی عدالت میں آئے گا کہ جس کے
اعمال میں صرف ایک عمل کی کمی ہو گی تو حق تعالیٰ
فرما نیں گے جاؤ اپنے عزیز رشتہ داروں بھائی
بآپ سے ایک نیکی ماحفظ کر لاؤ۔ اگر ایک نیکی مل
جائے تو تم جنت میں جا سکتے ہو۔ وہ برادری کے
پاس جائے گا، دوستوں کے پاس جائے گا، والدین
کے پاس جائے گا لیکن وہاں تو نفسانی کی پکار ہو
گی۔ گوئی اس کی نہیں سنے گا۔ نیکی نہیں ملے گی۔ وہ
بے چارہ مالیوں ہو کر جب واپس لوٹے گا تو ایک
آدمی بیٹھا ہو گا وہ اسے دیکھے گا کہ وہ بڑا پریشان بڑا
معطر بڑا رہا ہے، تو وہ پوچھے گا کیا ہوا میاں یہ کہے گا
کہ ایک نیکی کم تھی اگر وہ مل جاتی تو جنت میں چلا جاتا
لیکن ٹھکی نے بھی نہیں دی۔ نہ بھائیوں نے نہ
دوستوں نے یہاں تک کہ ماں باپ نے بھی آج
نہیں پوچھا۔ تو وہ آدمی کہے گا کہ میرے پاس ایک
نیکی ہے اسے ٹوٹے جا، ایک اکلوتی نیکی سے میرا
کیا ہے گا؟ وہ بڑا خوش ہو گا۔ اس سے ایک نیکی لے
کر وہ رب کے پاس حاضر ہو کر کہا کہ مجھے نیکی مل
گئی۔ مجھے جنت عطا کیجئے حق تعالیٰ فرمائیں گے یہ
نیکی تھی کس نے دی؟ اس آدمی کو بلا یا جائے گا۔ جس
نے نیکی دی تو رب العالمین فرمائیں گے۔ آج تو
ماں بیٹوں کو نہیں پوچھتی، باپ اولاد کو نہیں پوچھتا،
بھائی بھائیوں کو بھول پھکے ہیں۔ نیکی تو نے کیسے دے
دی؟ تو وہ کہے گا۔ اے رب العالمین! میرے پاس تو

ہوتی ہے۔

☆ بچے کے لیے سب سے اچھی جگہ ماں کا دل ہی ہے خواہ بچے کی عمر تھی ہی کیوں نہ ہو۔
☆ بزرد اپنی موت سے قل کئی بار مرتے ہیں لیکن جرأت مندوں ایک ہی مرتبہ مرتے ہیں۔

☆ صین صورت، یک سیرت کے بغیر ایک ہے جیسے خوبیوں سے تھی دامان گلب، عقل منداشان، بھی پیٹھ کر اپنی تکلیف کارونا نہیں روتا بلکہ اپنی تکلیف کے مدارک میں بخوبی مصروف عمل ہوتا ہے۔
☆ خوشاد کرنے والا اور سن کر خاموش رہنے والا دونوں کیمینے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کو دھوکا دیتے ہیں۔

☆ عورتیں ایسی کاتاں ہیں ایسی تصویریں اور ایسی دبتان ہیں جو تمام دنیا کی پروپوش اور تربیت کرتی ہیں۔
☆ بچی محبت کے راستے میں نشیب و فراز بھی ہوتے ہیں۔

☆ وہ لوگ بخواہی جگہوں پر کھڑے ہوتے ہیں، انہیں گرانے کے لیے بہت ہی تند و تیز ہوا میں آتی ہیں۔ اگر وہ گر پڑیں تو ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔
☆ دنیا آنکھوں سے نہیں دیکھتی، دل سے دیکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ محبت کا دیوانہ اندر ہاتا یا گیا ہے۔ داشت منصرف وہی ہیں جو محبت میں اندر ہنڑے ہوں۔

☆ قطرہ قطرہ بھی مسلسل گراتے ہوئے رہو تو چنان آپ کے عزم سے چکنا چور ہو جائے گی۔

☆ جب حسن بولتا ہے تو بڑے بڑے عالم اور داش ور گو ٹگے ہو جاتے ہیں۔

مرسل: کنوں عمران خان، کراچی۔

خیال جدائی

☆ شب بخیر، شب بخیر، جدا ہوتا میلھا عم ہے کہ جب تک صبح نہیں ہوتی، میں تمہیں شب بخیر کہتا رہوں گا۔ (ولیم شیکسپیر)

پاس۔ چھوٹے چھوٹے کاموں سے باب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس سے ہماری زندگی میں ڈپٹن آئے۔ اشفاق احمد کی تصنیف "زوایہ" سے اقتباس
قرۃ العین زنب، ملتان۔

انسوی حُنْفَ افْنَه

باتیں اشفاق احمد کی

☆ منزل قریب آنے پر مسافر ایک دوسرے سے اور سارا بان سے دور ہونے لگتے ہیں۔ منزل بھی کیا محبوب ہے کہ جب قریب آجائی ہے تو محبت کرنے والے ایک دوسرے کے رقبہ بن جاتے ہیں۔

☆ جب زندہ آدمی کا اندر مر جاتا ہے تو وہ بڑا خوش اخلاق اور شاستہ ہو جاتا ہے اور شیع زندگی کے پروانے اس سے نور حاصل کرنے کے لیے دور دور سے اڑ کر آنے لگتے ہیں۔

☆ راستہ جب پھریلا ہو سورج کی تمازت تیز ہو، پر قدم پر چڑھائی ہو تو مسافت مشکل سے طے ہوئی۔

☆ بھجوتے میں زبردستی کا غصر ہوتا ہے مان لئنے کی کیفیت نہیں ہوتی، سب کچھ جانتے ہوئے تجھونا کرنا بڑا تاب ناک ہے گرمائے کے لیے جاننا ضروری نہیں ہوتا۔

مرسل: شریجیل القدس، جیکب آباد۔

اقوال ولیم شیکسپیر

☆ دوستی بہم رہنے سبب اور کھانے پینے کا نام نہیں بلکہ یہ دو دلوں کے باہمی ربط کا نام ہے۔

☆ انسانیت کا زیور نیک نامی ہے۔

☆ میں اپنی زندگی سے زیادہ اپنے مالک سے محبت کرتا ہوں۔

☆ زندگی ہر شخص کو عزت نہیں ہے، لیکن بہادر انسانوں کے لیے عزت زندگی سے بھی عزیز نہیں۔

ساعتوں سے بھاری ہوتا ہے۔
 ☆ تسلیم کی ہوئی غربت، مانگی ہوئی دولت سے
 بہتر ہے۔
 ☆ حاصل کے بعد جذبوں کی قدر میں محمد
 کیوں ہو جاتی ہیں؟
 ☆ اندھی خواہشیں خواب سراب سے بڑھ کر
 ”میرا ہے۔“ ہونے کا پتا دیتی ہیں۔
 مرسلہ: سدرہ اور علی، جنگ۔

فرا مسکرا ایتے

نشانہ

ایک گاؤں میں ایک تھیز کپنی آئی۔ اُس کے
 ایک فنکار نے وقتفے کے دوران تھیز کپنے کا کرتب
 دکھانا شروع کیا۔ اُس نے اپنی سماںی فنکاروں کے
 چاروں طرف آہستہ آہستہ اس مہارت سے تھیز
 کپنے کے وہ چکتے ہوئے تھنگروں کے درمیان صحیح
 سلامت رہی جبکہ بھی تو تھیز اس کے صرف بال
 برابر دورہ جاتا۔ تمام حاضرین دم سادھے اس
 مظاہر کو دیکھتے رہے کہ ہال کے عقبی حصے سے
 غصے میں بھری ایک آواز ابھری۔ ”بل، چلو یہاں
 سے چل پڑو۔ اس بے ڈوف نے اپنا نشانہ پھر
 ضائع کر دیا۔“
 مرسلہ: فہیم صدیقی، کراچی۔

محوری

”میرے ای ابومیرے لیے ایک چھوٹی سی بہن
 لائے ہیں۔“ بچ نے اپنی بیچھوڑ کو بتایا۔
 ”کیا وہ آپ کو اچھی لگتی ہے؟“ بچ نے
 پوچھا۔
 ”ہاں، اچھی تو لگتی ہے، لیکن وہ لڑکا ہوتی تو زیادہ
 مزہ آتا۔“ بچ بولا۔
 ”تو آپ اپنے ای ابوسے کیسے کہا سے بدلتے
 رہے؟“

☆ محبت میں چند گھنٹے مہینوں کے برابر اور چند
 دن برسوں کے برابر لگتے ہیں اور ایک لمحے کی جدائی
 ایک عمر کی جدائی محسوس ہوتی ہے۔ (جان ذرا ای ڈن)
 ☆ موت کی طرح جدائی بھی محبوب کی یاد کو
 دھنڈا دیتی ہے اور یہ میں محسوس بھی نہیں ہوتا کہ وقت
 نے نیچے میں کیسی کیسی دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔
 (ایبور گولڈا سمیٹھ)

☆ جدائی دل کی پیاس بڑھا دیتی ہے۔ (بیلی)
 ☆ جدائی بعض اوقات دوستی میں رس گھول دیتی
 ہے اور اسے زیادہ میٹھا بنا دیتی ہے۔ (بیہو ولی)
 ☆ جانے والا ان لوگوں سے زیادہ خوش نصیب
 ہوتا ہے جنہیں وہ چھوڑ جاتا ہے۔ (ایم ورڈ ڈیولاک)
 ☆ ہر جدائی موت سے مشاہدہ ہے۔ (جارج
 الیٹ)
 مرسلہ: ٹانیپی بھٹی سیا لکوٹ۔

امول موتی

☆ وقت صائم تو ہے ہی، لیکن یہ نصیب کی
 پر چھایاں اپنے دامن کیوں بھگوتی ہیں؟
 ☆ تم تو دامن وقت کے سامنے تلاش کرتے ہو
 کبھی وقت کا دامن خود کو بھلا پائے گا؟
 ☆ شکستہ آزو دوں کی پاریاں لیے میں اُسی
 بھی ایک سال بعد نصیب ہوا۔

☆ وقت مرہم تو ہے ہی، دوائی لگنے کے بعد خشم
 آہستہ آہستہ کیوں بھرتا ہے؟
 ☆ اور وہ کی خوشیوں میں خالی ہونے والے
 دامن دولت سے نہیں۔ رَبِّ کریم عز وجل کی
 رحمت سے بھرا کرتے ہیں۔
 ☆ وقت کے امول رکوں کی بیچان وہی کرتے
 ہیں جو امول کو بے مول بنادیتے ہیں۔
 ☆ محبت کے نام پر ملا ہوا کا جھونکا تمام تر

☆☆

چراغ بے نظر ہے ستارہ بے زبان ہے
اچھو تھے سے مٹا جانا توی دوسرا کہاں ہے
وہی شخص جس پر اپنے دل و جان شارکروں
وہ اگر خفا نہیں ہے تو ضرور بدگماں ہے
بھی یا کے تھو کو کھونا، بھی کھو کے تھو کو پانہ
یہ جنم چشم کا رشتہ ترے میرے درمیاں ہے
مرے ساتھ چلنے والے تھے کیا ملا سفر میں
وہی دکھ بھری زمیں ہے وہی غم کا آسمان ہے
میں اسی گماں میں برسوں برا مطمئن رہا ہوں
ترا جنم بے تغیرِ میرا پیار جاؤالا ہے
انہی راستوں نے جن پر بھی تم تھے ساتھ میرے
مجھے روک روک پوچھا ترا ہم سفر کہاں ہے
(شیربر)

حسن انتخاب: قرة العین نہب ملان۔

☆☆

جو بھی مشکل کام تھا، کرنا اچھا لگا
اس ندی کے پار اتنا اچھا لگا
لفظوں میں تصویر بنا کر چاہت کی
اس میں رنگ معاف بھرنا اچھا لگا
ہم نے دیکھا اس کو ایک بلندی پر
اور وہاں پر اس کا ذرنا اچھا لگا
وہ خوشبو کی صورت آ کر پھیلا تو
ہمیں بھی اپنا اور بکھرنا اچھا لگا
جس رستے سے مجھ کو گرتنا اچھا لگا
اس رستے سے مجھ کو گرتنا اچھا لگا
جس منظر پر دھیان کیا، وہ ذوب گیا
مھری خشک آنکھوں سے بھرنا اچھا لگا
سد بگاڑ کی صورت اس نے پیدا کیا
جس کو بننا اور سورتا اچھا لگا
(سعد اللہ شاہ)

حسن انتخاب: عائشہ اشعر، کراچی۔

آپ کو بھائی لادیں۔ ”بچہ نے مسکرا کر کہا۔
”اب اُسے بدلا نہیں جا سکتا۔“ بچے نے
افریدگی سے کہا۔ ”اب تو ہم چاروں اُسے استعمال
بھی کر سکے ہیں۔“

نمائندگی

امریکا کی ایک سڑک پر ایک جنازہ جاریا تھا۔
ایک ہندوستانی کو یہ دیکھ کر بہت حیرانی ہوئی کہ
تابوت کے ہمراہ گولف کھلینے کا سامان رکھا ہوا تھا۔
انہی حیرت کا اطمینان کرتے ہوئے اُس نے جنازے
میں شریک ایک شخص سے دریافت کیا۔ ”یہ شخص یقیناً
زندگی میں گولف کا اچھا کھلاڑی رہا ہوگا؟“
”رہا ہو گا اسے آپ کا کیا مطلب ہے؟“ اُس
نے جواب دیا۔ ”وہ اچھا کھلاڑی ہے، تبھی آج کا
فال کھلینے کی وجہ سے وہ اپنی بیوی کے جنازے میں
شریک نہیں ہو سکا اس لیے اس کے گولف کا سامان
نمائندگی کی صورت ہمراہ ہے۔“

بیال احمد۔ کراچی۔

بدقتی

ایک نوآموز وکیل اپنا پہلا مقدمہ لڑ رہا تھا۔
عدالت کے روپرو دلائل دیتے ہوئے وہ
خاصازوں ہو گیا۔ ”نائی لارڈ“ میرا بدقت
مؤکل.....“ اس نے کہا اور خاموش ہو گیا زہن الجھ
گیا اور سمجھ میں نہ آیا کہ آگے کیا کہے۔ اس نے
دوبارہ پھر سہ بارہ کوشش کی لیکن ہر بار وہ اس سے
آگے کچھ نہ کہہ بایا۔ ”نائی لارڈ“ میرا بدقت موقکل
.....“ یہ دیکھ کر فاضل جج آگے گئے جھکا اور اس کی حوصلہ
افزاں کے لیے مسکراتے ہوئے بولا۔ ”کہیے کہیے
جناب، رک کیوں گئے؟ یہاں تک تو عدالت آپ
سے پوری طرح متفق ہے۔“

ساجدہ خان۔ کونہ۔

☆☆

دیکھ کر دور اسے ایسے پکارا میں نے
جس طرح دل میں کوئی خواب اتنا را میں نے
پہلے لکھوں سے کیا ورد کا صحراء یہ را
پھر تری یاد کو جنگل سے گزارا میں نے
رات بھر چہرہ ترا بھیتی آنکھوں میں رہا
چاند دیکھا نہ میری جان ستارہ میں نے
کیا بتاؤں تے یک لخت پھر جانے پر
کتنی مشکل سے دیا خود کو سہارا میں نے
میں جو نکلا ہی نہیں دکھ کے سمندر سے کبھی
خواب میں دیکھا تے ساتھ کنارا میں نے
ورنہ یہ لوگ کہاں ملنے کے لاائق تھے میرے
تیری خاطر کیا ہر شخص گوارہ میں نے
(فرحت عباس شاہ)

حسن انتخاب: امام عادل، کراچی۔

مگر تمہیں کیا

میں آڑتے تر جھے خال سوچوں
کوئی بے ارادہ کتاب لکھوں
کوئی شناساغزل تراشوں
کوئی اجنبی انتساب لکھوں
گنوادوں اک عمر کے زمانے
کہ ایک میل کا حساب لکھوں
میری طبیعت پتھر سے
میں جس طرح کا نصانع لکھوں
یہ میرے اپنے مزان جر ہے
عذاب سوچوں اٹواب لکھوں
ٹولیں تر ہے سفر تمہیں کیا
میں جی رہا ہوں مگر تمہیں کیا
مگر تمہیں کیا کتم تو کب سے
میرے ارادے گواچے ہو
جلائے سارے حروف اپنے

میری دعا نہیں بجا چکے ہو
میں رات اوڑھوں کرنج پہنؤں
تم اپنی رسمیں اٹھا چکے ہو
ثنا ہے کہ سب کچھ بھلا چکے ہو
تو پھر مردے دل پر جبر کیما
پر دل تحد سے اُزر چکا ہے
گزر چکا ہے مگر تمہیں کیا
خدا کاموسم پھر چکا ہے
پھر چکا ہے مگر تمہیں کیا
مگر تمہیں کیا کہ اس خدا میں
میں جس طرح کے بھی خواب لکھوں۔
(حسن نقوی)

حسن انتخاب: اشعر جواد، کراچی۔

دشواری

میں بھول جاؤں تمہیں
اُب بیکی مناسب ہے
مگر بھلانا بھی چاہوں تو کس طرح بھلوں
کہ تم تو پھر بھی حقیقت ہو
کوئی خواب نہیں
یہاں تو دل کا یہ عالم ہے کیا کہوں
کم بخت.....!
بھلانہ پایا یہ وہ سلسلہ
جو تھا ایسیں
وہ اک خیال
جو آواز تک گیا ہی نہیں
وہ ایک بات
جو میں کہہ نہیں سکتا تھا
وہ ایک بروط
جو ہم میں بھی رہا ہی نہیں
مجھے ہے یادوہ سب
جو بھی ہوا ہی نہیں

(جاوید انتر)

حسن انتخاب: کرن شیر، کراچی۔

بہہ کا گیت

چھڑکے جانے والے لوگو!

جب بھی رات کو بادل بر سے

ہم کو دھیان میں لا کر اتنا روک کر

آنکھوں کا کاجل

بہہ کر

سندرگال بھگو دے

چھڑکے جانے والے لوگو!

جب بھی رات کو بھلی چکے

چاہت کے علیت سنائے کہ میں بلا وہ

ہم بھی ہوا کے جھونکوں میں

ہر اجرے گر میں جاتے ہیں

اور گیت پرانے گاتے ہیں

(میر نیازی)

حسن انتخاب: صائمہ شاہ، حیدر آباد۔

☆☆.....

سامیں بابا

میرے سامیں بابا بڑے بر کتوں والے ہیں۔
وہ میرا ہر مسئلے چکلی بجانے میں حل کر دیتے ہیں۔
انہوں نے میرے بہت سے کافی رستے سے
صف کیے ہیں اور میری زندگی کو بہت پراسائش بنا
دیا ہے۔ ایک دن میں اداں بیٹھا ہوا تھا۔ میرا جی
چاہتا تھا کہ میں ملکیت کے گانے سنوں مگر یہ کیسے ممکن
ہو وہ تو اپنے پرسوں گانوں کے ساتھ کب کا اس دنیا
سے رخصت ہو پوچکا ہے میں نے سامیں بابا سے اپنی
محرومی کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا کون سا کوئی مشکل
کام ہے۔ انہوں نے چکلی بجائی اور ملکیت کی درد بھری

کی جیب میں سے ایک بھرا ہوا سگریٹ نکالا اور کہا لو
سوٹا لگاؤ۔

عطاء الحق قاسمی کی تصنیف ”روزن دیوار“ سے اقتباس
انتخاب: با بر محظوظ کرایجی۔

زندگی کی قوت

گھر کے آنکن میں ایک بیل اگی ہوئی تھی۔
مکان کی مرمت ہوئی تو وہ بلے کے نیچے دب گئی۔
آنکن کی صفائی کرتے ہوئے مالک مکان نے بیل
کو کٹوادیا۔ دور تک ہودو کراس کی جزیں بھی نکلوادی
تھیں۔ اس کے بعد پورے مکون کو اینہوں سے پختہ
کر دیا گیا۔

پچھے عرصہ بعد بیل کی سابق جگہ کے پاس ایک
نیا واقعہ رونما ہوا۔ پختہ اینٹیں ایک مقام پر ابھر
آئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے دھکا دے
کر انہیں الکا داما ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ چوہوں کی
کارروائی ہے۔ کسی نے کوئی اور قیاس کرنے کی
کوشش کی آخر کار اینٹیں ہٹانی لگیں۔ تو معلوم ہوا کہ
بیل کا پودا اس کے نیچے مرڑی ہوئی تھکل میں موجود
ہے۔ بیل کی پچھے جڑیں زمین کے نیچرہ گئی تھیں۔ وہ
پڑھ کر اپنے تک پہنچیں اور اپر آنے کے لیے زور
کر رہی تھیں۔

”یہ پیتاں اور..... جس کو ہاتھ سے ملا جائے تو
وہ آئے کی طرح پس اٹھیں۔ ان کے اندر اتنی
طااقت ہے کہ اینٹ کے فرش کو توڑ کر آپر آ جائیں۔“
مالک مکان نے کہا۔ ”میں ان کی راہ میں حائل
نہیں ہوں چاہتا اگر یہ بیل مجھ سے دوبارہ زندگی کا حق
ماگ رہی ہے تو میں اس کو زندگی کا حق دوں گا۔“

”جناب، انہوں نے چند اینٹیں نکلا کر اس
کے لیے جگہ بنادی۔“ ایک سال کے بعد ٹھیک اسی
مقام پر تقریباً چند رہ فٹ اونچی بیل کھڑی ہوئی تھی
جہاں اس کو فتح کر کے اس کے اوپر پختہ اینٹیں

درمیان میں سے گزرا ہوں۔ انہوں نے مجھے ایسی
دنیاوں کے بارے میں بتایا جو زمین سے اربوں
کھربوں میل کے فاصلے پر ہیں۔ سائیں بابا کو سب
علم ہوتا ہے کون سی دنیا کے کون سے ہے میں کیا ہو
رہا ہے۔ سائیں بابا مجھے چاند پر بھی لے گئے تھے۔
وہاں میں بہت بورہ والا تابور کہ چاند میں شکلوں سے
بھی پیڑا رہو کر رہ گیا۔ میں نے ایک دن سائیں بابا
سے کہا ”سائیں بابا، میں چاہتا ہوں کہ یہ کمالات
مجھے بھی حاصل ہو جائیں۔“ یہ سن کر سائیں بابا خوش
ہو گئے اور بولے کیوں نہیں لیکن اس وقت تم کچھ ان
سے بھی زیادہ ضروری کاموں میں مشغول ہو تو تم نور
اور شرکا مسئلہ حل کرنے میں لگے ہوئے ہو، تمہیں یہ
بھی فکر ہے کہ پودہہ موسال پیلس کی حق طفی ہوئی
تھی اور کس کی نہیں ہوئی تھی۔ تم لباس اور چہرے کی
وضع قطع کا بہت عرق ریزی سے مطالعہ کرتے ہو
تمہیں چاول کے دانے کے برابر باتوں والے مسئلے
کی بھی بہت فکر ہے۔ تم نے طہارت پر بہت تحقیقی تم
کا کام کیا ہے اور ابھی تک مسئلہ کر رہے ہو۔ اسی
طرح جنت کی حرروں، ان کے لباس، ان کے رہن
سکھن اور ان کے حسین سراپے کے بارے میں اتنا
میں نہیں جانتا تھا تھا رہے ہاں کا ایک معمولی پڑھا
لکھا شخص جانتا ہے۔ یہ سب کام بہت ضروری ہیں
تم ان سے فارغ ہو لو پھر کمالات کے حصول کے
بارے میں سوچنا۔ اس روز مجھے بابا سائیں اچھے ہیں
لگے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے کمالات خود تک
محدو درکھنا چاہتے ہیں۔ ان لمحوں میں مجھے یاد آیا کہ
میرے مرشد سائیں کوڑے شاہ بھی تو ہیں، وہ بھی
صاحب کمالات ہیں۔ میں ان کا فیض حاصل کیوں
نہ کروں۔ چنانچہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔
میں نے عرض کی شاہ بھی مجھے بھی فضاوں میں اڑانا
لکھا ہیں۔ اس پر انہوں نے اپنے کرتے کی سامنے

بھی بھوک کی وجہ سے اس طرف دھیان نہیں دیا تھا۔
بہر حال خوشبو دار مرغ کے گرد اٹھے اور آلو کے
تھنے اور سلا داد غیرہ بہار دکھار ہے تھے جبکہ گوری لڑکی
نے ایک پلیٹ مولانا کے آگے رکھی جس میں ایک
ابی گاجر اور دو ایلے ہوئے آلو پڑے تھے۔ مولانا
نے گاجر کھانے کی کوشش کی مگر میرے روست سے
ان کی نظریں بھتی نہیں تھیں۔ بالآخر انہوں نے گرنج
دار آواز میں کہا۔ ”بُرخوردار اس گوری ہوٹل والی
زنانی سے کہو میرے لیے بھی یہی مرغ لے آئے یہ
شکل سے حلال لگتا ہے۔“

مستنصر حسین تازر کی تصنیف ”چک چک“ سے اقتباس
انتخاب: صدف احراق نہیں، کراچی۔

اے رات

اے رات! میں تیرے ساتھ رہا یہاں تک کہ
تجھے سے مشابہ ہو گیا۔ تجھے سے مانوس ہوا اسی قدر
کہ میری خواہیں تیری خواہیں میں گھل مل گئیں
میں نے تجھے سے محبت کی۔ اتنی شدید محبت کی کہ میرا
وجدان تیرے وجود کی ایک چھوٹی سی تصویر بن گیا۔
چنانچہ میری تاریک روح میں چکتے ہوئے ستارے
ہیں نہیں جذبہ شوق رات کو بکھرتا ہے اور دسوے
ضلع کو سیست لیتے ہیں۔ میرے قلپ گمراہ میں
ایک چاند ہے جو بھی بادلوں سے رین فضا میں
طلوع ہوتا ہے اور بھی پر چھائیوں سے لبریز کلاء
میں۔ میری بیدار روح میں ایک خاموشی ہے، جو
اپنے اڑات سے عاشقون کے راز کھولتی ہے اور
جس کی خلامیں عابدان شب زندہ دار کی دعاوں کو
دہراتی ہیں اور میرے سر کے چاروں طرف ایک
ٹلسکی غلاف تنا ہوا ہے جسے مرنے والوں کی خر
خراہت پارہ پارہ کرنی ہے اور شاعروں کے نئے
سیتے ہیں۔

اے رات! میں تجھے سے مشابہ ہوں کیا لوگ

جوڑی گئی تھیں۔
درخت کے نئے پودے میں اتنا زور ہے کہ وہ
پتھر کے فرش کو حلیل کر باہر آ جاتا ہے؟ یہ طاقت اس
کے اندر کہاں سے آئی؟ اس کا سرچشمہ عالم فطرت کا
وہ پراسرار مظہر ہے جس کو زندگی کہا جاتا ہے۔ اسکی
وقت جو اس دنیا میں اپنا حق وصول کر کے رہتی
ہے۔ جب زندگی کی جڑیں تک گھوڑوی جاتی ہیں
اُسی وقت بھتی وہ نہیں نہیں اپنا وجہ رکھتی ہے اور
موقع پاتے ہی دوبارہ ظاہر ہو جاتی ہے۔

مولانا وحید الدین خان کی تصنیف ”راز حیات“

سے اقتباس
انتخاب: حسین جو نیجوہ بورڈی۔

حلال مرغ

میں اس وقت پندرہ سو لہ سال کا تھا اور چھلی بار
ولایت جارہا تھا جہاڑ میں میرے بابری نشست پر
ایک مولانا بر اجمن تھے۔ وہ خاصے سادہ سے تھے۔
میں نے دریافت کیا کیوں چجا جان آپ کس سلسلے
میں انگلستان جا رہے ہیں تو کہنے لگے۔

”بیٹا میں کافروں کو مسلمان کرنے جا رہا ہوں“
میں نے پوچھا۔ ”آپ کو انگریزی آتی ہے؟“ کہنے
لگے۔ ”نہیں آتی۔ جس کو مسلمان ہونا ہو گا“ اسے خود
بخود میری زبان بکھھا آجائے گی۔“

ہم کراچی سے تہران، قاہرہ، ایشتر رکتے ہوئے
روم پہنچ۔ ایز لائن کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ
مسافر حضرات ایز لائن کے ریسٹوران میں اپنی
مرضی کا لکھتا تاول فرمائیں۔ مل کپنی کے ذمے ہو
گا۔ ریسٹوران میں بیٹھے تو میں نے ایک چکن
روست کا آرڈر دیا۔ ”مولانا آپ کیا لکھا میں گے؟“
میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا۔ ”اس گوری
لڑکی سے کہو میرے لیے ابھی ہوئی بزریاں لے آئے
کیونکہ گوشت تو یہاں پر حلال نہیں ہو گا۔“ میں نے

میری اس مشاہدہ کو قابلِ غریبگھیں گے جب کہ وہ دن سے مشاہدہ ہونے کو رہا یا فقار میکھتے ہیں۔

میں تجھ سے مشاہدہ ہوں اور ہم دونوں اس گناہ کے سلسلے میں مقام ہیں جس کا ارتکاب ہم نے نہیں کیا۔

میں تجھ سے مشاہدہ ہوں اپنی فطرت، اپنے اخلاق، اپنی امیدوں اور اپنی آرزوؤں کے لحاظ سے۔

☆ آپ اپنی زندگی کا یہ اصول بنالیں کہ کسی کا برا کرنے میں آپ پہلے نہیں کریں گے۔ یقین جائیے آپ سرخور ہیں گے۔

☆ آپ کی ذاتی کائنات میں آپ نے جتنا حصہ اللہ تعالیٰ عزوجل کا رکھا ہے، اتنا ہی اللہ تعالیٰ عزوجل کی کائنات میں آپ کا ہے۔

☆ لوگ زندگی کے اندریوں میں جیتے ہیں حالانکہ انہیں موت کے اندریوں میں جینا چاہیے۔

مرسلہ: صحنِ ماروی، نواب شاہ۔

دوسی

☆ پھولوں کی دوستی سے پہلے کا نٹوں سے دوستی رکھو۔

☆ دوستی ایک سمندر کی لمبڑی طرح ہے۔ جس طرح لمبڑی دوسری لمبڑوں کے ساتھ متحمل کر کر ہی سمندر کی اعتماد گہرائیوں میں چل جاتی ہیں اور کبھی واضح نظر آتی ہیں، کبھی مثالاً اپک دوست کی ہے۔

☆ دوستی ایک پانی ہے جو دل اور دماغ کو سیراب کرتی ہے۔

☆ جس کا ٹوئی دوست نہیں، وہ اس گلشن کی مانند ہے جس میں پودے ہیں مگر پھول نہیں۔

☆ دوستی ایک بلند محل ندی کے پانی کی طرح جملیں کرتا رشتہ بارش کی طرح پسکون اور تاروں کی تازک، چاند کی روشنی کی طرح پرسکون ہوارشتہ ہے۔

مرسلہ: سعدیہ بلوچ، کوئٹہ

☆☆☆.....☆☆

میں تجھ سے مشاہدہ ہوں اگرچہ شام نے اپنے سنہری باڈلوں کا تاج میرے سر پہنچ رکھا۔

میں تجھ سے مشاہدہ ہوں اگرچہ صبح نے اپنی گلابی شعاعوں سے میرے دامن کوئی سوارا۔

میں تجھ سے مشاہدہ ہوں اگرچہ کہکشاں کی پئی میری کمر میں نہیں ہے۔

میں خاموش و مفطر برات ہوں جس کی زلفیں کھلی ہوئی ہیں اور پہنایاں ہمہ کیر میری ظلمت کا کوئی آغاز نہ ہے میری گہرائیوں کی کوئی انتہاء۔

جب کبھی روحلیں اپنی سرتوں کی روشنی میں بہ اندازِ لکھنی کھڑی ہوئی ہیں تو میری روح اپنے غم کی تاریکیوں کے ساتھ عظمت و بزرگی کی بلندیوں کی طرف اڑتی ہے۔

اے رات! میں تجھ سے مشاہدہ ہوں اور جب تک موت مجھے اپنی آغوش میں آسودہ نہ کر لے میری صبح نہیں ہوگی۔

خلیل جران کی تصنیف "شیطان" سے اقتباس
انتخاب: پروفیسر صفیہ سلطانہ جیکب آباد

سنہری باشمیں

☆ جن لوگوں کے دلوں میں محبت کی کوچیں بغیر کسی ملے یا تمنا کے پھوٹیں وہ بے حس نہیں بے غرض ہوتے ہیں۔

☆ کتنی عجیب بات ہے، ہم بیماری کے ذرے

مختصر خبروں پر مختصر تیکھاتیں

سکنگر پرے

گلش

☆ ۵ شیخ صاحب پولیس میں نیا حکم آپ کو اور قوم کو مبارک ہو.....!

☆ نواز شریف مارشل لاءِ لگوانا چاہتے ہیں عمران خان.....!

☆ ۵ مارشل لاءِ لگتا تو پھر بھی میاں صاحب کو گھر جانا تھا، وہ بغیر مارشل لاء کے چلے گئے اور کیا چاہیے خان صاحب آپ کو؟

☆ دنیا جانتی ہے یہ احتساب نہیں، انتقام ہے مریم نواز.....!

☆ ۵ دنیا؟ کون سی دنیا جو آپ کے گرد گھومتی ہے؟

☆ کراچی میں صورت حال بہت خراب ہے، امن و امان نظر نہیں آتا، جماعت اسلامی.....!

☆ ماضی میں کب اچھی تھی، وہ وقت بھی بتا دیجیے ذرا۔

☆ کے الیٹرک کے خصوصی اضافی میرف میں سات سال کا اضافہ، ایک خبر.....!

☆ حالات 99 سے مددے ہیں، سابق و فاقی وزیر داخلہ چوبہ ری شار.....!

☆ چوبہ ری صاحب حالات اب اتنے بھی برے نہیں ہیں 99 میں میاں صاحب تو جیل گئے تھے۔

☆ اسپلی قبل از وقت تحلیل کرنے کا مطالبہ پاریسمانی سسٹم کو کمزور کرنے کی سازش ہے ایک جبر.....!

☆ ۵ ایکشن اگست 2018ء میں ہی ہوں گے، سیاست و ان بھی چاہتے ہیں جتنا نچوڑ سکتے ہیں نچوڑ لیں۔

☆ تجویز احتمان ہے، مولا نافضل الرحمن.....!

☆ مولا نا اچھے آدمی ہیں، ہمیشہ دوستوں کا خیال رکھتے ہیں۔

☆ رارانا شاء اللہ پاگلوں کا آئی جی ہے، شیخ رشید.....!

- ۵ کراچی والوں پر بھلی گرانا کوئی مسئلہ تو نہیں
عمر سیدہ ہیں۔
- ۶ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کا آمرانہ قدم ترقی کا
راستہ روکنے کی سازش تھی شہباز شریف.....!
- ۷ بھائی اب تو نبی سیریل دیکھا جائے گا،
شروع ہوئی ہے اس کا کیا ہو گا؟
- ۸ حکومت مذاکرات کے نام پر ہم سے
مذاق کرتی ہے مطالبات نہیں مانتی، ناپینا
افراد.....!
- ۹ صبر سے کام لو جن سے مطالبات کیے
جارہے ہیں وہ آنکھوں کے نہیں دل کے ناپینا
ہیں۔
- ۱۰ پی پی پی نے سندھ کی ترقی میں اہم کردار
ادا کیا ہے ایک خبر.....!
- ۱۱ ۵ جی ہاں پھرے کے ڈھیر، ٹریک کاظمام
تباہ، لوت مار، بھی تو ہور ہائے مگر اس میں ترقی کہیں
نظر نہیں آ رہی، کیونکہ ترقی پافتہ مالک میں یہ
سب نہیں ہوتا تو پھر واقعی یہ ترقی ہے۔
- ۱۲ نواز شریف نے یوقوف بنایا، پریم
کورٹ.....!
- ۱۳ ”دھا کر خیز جملہ“ مجھے کیوں نکلا کا
جواب بھی آخر ختم گیا۔
- ۱۴ آ صفحہ زرداری نے قوم کا ۱۶ ارب روپیہ
ہڑپ کیا اور اب ہمیں بھاش دے رہے ہیں
شہباز شریف.....!
- ۱۵ وزیر اعظم آپ کا، وزیر داخلہ آپ کا،
پولیس آپ کی، آپ نے کرپشن کے لیے کیا کیا؟
قوم کو تو آپ بھی بھاش دے رہے ہیں۔ اور خیر
ہووئے۔
- ۱۶ گرفتار سعودی شہزادے کرپشن کی رقم
لوٹانے پر تیار ہیں، ایک خبر.....!
- ۱۷ لگتا ہے شہزادے آج کل پاکستانی اخبار
سیزین (عمر سیدہ افراد) کے ساتھ سلوک کیا
ہے کسی کی تو دعا تھی جو عرش پر پہنچ گی جبکہ آپ خود

پڑھ کر کر پوشن کا توڑ سمجھ گئے ہیں۔

☆ ضمیر کی آنکھوں سے دیکھیں سب کچھ نظر
آجائے گا، چیزیں مین سینیٹ.....!

○ اگر ضمیر کی آنکھیں ہوتیں تو آج
سیاستدان عدالتون کے جکڑنے لگا رہے ہوتے۔
☆ انتخاب میں تاخیر ہوئی تو ذمے دار
زورداری ہوں گے سعدِ فتح.....!

○ شکرا دا کرنا چاہیے کہ کچھ عرصہ اور حکومت
کوں جائے گا۔

☆ اداکارہ میرا کے شوہر نے میرا الزام
لگاتے ہوئے کہا ہے کہ میرا میری بیوی ہے اسے
دوسری شادی سے روکا جائے، ایک خبر.....!

○ ارے جناب میرا تو اب فلموں میں نہیں
آ رہی، نہ انہیں کوئی کاست کرتا ہے اور پھر ہر چیز
کی عمر ہوتی ہے۔

☆ عبایی شہید اسٹال کی حالت زار بدل دیاتی
قیادت کے لیے شرمناک ہے۔ فیض الرحمن
جماعتِ اسلامی.....!

○ میر کراچی اس خبر پر توجہ دیں کہ یہ سچی
ہے یا جھوٹی؟

☆ ہماری کوشش ہو گئی کہ سرکاری ٹی وی کے
نظریہ کو واپس لایا جائے، میریم اور نگزیب.....!
○ نظریہ تو اب واپس نہیں آ سکتا ہیں، لیکن تو
وہ مضمون ٹی وی کے جو حکومتی ناکامی کو آنکھوں
سے چوم کر آن ایئر کرتی ہے۔

☆ جو افراد کام نہیں کرے گا وہ گھر جائے گا،
شہباز شریف.....!

○ جناب ہاتھ ہلکا رکھیں 2013ء سے یہ
مرے کر رہے ہیں، اب تو چند ماہ رہ گئے ہیں
ایکش میں۔

☆ سینیٹ میں کھلونوں نما سلمی کی تیاری اور

فروخت پر پابندی کی قرارداد منظر، ایک خبر.....!
○ جیرت ہے کہ پوشن کوئی گیس، بجلی
نظام اسپتا لوں میں دوایاں ناپید بانی گیس، بجلی
غائب، لوٹا ماری کے حوالے سے قتل، ایئر لائن
ریلوے کے نظام میں خرابیاں اس پر قرار داد
کیوں نہیں، قوی اسکیل، صوبائی اسکیل اور سینیٹ میں
پیش نہیں کی جاتیں کوئی جواب اس کا ہے؟
☆ بلاول بھٹو زورداری کا پورے پاکستان
میں انتظار ہو رہا ہے پی پی پی.....!

○ کس حوالے سے برائے مہربانی روشنی تو
ذالیں۔
☆ وفاتی وزیر قانون زاہد حامد نے ملکی مفاد
میں استعفی دیا، مریم اور نگزیب.....!
○ بی بی زاہد حامد نے جو بھی ملکی مفاد میں کام
کے ہیں پر نہیں کافر نہیں کر کے قوم کو ضرور بتا میں
تاکہ آپ بھی اس لیے ایمان کے بعد سخرد ہوں۔
☆ میں نے بھی شونک منسوخ نہیں کرائی
اداکارہ کا جل.....!

○ بی بی 25 سال سے قلم اٹھ سڑی سے
وابستہ ہو اور جب انسان عمر رسیدہ ہو جاتا ہے تو
اپنی ذمے داری زیادہ محبوں کرتا ہے سارا چکر عمر کا
ہے۔

☆ مرکز قوی بچت کا اور یزیر پاکستانیوں
کے لیے ایکیم شروع کرنے پر غور، ذی جی کا
بیان.....!

○ اللہ کو راضی کچھ پر ایسیٹ بیکوں کی
طرح اچھی شرح پر بزرگوں کے لیے اسلامی
مشقیث کا اجرا کریں، ان غریب اور ایماندار
لوگوں کو کب تک سود کی ٹرینیں میں سوار کرائیں
گے کچھ خوف خدا کا بھی کام کر جائیں۔

☆☆☆☆☆

خلق خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ”مسئلہ یعنی“ کا سلسلہ خلق خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ”جی کہاںیاں“ کا اولین شمارے سے شامل اشاعت ہے۔ گزشتہ رسول میں ان صفات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاوں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے صرف استفادہ کیا بلکہ اس ماذی دینا میں آیات قرآنی اور ان کی روحانی طاقت کے حیران کرنے والے مجرے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تابع سے فہرستہ ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورت حال یہ ہو گئی کہ اگر ماہنامہ ”جی کہاںیاں“ میں خطوط کے جوابات دینے پر اتفاق کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی تی ہاں انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفات کی تعداد بہر حال حدود ہے۔ ان ہی خلاف کو دیکھتے ہوئے فوری نیعیت کے سائل کے جوابات برادر است ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گی، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو منجھانا، ان کاریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں پرداز کرنا خاصاً دقت طلب کام ہے جو مجھے ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ ان صفات کی ترتیب و تدوین اور برادر است جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی تجھیکی کی دعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ) کے لیے دعا ہے جیسے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دعاۓ خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تجھے کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑی ہوئی تعداد کے پیش نظر ادارے کو یقیناً اضافہ اضافہ رکھتا رہا ہے جو خطوط کاریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں پرداز کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب حاجتی ہیں تو ازاہ کرم جوابی لفافے کے ساتھ = 300/- روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ”جی کہاںیاں“ کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم ان افراد کی تجوہ کی مدد میں آپ کی امداد ہو گئی جو اس شبے سے متعلق ہیں۔ میں آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ یعنی کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحب استطاعت حضرات توکن منی = 300 روپے کو آخری حد نہ بھیں، وہ حسب استطاعت اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم ان خواتین کے کام آئے گی جو لک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ یعنی کام نہیں ہے۔ خطوط یعنی سے پہلے درج ذیل بانوں کا خیال رکھیں۔

- (1) مسئلے کے ساتھ اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیں ورنہ فائدے کے بجائے نصان کا احتمال ہے۔
 (2) منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ”جی کہاںیاں“ کے نام ارسال کریں۔
 (3) اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II - خیابانِ جامی۔ ڈیفسن پاؤ سنگ اتحاری۔ فیز-7، کراچی

عزیز بچو! اللہ تم سب کو اپنی امانت میں رکھے۔ ایک اور انگریزی سال تمام ہوا۔ اللہ کرے یہ نیا سال میرے طمن اور اس میں بننے والوں کے لیے صرف خوشیاں اور کامیابیاں لائے۔ ایک بار پھر ان تمام بچوں کا شکریہ جن کے تعاون کے باعث کئی سفید پوش کنبے عزت نفس مجنوح ہوئے بغیر اپنی ضروریات پوری کر رہے ہیں۔ اس عظیم یکی کا اجر اللہ انتہیں یہک اولاد و افرزق اور کامیاب اور سخت مددگری کی صورت ضرور عطا کرے گا۔ زندگی سے رکاوٹیں دور ہوں گی انشاء اللہ۔۔۔۔۔ سورۃ بقرہ کی آخری تین آیات سب اپنی عادت میں شامل کر لیں۔ رات کو سونے سے قبل ضرور پڑھیں۔ سورۃ ناس، سورۃ فلان اور آیت الکرسی جب جب یاد آئے پڑھیں۔ موجودہ دور میں سفلی عملیات کا استعمال بدجنت ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے بہت کر رہے ہیں۔ اللہ سب کو شیطان اور شیطانی عمل سے محظوظ رکھے۔

□ احمد زیر لیتھ۔

5 بابا جی! میں اس سے پہلے بھی آپ کو خط لکھتا رہا ہوں اور اللہ کے فضل سے میرے مسائل بھی حل ہوئے ہیں۔ آج آپ کو اپنی بہن کے مسئلے کے لیے خط لکھ رہا ہوں۔ بابا جی! اس کی شادی 2015ء میں میرے لئے ماموں زاد سے ہوئی اور بدلتے میں

اطلاعِ عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرما لیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیئے گئے۔ نئے ایمیڈیاں پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: II: 88-C - فرست فلور۔ خیابان جامی کریش۔ ڈیفنس باؤنڈ اسٹارٹی۔ فیز۔ 7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے ایجاد کیجیے۔ 35893122 - 35893121 - 021-

بات تو طے ہی ہے۔ میری ساس دل کی مریضہ ہیں اور یہ مسئلہ ان کی تکلیف میں اخافہ کر دیتا ہے۔ برائے مہربانی کوئی حل نکالیے۔

☆ بیٹی کل! اللہ کا مکفر ادا کیا کرو اور عہد کرو کہ اب ہر کام میں اللہ کی رضا مندی لیا کرو گی۔ جہاں تک تھماری نندہ کا تعلق ہے تو بیٹی سے کہو بعد نہایت فخر ایک بار سورہ آخرات پڑھے اور دعا کرے۔ اپنی ساس سے کہو بچی کے اوپر سے صدقہ خیرات ضرور نکال کریں۔ بعض اوقات بچے بدنظر کا ڈکار ہو جاتے ہیں اور ان کے تمام معاملات میں پھر رکاوٹ نظر آنے لگتی ہے۔ بہر حال اللہ پر بھروسہ کوہوہ بہتر کرنے والا ہے۔

□ امجد خان۔ بنوں۔

5 بابا جی! آج بہت ہمت کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ معاشی مسائل سے تو عرصہ 6 سال سے نہ برازما ہوں مگر اب بیٹی کی پیاری نے بالکل توڑ کر کر دیا ہے۔ بابا جی! میری بیٹی کی عمر 20 سال ہے اب سے مجھے ماہ پلے تک وہ مکمل طور پر صحت مند ہی۔ ایک رات اچاک درد اٹھا۔ ڈاکٹر کے پاس لے گئے شیست ہوئے تھن سے پتا چلا کہ کر دے بچ کام نہیں کر رہے لہذا Dialysis ضروری ہے۔ بخت میں 3 دن بچی کے ساتھ اپسال آتا ہوں۔ Dialysis کے لیے تو بابا جی! اس کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی، پھر اب ڈاکٹر ز Transplant کا کہہ رہے ہیں۔ ان کے مطابق گردے آہستہ آہستہ نکارہ ہو رہے ہیں اور اب تک جو بھی علاج ہوا ہے اُس سے فائدہ ہوتا نظر نہیں آ رہا لہذا گردے کی پیوند کاری ضروری ہے۔ بابا جی! اس بات نے ہمارے ہوش اڑا دیئے ہیں۔ مالی وسائل اپنی جگہ مگر اس مہنگے ترین علاج کے بعد بھی زندگی کی کوئی ہمانت نہیں۔ بابا جی! ہمارے خاندان کے لیے یہ بہت کڑا وقت ہے۔ میری بیوی کی حالت تو بہت

بھرے پر رونق نہیں ہے، کیل مہا سے، جہانیاں ان سب سے نجات حاصل کرنے کے لیے دو ایکی کہانیاں کے دفتر سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

میری شادی وہاں ہوئی۔ اس طرح ایک گھر کے دو لوگ ہمارے پاس ہیں۔ بابا جی! میری بہن کے ہاں ابھی تک اولاد نہیں ہے۔ یہ بات اسی لیے محسوس زیادہ ہوتی ہے کہ میری شادی بہن کی شادی کے ایک ماہ بعد ہوئی اور میرے گھر میں ایک بیٹا بھی ہے اور دوسری اولاد کی امید ہے۔ بہن میرے بچوں کو بہت حسرت سے دیکھتی ہے۔ آپ اتنا موثر تعویز دیں کہ وہ جلد از جلد مان بن سکے۔

☆ بیٹے جاؤ یہ.....! اللہ تھماری بہن کو خوش اور آباد رکھے۔ تعویز میں تیار کر دوں گا مگر مجھے کچھ تفصیلات درکار ہیں لہذا مناسب ہو گا کہ بہن مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھے۔ میں تفصیل سے جواب دوں گا۔ بس بچی اللہ پر بھروسہ کرے۔ بے شک وہ نہایت مہربان آتا ہے اور جو لوگ اس سے مدد مانگتے ہیں وہ انہیں بھی مالیوں نہیں کرتا۔

□ گل حمید۔ پنڈی۔

5 بابا جان! میں آپ کی وہی بیٹی ہوں جس کو آپ نے شادی کے لیے تعویز اور ورد دیا تھا۔ بابا جان! اللہ کا بڑا کرم ہے آپ کی دعاؤں سے میری شادی ہو گئی اور میں اپنے گھر میں بہت سکون سے ہوں۔ بابا جان! اصل میں مسئلہ میری نندہ کا ہے۔ وہ اچھی بھکل و صورت کی ہے، تعییم یافتہ ہے، سلیقہ مند ہے مگر اس کا رشتہ کہیں طے نہیں ہوتا۔ لوگ آتے ہیں پسند کر جاتے ہیں اور پھر بلا وجہ انکار ہو جاتا ہے۔ بابا جان! پہلے تو ہم نے یہ بات محسوس نہیں کی مگر اب احساس ہونے لگا ہے۔ اس کے ساتھ کی تمام بچوں کی یا تو شادی ہو گئی ہے یا کم از کم

بالوں کا گرتا، نکلی بے جان بال ان سب کے
لیے جڑی یونٹوں سے تیار 150 سو سال پرانا
نہیں..... اب آپ بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ رابطہ
35893121-35893122

تھی تھا اٹھائی ہیں۔ اب اپنی زندگی میں میں اپنے
بچوں کو کامیاب دیکھنا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے وظیفہ
عنایت فرمائیے اور مدت ضرور تحریر کریں۔

☆ بھی نور! اللہ تعالیٰ تمہیں اولاد کی خوشیاں
دکھائے۔ سب سے پہلے تو نماز کی پابندی کرو اور
ڈرود شریف بہت پڑھو۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد
3-3-3 نیجع سورۃ آل عمران، آیت 17 پڑھو اول
وا آخر درود شریف پھر حاجت بیان کرو۔ یقیناً تم نے
اپنی زندگی میں بہت محنت کی ہوئی۔ انشاء اللہ، اس کا
اجر بھی ملے گا۔ اس اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل بھروسہ
رکھو۔ وظیفے کی مدت 41 دن ہے۔

□ یا تسمین۔ حیدر آباد۔

5 بابا سماں.....! اللہ تعالیٰ آپ کو خوش
رکھے۔ بابا سماں.....! میری عمر 24 سال ہے 2
چھے ہیں۔ میاں ٹنک میں جاپ کرتے ہیں۔ اللہ کا
براؤ احسان ہے، زندگی پر سکون ہے، مگر اس کے باوجود
میں اکثر راتوں کو جائی رہتی ہوں۔ مختلف سوچیں
ذہن منتشر رکھتی ہیں۔ جانے کی وجہ سے چہرے کی
تازگی بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ بے شمار جھائیوں کی وجہ
سے چہرہ بہت بد نما لگتا ہے۔ مہنگی ترین کریز
اور لوٹن استعمال کر کے دیکھ بھلی ہوں مگر کوئی فائدہ
نہیں۔ آپ مشورہ دیں، کیا کروں؟

☆ بھی یا تسمین.....! اللہ تعالیٰ حاجت قبول
فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور ڈرود شریف بہت
پڑھا کرو۔ پانی بہت پیو اور رات میں سوتے وقت
ایک گلاں گرم ڈودھ ضرور پیا کرو۔ مناسب ہو گا، مجھے

خراب ہے۔ ہم چاہتے ہوئے بھی بھی بھی کے سامنے
اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتے۔ خدا کے لیے
کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس کی برکت سے مجہزادہ
ہو جائے اور میری بھی پہلے جیسی صحت مند ہو جائے۔
بابا! اس وقت بھی میری آنکھوں میں آنسو ہیں، مجھے
سے اپنا آپ ہی نہیں سنبھل رہا تو اس کی ماں کو کیسے
سمجاوں؟ رحم کیجیے اور اس مشکل وقت میں مدد کوئی
☆ بیٹے احمد! تمہارا خط پڑھ کر بہت دُکھ ہوا مگر
بیٹے! بہت سے اس آزمائش کا سامنا کرو۔

بھیں اپنے اندر بہت پیدا کرنی ہو گی ورنہ گھر کا
شیرازہ فخر جائے گا۔ میں اپنے میڈیکل سائنس
نے بہت ترقی کر لی ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ
انسان ان روپوں کو حرف آخڑ کجھ لے۔ اللہ تعالیٰ کی
ذات بہت بے نیاز ہے وہ جس چاہے جسے چاہے
نواز دے۔ جہاں تک ممکن ہو پوچھی گی اعلاج کرواؤ۔
اس کے بعد کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دو۔ دعا اور
دوادنوں بہت ضروری ہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر اسباب
بھی پیدا کرے گا۔ اس اپنائیں پختہ رکو۔ بعد نماز فجر
اور عشاء 41-41 بار سورۃ فاتحہ پڑھ کر پانی پر دم کرو
اور یہ پانی دودو گھونٹ بھی کو پلاو۔ میں بھی خصوصی دعا
کا اہتمام کروارہا ہوں، انشاء اللہ ضرور کرم ہو گا۔ مجھے
41 دن بعد حالات سے آگاہ کرو۔

□ نور بانو۔ حیدر آباد۔

5 بابا! اللہ آپ کو مکمل صحت عطا فرمائے۔
میرے دو بیٹے اور ایک بھی ہے۔ بیٹے بڑے ہیں اور
ماشاء اللہ دو فوں انجینئرنگ ہیں۔ تعلیمی ریکارڈ دو فوں کا
ہمیشہ بہت شاندار ہاگر عملی زندگی میں داخل ہونے
کے بعد ان کو مسلسل ناکامیوں کا سامنا ہے۔ پڑھائی
کے حساب سے تو کری نہیں ملتی۔ میں نے بچوں کو
انہائی جدوجہد سے پڑھایا ہے۔ اُن کے والد بچپن
تھی میں فوت ہو گئے تھے۔ میں نے یہ ذمے داریاں

اندرونی اور بہر ونی زخموں آپ ریشن کے بعد ٹاکوں کا چارہ جانا یا کسی بھی حرم کی چوت کے لیے دو امتیاب ہے۔
جن گھروں میں جھوٹے پنج ہیں وہاں اکٹھ کھیل کو دو کے دوران سر پر چوت لگ جاتی ہے ایسے میں یہ دوسریں خون
بجھنے نہیں دیتی، دوا حاصل کرنے کے لیے تجھی کہانیاں کے دفتر فون کریں۔

تو عویذ لیسا جا بنتے ہوئیں تھوڑی ضرور تیار کر دوں گا مگر اس
کے لیے کچھ تفصیل درکار ہے لہذا مجھے جوابی لفافے کے
ہمراہ تفصیلی خط لکھوں اللہ حاکی وناصر ہو۔

□ مینا خان۔ پشاور۔

☆ بُنیٰ بینا.....! اتحہار امسکلہ شائع کرنا مناسب
نہیں۔ تم مجھے براہ راست خط لکھو۔ مجھے اس بات کا
خاص دھیان رکھنا پڑتا ہے کہ کوئی چیز بھی ایسی
میرے کالم میں شائع نہ ہو جو مناسب نہیں۔ گھروں
میں خواتین یہ رسولہ پڑھتی ہیں، کم عمر پچیاں پڑھتی
ہیں لہذا بہت احتیاط کرنی پڑتی ہے۔
□ فضل الہی۔ اسلام آباد۔

5 بابا جی! میں عرصہ 12 سال سے گارمنٹ
کا کام کر رہا ہوں گر آب کچھ عرصے سے کاروبار سے
برکت پا لکھن ختم ہو گئی ہے۔ سارا سارا دن گزر جاتا
ہے کوئی گا کہ بیس آتا۔ مہنگائی کے اس دور میں
بچوں کا بھی ساتھ ہے۔ مہینہ گزارنا برا مشکل ہو گیا
ہے۔ بچوں کی فیس اس کے علاوہ بھلی پانی۔
عین راشن ان خرچوں نے تو میری کمر توڑ دی
ہے۔ سارا مہینہ ٹینشن میں گزرتا ہے۔ بابا جی! انور کی
تو ہے نہیں کر اگلے مہینے تجوہ کے آسرے ہاتھ روک
کر گزارہ کر لیں۔ بڑی پر شانی ہے، کوئی حل
ہتا یے۔ وظیفہ میری بیوی کرے گی۔

☆ بیٹے فضل الہی اب روز میں برکت کے لیے
بعد نماز عشاء سورہ واقہ پڑھنا بہت مبارک ہے۔
اس کے علاوہ ہر ہفتے کو بعد نماز جمعہ کچھ رقم ضرور
خیرات کرو۔ بھی بھی حالات بہت مشکل ہو جاتے
ہیں ایسے میں صبر اور مستقل مراجی سے معاملات کو

سے چھرے کی تازگی کے لیے دوام گکو لاو۔ انشاء اللہ
ضرور فائدہ ہو گا۔ سردیوں میں ویسے بھی جلد خراب
ہو جاتی ہے ایسے میں یہ دو ابہت فائدہ مند ہے۔

□ نواز۔ لاہور۔

5 بابا جی! میں اپنے مسلے کے لیے آپ کو یہ خط
لکھ رہا ہوں۔ اس سے پہلے بھی خط لکھا تھا مگر جواب
نہیں ملا۔ بابا جی! میں اپنی خالہ زاد بہن سے شادی
کرنا چاہتا ہوں گھر میرے گھر والے تیار نہیں، خاص
طور سے میرے والد اور بڑی بہن۔ وجہ یہ ہے کہ
میرے گھر والے چاہتے تھے کہ خالہ زاد بھائی سے
بہن کی شادی ہو جائے گھر میری پسند کو دیکھتے ہوئے
آن لوگوں نے بہن کا رشتہ رد کر دیا کہ یہ اولہ بدلہ
ہو جائے گا۔ مجھے وہ لوگ بھیشہ سے بہت پسند کرتے
ہیں، میں اس بات کو میرے گھر والوں نے اتنا کام سکتا ہے
لیا ہے۔ بابا جی! میں ایک ملی بیٹھل میں اچھی جا ب پر
ہوں اور بہت آرام سے شادی ہدہ زندگی کی ذیے
داریاں اٹھا سکتا ہوں۔ آپ مجھے ایسا تھویز دیں جس
کی بدولت یہ رکاوٹ دوڑ ہو جائے کیونکہ اب اس کی
پڑھائی بھی ملک ہو گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ایسا
لعویذ دیں جس کی برکت سے ہمارا رشتہ سب کی مریضی
اور رضا مندی سے طے پائے کیونکہ میں بڑوں کو
ناراض کر کے کوئی کام نہیں کرنا چاہتا۔ وظیفے کے لیے
معدرت چاہوں گا۔ اکٹھ مازیں قضا ہو جائی ہیں۔

☆ بیٹے نواز.....! اللہ تھیں خوش رکے۔ طاقت
رکھنے کے باوجود تم قدم اٹھانے سے کریاں ہوں
صرف اس لیے کہ بڑوں کو دھکنے پنج۔ اللہ تھیں اس کا
صل ضرور کامیابی کی صورت میں دے گا۔ بیٹے.....! تم

بلند فشار خون کے لیے دوا دستیاب ہے

دانوں کے جملہ امراض کے لیے اکثر داہم عمر اور ہر جنس کے افراد کے لیے دستیاب ہے، اپنا آرڈر پچی کہا جائے کے دفتر فون کر کے نوٹ کروائیں۔

سب سنبھالنا چاہیے۔ اللہ سے ضرور مد مانگتے رہو وہ
ضرور اپنا کرم فرمائے گا۔
بابا جی! آپ میراڑ کو بھج سکتے ہیں۔ خدا کے لیے ایسا
وظیفہ دیں جس کی برکت سے دونوں کو عقول آجائے
اور میرا بیٹا یوہی بچوں کے پاس لوٹ آئے۔
□ خالدہ۔ جہلم۔

5 بابا جی! میں آپ سے مستقل رابطے میں رہتی ہوں مگر کچھ حالات کی وجہ سے اس بار خط کالم میں
شائع کروانا چاہتی ہوں۔ میں نے پچھلے خط میں بھی
آپ کو لکھا تھا کہ میرے بیٹے بھوآپیں میں بہت
لڑتے ہیں، ہفتوں دونوں آپس میں بات نہیں
کرتے۔ بابا جی! اب تو حالات بہت غمین ہو گئے
ہیں۔ میرا بیٹا بہو دونوں ڈاکٹر ہیں اور C.M.H.
پنڈی میں ہوتے ہیں۔ مجھے بھوٹا ہی تھی کہ میرا بیٹا
آپ کی نریں میں دوپتی لینے لگا ہے جس کی وجہ سے
آن میں بھگڑے بہت بڑھ گئے ہیں۔ تین بچے ہیں
وہ اگر ہے سبھے رہتے ہیں۔ بابا جی! اقصو روں کا
ہے مگر بھوکا زیادہ ہے۔ مردوں اپنے پرست ہوتا ہے مگر
عورت کو مگر اور بچوں کی خاطر حکلنا جائیے وہ بات
ماننے کو تیار نہیں۔ پڑھی لکھی ہے خوش تھکل ہے بزرگ
تک اس نے اپنے شوہر کو منانے کی کوشش نہیں کی۔
میرا بیٹا کرناراض ہو جائے اور بات چیت بند کر دے
تو وہ بھی اس وقت تک بات نہیں کرتی جب تک بیٹا
خود سے بات نہ کرے۔ مجھے فون کر کے بتاتے
ہیں پھر میں درمیان میں پڑکر حس صفائی کرواتی ہوں
مگر بابا جی! ایسے کب تک چلے گا؟ میں کون سا ہمیشہ^{چلے گا}
رہوں گی؟ پچھلے سال اسی موسم میں میری طبیعت
خراپ ہوئی تھی اور میں 15 دن اسپتال میں رہی۔
جب مگر واپس آئی اور بچوں کو قسم دے کر حالات
پوچھتے تو بتا چلا، دونوں میاں بیوی ڈیڑھ مہینے سے

□ جہانی بیگم۔ خیر پور۔
5 بابا جی! میں بہت پریشان عورت ہوں۔ اللہ
نے سب کچھ دیا ہے مگر پھر بھی کوئی سنکھ میر نہیں۔

کی کوئی خدمت کر سکا تو یہ میری خوش نصیبی ہو گی۔

☆ بیٹھے رضوان.....! اللہ تمہارے حق میں بہتر فصلے فرمائے۔ اصل میں انسان جب درست سمت کو شش کرتا ہے تو ضرور کامیاب ہو جاتا ہے۔ تم نماز کی پابندی رکھنا اور بیٹھے.....! والدین کی بہت خدمت کرتا۔ انہوں نے تمہاری پروپریٹیز بہت محنت سے کی ہے۔ انہیں شکایت کا موقع ملت دینا۔ میری دعا میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں۔

□ نور جہاں۔ گجرات۔

☆ بیٹھی نور جہاں.....! اللہ تمہیں عقل سلیم عطا فرمائے۔ اپنے والدین پر بھروسہ رکھو وہ تمہارے لیے اچھا ہی سوچتے ہیں۔ خود جو فحصلہ کرو گی اُس میں دکھ اٹھاؤ گی۔ یاد رکھو جو فحصلہ تمہارے والدین سے تنفس کر سکتا ہے وہ تم سے بھی بھی فحصلہ نہیں ہو گا۔ اب بھی وقت ہے اپنے بڑھتے قدم روک لو ورنہ بہت پچھتا گی۔

□ ثمینہ۔ لاہور۔

☆ بیٹھی مہینہ! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی کے ساتھ ورد جاری رکھو۔ بیٹھی! میں پار بار ایک ہی بات کہتا ہوں کہ جو لوگ اپنے معاملات اللہ تعالیٰ کے پرداز کر دیتے ہیں اور مکمل یقین اور اعتقاد کے ساتھ ذخا کرتے ہیں وہ ضرور کامیاب ہو جاتے ہیں۔ خوش حالی میں اللہ تعالیٰ رب المعرفت کا ٹھکر آدا کرنا اور مشکل میں بھی صابر و شاکر رہنا ہی اصل مومن کی پیچان ہے۔ تم مجھے ایک ماہ بعد حالات سے مطلع کرو۔

□ مہناز۔ کراچی۔

☆ بیٹھی مہناز.....! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت یزھو۔ تم جس قدر جلد مکمن ہو، مجھ سے تعلیم مٹکا لو۔ تعلیم مٹکا نے کے لیے ضروری ہے کہ مجھے جوابی

میری 5 لڑکیاں ہیں اسے شادی کے قابل ہیں مگر کسی کا رشتہ نہیں آتا۔ پڑھی لمحی ہیں، قول صورت ہیں پھر بھی کوئی وسیلہ نہیں بنتا۔ بابا جی! میری راتوں کی نیند حرام ہو گئی ہے۔ بچپوں کے والدتوں میں نہیں۔ میں بھی نہیں رہتی تو ان کا کیا ہو گا؟ بس یہ سوچتی ہوں تو دل بند ہونے لگتا ہے۔ میں اردو لکھنیں سکتی۔ یہ خط کسی سے لکھوا رہی ہوں۔ آپ مجھے جلد از جلد جواب سے نوازیں بہت مہربانی ہو گی۔

☆ بیٹھی! اللہ تمہاری دعا جلد قبول فرمائے اور اولاد کی بے شمار خوشیاں دکھائے۔ بھی کسی لگتا ہے جیسے زندگی رک گئی ہے۔ سارے کام رک گئے ہیں مگر اصل میں ایسا ہوتا نہیں ہے۔ زندگی نام ہی حرکت کا ہے، چلتے رہنے کا ہے اور جب تک انسان زندہ ہے، اس کے کام بھی ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ایک ماں ہونے کے ناتے تمہاری پریشانی بجا ہے مگر بیٹھی! صرف ایک لمحے کے لیے سوچ قائم بچپوں کی ماں ہونے کی وجہ سے پریشان ہوتا وہ تو ستر ماڈل سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے۔ وہ بچپوں کے لیے بہترین اسباب پیدا کرے گا اور تم خود دیکھو گی۔ بس اس پاک ذات پر مطل بھروسہ رکھو۔ مجھے تعلیم مٹکا کر گھر میں رکھو۔ خوب صدقہ خیرات کیا کرو۔ مجھے حالات سے آ گاہ رکھو۔

□ رضوان۔ سقط۔

○ بابا جی.....! میں آپ کا بہت ٹھکر گزار ہوں کہ آپ تی دعاوں کی بدولت میں یہاں پہنچ گیا۔ میری انوری اچھی ہے۔ آپ کو خط لکھنے میں اس لیے دری ہوئی کہ کام یا تھا لہذا بالکل وقت نہیں مل رہا تھا۔ میں نیند بھی صرف 4 گھنٹے کی لینتا تھا مگر آپ اللہ کا ٹھکر سے پہلا ڈرافت گھر بھیجا تو اسی نے کہا کہ سب سے پہلے اللہ کا ٹھکر آدا کرو اور پھر بابا جی کو خط لکھو۔ بس بابا جی! اسی طرح دعاوں میں یاد رکھیے گا۔ میں آپ



قارئین کے نام کھلانے



محترم قارئین!

”مسئلہ یہ ہے“ کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ تجھی کہانیاں کے اوپر یہ شمارے سے یہ سلسلہ شامل اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ و نطاائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے ناصرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیات قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے مجرمے بھی دیکھے۔ ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے ذہنی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعہ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

انتئے برس بہت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب..... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرست، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔ مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دھکی انسانیت کی فلاح کے لیے..... آئیے اور اپنے بابا جی کا ساتھ دیجیے..... ٹرست میں اپنے عطیات جمع کرائے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دھکی بھائی بہنوں کا درمحسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم..... ٹرست میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

لفافے کے ہمراہ تفصیلی خط ارسال کرو۔
□ شاہد علیٰ آزاد کشیر۔

۵ مکرمت المقام واجاب الاحترام جتاب ببابا حی!
السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ میں نے پہلے بھی ایک عرض نامہ بھیجا تھا لیکن شاید وہ آپ کو موصول نہیں ہو سکا۔ ببابا حی! مسئلہ یہ ہے کہ میری والدہ محترم جن کی عمر تقریباً 58 برس ہے (اللہ تعالیٰ ان کی عمر دُراز کرے!) ان کی دائیں نانگ اور دا میں باڑو میں بلکا بہکا درد رہتا ہے۔ یہ صورت حال عرصہ میں سال سے ہے اور ساتھ ہی گرفتار میں بھی درد رہتا ہے۔ اس کے علاوہ کافی عرصے سے با میں نقصہ سے لکیر پھوٹی رہتی ہے اور اس کے علاوہ اکثر آوقات دم گھشت سا جاتا ہے اور گہرے گہرے سانس لئتی ہیں اور سر میں بھی کھنچا اور درد سار رہتا ہے۔ کنی ڈاکٹروں سے مشورہ کیا۔ سب کا بھی کہنا ہے کہ یہ مجموعی طور جسمانی کمزوری ہے اور اس۔ ببابا حی! ہم غریب لوگ ہیں جو کچھ بن پڑتا ہے، ان کے لیے اچھی غذا وغیرہ لیتے ہیں لیکن مسئلہ حل نہیں ہو رہا اس لیے آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں یقیناً اللہ کے کلام میں بہت فضیل ہے اور آپ کی دعاؤں سے مسئلہ حل ہو جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ! ببابا حی! میری ایک نوجوان بہن اور جوان العمر ماموں یکے بعد دیگرے وفات پائے ہیں۔ والدہ کو ان کا بھی بہت صدمہ رہتا ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں اور ہمیں کوئی ایسا مغل بتائیں جس سے میری والدہ صحت یاب ہو جائیں۔ ہم تا عمر آپ کو دعا میں دیں گے۔

☆ بیٹے شاہد! اللہ تمہاری والدہ کو مکمل صحت عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ ہر نماز کے بعد احمد شریف اور چاروں قلن پڑھ کر والدہ پر ضرور دم کیا کرو۔ اللہ سے دعا کرو کہ

جو ان کے حق میں بہتر ہو وہ فرمائے۔ حسب استقامت صدقۃ خیرات بھی دیا کرو۔ انشاء اللہ کو مکمل صحت عطا ہو گئی۔

□ شاہدہ گل۔ بدین۔
۵ مکرمت ببابا حی! السلام علیکم! ببابا حی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری شادی کو دس سال ہو گئے ہیں اور میری صرف ایک بیٹی ہے۔ ڈاکٹروں سے چیک اپ کے بعد پتا چلا ہے کہ کچھ اندر وہی مسائل کے باعث مزید بچھ نہیں ہو رہے۔ پلیٹ، ببابا حی! مجھے کوئی وظیفہ بتائیں تاکہ میری اولاد ہو سکے اور وہ بھی اولاد نہیں یعنی کہ بیٹا کیونکہ میرے شوہر پہلے سے شادی ہدھے ہیں اور میرے لیے بہت سے مسئلہ ہیں۔ پلیٹ، میرے اس خطکا جواب جلد از جلد دیں۔

☆ بیٹی شاہدہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ اولاد کے لیے میں تحویل دیتا ہوں، ہدیہ اور تفصیل جوابی لفافہ ارسال کرو تو بتائی جائے گی۔

□ شاہین۔ سیالکوٹ۔
☆ بیٹی شاہین! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹی! ایسا نہیں ہوتا ہے کہ آج کوئی کام شروع کیا اور وہ فوراً ہی کامیابی کی طرف بڑھنا شروع ہو جائے۔ کچھ وقت بلکہ بعض اوقات کافی وقت درکار ہوتا ہے لہذا استقل مزاجی سے کام کرنا چاہیے۔ تم ہر نماز کے بعد سورہ مریم، آیت 7، 99-99 پار پڑھو اور دعا کرو۔ مت 41 دن ہے۔ کچھ نہ کھروم ضرور خیرات کیا کرو۔ انشاء اللہ ضرور دم ہو گا۔

□ شیر علی۔ نامعلوم مقام۔
۵ السلام علیکم! میرا نامہ علی شیر ہے عمر 30 سال ہے۔ آپ کو پہلے بھی ایک خط لکھا تھا مسئلے کے لیے وہ آپ نے اگست کے شمارے میں شائع کیا ہے۔

میں نے مسلسل کا لکھا تھا کہ میری بیوی سے انجانے
میں زنا ہوا ہے وہ اس پر بہت نادم ہے اور دوسرا
میری بیوی پر الراہم لگا ہے کہ اس کے اپنے بھائیجے
سے ناجائز تعلقات ہیں۔ بابا جی! میں اپنی بیوی کو
جاہتا ہوں، وہ اپنے بھائیجے کو بیٹے کی طرح چاہتی
ہے۔ بھائیجے کی عمر 24 سال ہے۔ میری بیوی کی عمر
26 سال ہے۔ آپ نے کوئی وظیفہ نہیں بتایا جس
سے میری بیوی کو اور مجھے سکون مل جائے۔ بابا جی!
آپ کو علم ہے کہ خراب کردار کی عورت بھی بھی اپنے
شوہر کو زنا کے بارے میں نہیں بتاتی مگر میری بیوی
نے مجھے یہ بات بتائی کہ میں بہت نادم ہوں۔ مجھے
کوئی وظیفہ بتا دیں جس سے دل کو سکون مل جائے۔
بابا جی! میری بیوی میں ایک عادت لڑکوں والی ہے
جہاں پر لڑکوں کی محفل ہوگی وہ عورتوں والی محفل
چھوڑ کر لڑکوں والی محفل میں جائیشے گی۔ میں نے کتنی

علاج اور مکمل شفاء

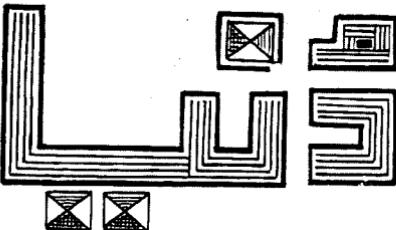
میرے عزیز دا!

اللہ تعالیٰ! سب کو اپنی امان میں رکھے۔

- ☆ اگر آپ اپنے جسم کے اندر ورنی اور بیرونی رخموں کا مکمل علاج چاہتے ہیں۔
- ☆ اگر آپ بالوں کی بیماریوں، سکری اور بال خورے سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔
- ☆ اگر آپ دانتوں کی گوناگون تکالیف میں بستا ہیں۔
- ☆ اگر آپ موٹاپے حصی موزی کی بیماری کا شکار ہیں۔

آپ سب کے لیے خوش خبری ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے ان تمام عوارض کا مکمل علاج اور دوائیں موجود ہیں۔ ان شاء اللہ شفایہ ہوگی۔ علاج معالجے اور دواؤں کی طلب کے لیے جو ای لفافے کے ساتھ اپنا مسئلہ تحریر کریں۔

میں کس جگہ



سچی کہانیاں کے حیر پریس

اس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے صنفیں پیشہ درکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتنے دیکھتے محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں سبول کرنے والے ہیں۔

یہ وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد راجحہ ہے۔ "سچی کہانیاں" میں آپ بتیاں جگہ بتیاں اعزاز اٹھ برم دسترا کی کہانیاں، مقابل تین کہانیاں، دلچسپ سنتی فیلمیں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین دمیر کے درمیان دلچسپ نزک جھوٹکا احوال۔ سب کچھ جونز نگیں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا۔ اپنی نوعیت کا واحد حیریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں، پرل پبلی کیشنز : II-88-C فرست فلور۔ خیابان جائی کرشل
ڈیفنس ہاؤسنگ اکھاری۔ فیر-7، کراچی فون نمبر: 021-35893121-35893122
ای میل : pearlpublications@hotmail.com

اس بیوں گائیڈ میں مختلف ممالک کے بارے میں دلچسپ معلومات فراہم کی جاتی ہیں

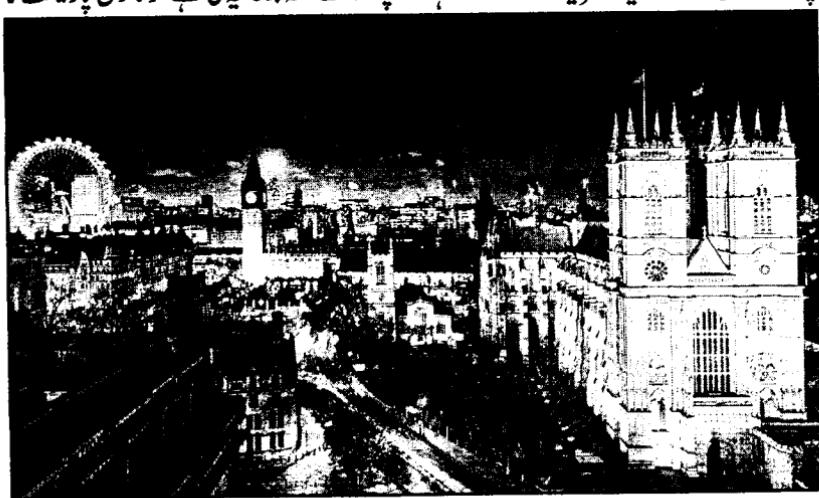
ملکہ برطانیہ کی سفری

ایک ایسے سفر کی واسitan جس نے میری زندگی بدل دی

دیس دیس گھومیے

زین شی

آج ملکہ کے ملک برطانیہ کے بارے میں کچھ ملکت ہے ایک طرف آئر لینڈ، اسکاٹ لینڈ اور خاص باتیں آپ سے شیئر کرنی ہیں۔ بہت سے دوسری جانب انگلستان اور ولیز واقع ہیں۔ انگلستان پڑھنے والوں نے برطانیہ کا سفر کیا ہو گا مگر ہو سکتا ہے پر حکومت ملکہ برطانیہ کی ہے مگر قانون پارلیمنٹ کا



کہ وہ ان باتوں سے واقف نہ ہوں تو چلیں کچھ چلتا ہے۔ یہ دنیا کی گیا رہوں سب سے بڑی جمہوری ملکت ہے۔ برطانیہ کا دارالخلافہ لندن ہے انگلستان یا انگلستان دراصل چار ملکوں پر محیط

معلومات میں اضافہ ہو جائے۔

چونچی بڑی مملکت ہے۔ یہاں تقریباً ہر نہ ہب کے لوگ موجود ہیں جس میں سب سے بڑی آبادی عیسائیوں کی ہے۔ مسلمان کل آبادی کا 4 فیصد ہیں کل آبادی 64 ملین ہے۔ سرکاری زبان انگریزی سے اور ریجنل زبان کوئنچ ہے۔ برطانیہ کے ایگریشن کے قوانین بہت سخت ہیں گرد و نیا بھر سے لوگ برطانیہ کانے کے لیے جاتے ہیں۔ برطانیہ ویلفیر اسٹیٹ ہے اور یہ اپنے شہریوں کے حقوق کا بہت خیال رکھنے والی مملکت ہے۔ دنیا کی پانچ بیس مشہور انگلش شاعروں میں وڈورڈ ز کا شہر ہے موسم غیر



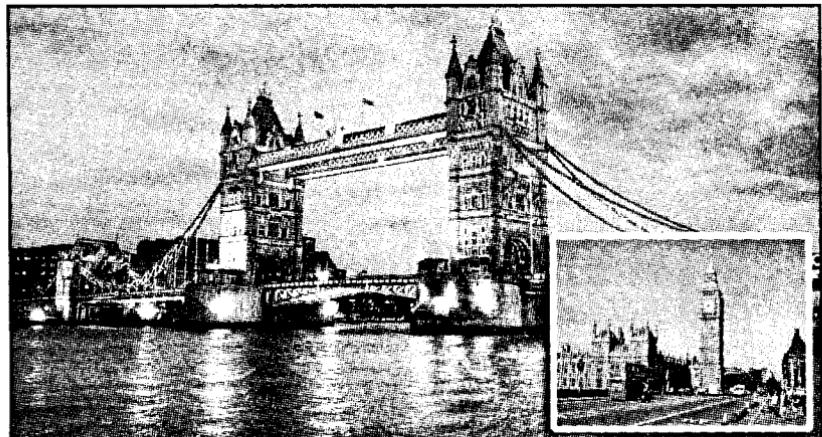
لیفین ہے اچاک رم جھم بھی ہو سکتی ہے اور سورج بھی نکل سکتا ہے۔ انگلستان کی تاریخ کیونکہ بہت پرانی ہے لہذا کچھ معاشی مشکلات ہیں۔ میکسر میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ماچھڑہ شہر ہے جہاں ہر جگہ پاکستانی، بھارتی اور چینی نظر آتے ہیں۔ یہاں تمام تر پاکستانی کھانے دستیاب ہیں۔ کار و بار بھی زیادہ تر پاکستانیوں کے پاس ہی ہے۔ موسم شدید ہے اور موسم گرم اصراف دو ماہ رہتا ہے۔ تعلیمی نظام بہترین ہے۔ قائد اعظم علامہ اقبال، لیاقت علی خان یہ سب انگلستان کے ٹوروں کو کچی بات تو یہ ہے کہ جو ایک بار اس سر زمین پر قدم رکھ دیتا ہے واپس نہیں آنا چاہتا۔

بڑی معیشت ہے۔ کرنی پاؤ نڈا اسٹرینگ کہلاتی ہے۔ حال ہی میں برطانیہ یورپی یونین سے باہر آیا ہے لہذا کچھ معاشی مشکلات ہیں۔ میکسر میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ماچھڑہ شہر ہے جہاں ہر جگہ پاکستانی، بھارتی اور چینی نظر آتے ہیں۔ یہاں تمام تر پاکستانی کھانے دستیاب ہیں۔ کار و بار بھی زیادہ تر پاکستانیوں کے پاس ہی ہے۔ موسم شدید ہے اور موسم گرم اصراف دو ماہ رہتا ہے۔ تعلیمی نظام بہترین ہے۔ قائد اعظم علامہ اقبال، لیاقت علی خان یہ سب یونیورسیٹیوں آ کسغورڈ اور کمرج یہاں واقع ہیں۔

سین شہزادی سے واقف نہیں..... لیڈی ڈیانا کی ذاتی زندگی جو بھی ہو گر انہوں نے کوٹھ کے مرضیوں اور لینڈ ماٹریز میں معذور ہونے والے لوگوں کے لیے بہت کام کیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی لوگ ان کی تصویریں کچھ کڑھنک جاتے ہیں اُن کا نام سن کر خپھر جاتے ہیں۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ برطانیہ بھی اللہ کی زمین پر

مختلف کھیلوں سے برطانیہ کے لوگ بہت شغف رکھتے ہیں Wembly استیڈیم دنیا کا بہنگاترین استیڈیم ہے۔ فہل، ٹیشن، رنگی، کرکٹ اور گالف بہت پسند کئے جاتے ہیں۔ نیٹ انڈریوز دنیا کا خوبصورت ترین گالف کلب ہے۔ تو جناب یہ بات ثابت ہوئی کہ کامیاب قوموں کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنا کچھ وقت کھیلوں کیلئے بھی منصخر کریں۔ جسمانی اور



وقع ایک ملک ہے بالکل ایسے ہی جیسے ہمارا پاکستان، مگر انگلستان کو گریٹ برٹن بنا یا قانون کی پاسداری نے، آج بھی پولیس والا صرف ایک ڈنڈا کے چلتا ہے۔ ہماری طرح بھاری بھرم ہتھیار نہیں..... وجہ صرف قانون پر عمل داری ہے جو وہاں کی حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ جہاں قانون ہوتا ہے وہاں سب کچھ ہوتا ہے۔ امن و امان ہوتا تو میں ترقی کرتی ہیں اور جہاں لا قانون ہے وہاں ہر دن کی ابتداء بری خبر سے ہی ہوتی ہے۔

آخر میں بس صرف پہ دعا ہے کہ میرے اللہ میرے پاکستان کو بھی بری نظر اور بری نظر والوں سے محفوظ رکھنا اور ہمارا شمار بھی ان قوموں میں ہو جو اپنی تاریخ خود بناتی ہیں۔

☆☆.....☆☆

ہم لوگ اس نعمت سے کافی حد تک محروم ہیں۔

یہ بات میں آج تک سمجھ نہیں پایا کہ شیکسپیر برطانیہ کی پہچان ہیں یا برطانیہ شیکسپیر کی بہرحال اس قد آور رائٹر کا تعلق بھی اسی سر زمین سے ہے اور صرف یہی نہیں جاریج ایلیٹ، جان ملن، تھامس مور، جین آئش، چارچ ڈگنز، گرامنگرین، اے اے ملن، اتھجی ویلز وغیرہ وغیرہ بہت لئی فہرست ہے دنیا کے مشہور ترین رائٹر اور شاعر اسی سر زمین سے ابھرے۔ Big ben، برمنگھم پیلس اور Beetles مشہور نامہ بینڈ شایر ہی کوئی ہو جاؤ آج بھی اُن سے واقفیت نہ رکھتا ہو۔ الفریڈ ہچکل فلم میکر، چارلی چپلن، رچرڈ برٹن، سین کونزی، کیٹ نسلیٹ، انھوں ہا بیزیز وغیرہ..... اور لیڈی ڈیانا..... کون اس

دُو شیزِ ڈا جسٹ میں اشتہار کیوں دیا جائے؟

- پاکستان کا یہ واحد رسانہ ہے جس کا گزشتہ پینتالیس برس سے چار نسلیں مسلسل مطالعہ کر رہی ہیں۔
 - اس لیے کہ جریدے میں شائع ہونے والے اشتہارات پر قارئین بھرپور اعتماد کرتے ہیں۔
 - اس میں غیر معیاری اشتہار شائع نہیں کیے جاتے۔
 - پوری دنیا میں چھلیے اس کے لاکھوں قارئین متوسط اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، جو مستند اور معیاری مصنوعات کی خریداری کو ترجیح دیتے ہیں۔
 - اس لیے کہ دو شیزِ ڈا جسٹ کو گھر کا ہر فرد یکساں لجپی سے پڑھتا ہے۔
 - جریدے کے ہر شمارے کو قارئین سنبھال کر رکھتے ہیں۔
 - اس جریدے کے بڑی تعداد میں مستقل خریدار ہیں، جو اندر وون اور بیرون ملک پھیلے ہوئے ہیں۔
 - آپ کی مصنوعات کے اشتہار با کفایت ان تک پہنچ سکتے ہیں۔
 - جریدے کی اعلیٰ معیار کی چھپائی آپ کے اشتہار کی خوب صورتی میں اضافہ کرتی ہے۔
- شعبہ اشتہارات: دُو شیزِ ڈا جسٹ

88-C فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔ ڈیپس باؤ سنگ اخترانی۔ نیز-7، کراچی

فون نمبر: 021-35893121 - 35893122

معروف شعراء کے جمیونہ کلام پر سیر حاصل تبرے

ڈاکٹر صفر ا صدف کا تخلیقی وجدان

اُن کے ہاں روحِ عصر کی بھر پور ترجمانی ملتی ہے

شیر ناقد

تخلیق، تخلیہ اور تخلیل سے عبارت ہے اور تخلیل میں بھی شرکت کرتی ہیں۔ اُن کے ہاں رومانوی افکار بھی کثرت سے کو خیال سے نسبت ہے فنِ شاعری میں جس شاعر یا شاعرہ کے ہاں افکار میں جس قدر وفور اور تنوع پایا جاتا ہے اس کا تخلیقی وجدان بھی اس قدر بسیط و سیقیق ہوتا ہے، اکثر و پیشتر شاعرات کے احاسات چند مخصوص شکم کے موضوعات کے گرد گھومتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے اُن کے ہاں فکری وسعت کا اہتمام نہیں ہو پاتا کسی کے آدراش کی وسعت کا اندازہ اُس کے موضوعات سے لگایا جاتا ہے شذرہ ہذا میں ڈاکٹر صفر ا صدف کے شعری مجموعہ ' وعدہ' کے ریبع اول کے منتخب غزلیہ اشعار میں سے اُن کے تخلیقی وجدان کی صراحة کرتے ہیں ڈاکٹر صفر ا صدف کا تعلق لاہور سے ہے 'وجدان' نامی ادبی جریدے کی ادارت بھی کرتی رہی ہیں اس کے علاوہ شام و سحر، ارٹ گ اور دیگر متعدد ادبی جرائد میں بھی ان کا کلام تو اتر سے چھپتا رہتا ہے میں الاقوامی طور پر مشاعروں کرتی ہیں، عمومیت اُن کے کلام کا طرہ امتیاز ہے اس دھرت آرزو میں بکھرنے تو دے مجھے اعلان و حشوں کا وہ کرنے تو دے مجھے یہ میرا مسئلہ ہے کہ کیسے کروں قیام؟ پہلے وہ اپنے دل میں اترنے تو دے مجھے دیکھئے تو ایک بار مجھے وہ بھی پیار سے تکمیل اپنی ذات کی کرنے تو دے مجھے قطرے سے میں بنوں گی سمندر مگر صدف یہ شرط ہے وہ جاں سے گزرنے تو دے مجھے وہ عمومی احاسات کو مخصوص شعری پیر، ہن عطا کرتی ہیں، عمومیت اُن کے کلام کا طرہ امتیاز ہے

ان کے شعور کی کئی پر تین ہیں، کئی پہلو ہیں جو تمہارے
تہہ مکھلے چلے جاتے ہیں رومان ان کے کلام کا
مستقل حوالہ ہے، رومان نگاری کی ذمیں میں ان کی
غزل کے دعا شعار دیکھتے ہیں۔

نقسان تیرے دھیان میں اکثر ہوا مرا
ہاتھوں سے گر کے ٹوٹ گیا آئینہ مرا
وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ میں خوش ہوں اس کے ساتھ
واقف نہیں ہے درد سے درد آشنا مرا

ان کے ہاں عشق کی تباہ کاریوں کا بیان بھی
ہے اور آرزوؤں کا کرب بھی ہے حرتوں کا ماتم
بھی ہے ان کے علاوہ ان کے ہاں رجائی حوالے
بھی ملتے ہیں حالات جیسے بھی ہوں امید کی کرن
زندگی کرنے کا ولوہ بخشت ہے اسی نسبت سے ان
کی غزل کے تین اشعار دیدی ہیں۔

جیسے نہیں دیا مجھے مرنے نہیں دیا
کوئی بھی کام عشق نے کرنے نہیں دیا
میری ہتھیلوں پر بھی سورج تھے بے شمار
لیکن انہیں کسی نے ابھرنے نہیں دیا
میرے لیے تو زندگی جنگل کی رات ہے
پر اس کی یاد نے تو ڈرنے نہیں دیا
متعدد شعری مجموعوں کی خالق اور میں
الاقوامی مشاعروں میں شرکت کرنے والی یہ
شاعرہ پہنچا شعری اوصاف کی حالت ہے میں
السطور کا نی دلچسپ کیفیات کے اشعار رو دل پر
دستک دینے لگتے ہیں قاری پر ان کے خلائقی
رجحانات کہرے اڑاثت چھوڑتے ہیں ایسے سخنور
بساط فکر و فن میں لا اُن اکرام ہوا کرتے ہیں۔

☆☆.....☆☆

مقتل بنا ہوا ہے مرا شہر ان دنوں
اب راہ سوجھتی نہیں کوئی نجات کی
سانیں ہیں زخم زخم موسم ہیں بے ردا
دھرا رہا ہے وقت کہاںی فرات کی
پہلے قدم پر بھاروں کا راج تھا
اب خون میں نہایت ہے وادی سوات کی
صحنِ وطن میں ایسا اندھیرا بکھر گیا
دن کا شعور مجھ کو نہ پیچان رات کی
بے خواب موسوں میں لٹا تا قافلہ مرا
اپنے ہی لکھ رہے تھے کہاںی یہ مات کی
خالیات کا مسمی ہوتا کسی اعجازِ سیحائی سے کم
نہیں اور خلیل کی نادرہ کاری اس سے بڑھ کر اور کیا
ہو سکتی ہے، شعر کی ایک بہت بڑی خوبی اس کی پہلو
داری بھی ہوا کرتی ہے کہ وہ معرفت و مجاز کے

چہاں کی ریت سفید رنگت کی ہے

زندگی تو جنگل ہو گئی ہے صاحب میرزا!

کرشن چندر نے افسانہ پانی کا درخت
شاید انہی نمک کے مزدو روں پر لکھا تھا

آخر حفظ

کسی ریگستان سے اگر بارش روٹھ جائے تو میں پانی والے علاقوں کا رخ کرتے ہیں اور اپنے برسوں تک وہاں زندگی کے آثار دکھائی نہیں دیتے، ساتھ اپنے پا التوجا نور بھی لے جاتے ہیں اور پھر جیسے



اور ریگستان میں پانی کے بنا زندگی کوئی منی نہیں
ہی قدرت مہربان ہوتی ہے اور بادل برستے ہیں تو
رہتی۔ چنانچہ ریت پر جینے والے یوگ قحط کی صورت
بے جان ریت میں گھاس اگتے ہی زندگی لوٹ آتی

میں جب جھیل میں اتراتو اس وقت مردوار پسے کام میں مصروف تھے کہیں نمک گھوڑ کر نکلا جا رہا تھا کہیں اسے خٹک کرنے کے لیے جمع کیا جا رہا تھا تو کہیں بوریوں میں بند کیا جا رہا تھا۔ ایک جانب میرے چاروں اطراف ریت کے بڑے بڑے ٹیلے تھے جو جھیل میں نمک کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے جن کی سفیدی آنکھوں کو بھاری تھی۔ نمک کی جھیل میں پاؤں رکھتے ہی مجھے اس بادشاہ کی وہ لوک داستان یاد آگئی جو اپنی سات بیٹیوں سے ان کے پیار کی آزمائش لیتا ہے۔

جب وہ سوال کرتا ہے کہ اس کی بیٹیاں اس سے کتنا پاکرتی ہیں تو کوئی کہتی کہ بادشاہ شہد جتنا میٹھا ہے کوئی کہتی ہے کہ مصری جتنا میٹھا ہے تو کوئی یہ کہ کر پیار کا اظہار کرتی ہے کہ بادشاہ گز جتنا میٹھا ہے وہ نمک جتنا سب سے چھوٹی بیٹی اس سے کہتی ہے وہ نمک جتنا میٹھا ہے جس کے بعد بادشاہ غصے میں آ کر اسے محل بدر کر دیتا ہے۔ حالات کاما بادشاہ ایک دن اسی بیٹی کے دروازے پر پہنچ جاتا ہے۔ تب اسے احساں ہوتا ہے کہ نمک جیسا میٹھا ہونے کا مطلب کیا ہے اور نمک کی اہمیت کیا ہوتی ہے۔ اسی لوک کہانی کو شیکھیزیر نے ”کنگ لیزز کے نام سے لکھا جو کہ شیکھیزیر کے مقبول ترین ڈراموں میں سے ایک ہے۔

ہے۔ درختوں کی شاخوں پر پنی کوٹلیں پھوٹے گئی ہیں پرندے چھاتے ہیں ریت کے نیلے اور خالی میدان گھاس اور پودوں کی بیز چادر اوڑھ کر کئی آنکھوں کو اس بات کا غام دیتے ہیں کہ جانے والے لوٹ آئے ہیں۔ ضلع سانکھر کے علاقے ”اچھڑو تھر“ (غزر) کی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ اسے اچھڑو تھر اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہاں کی ریت سفید رنگت کی ہے۔

بیہاں ہر طرف ریت ہے مگر ریت کے میلوں کے دامن میں چند ایسی بھی جھیلیں ہیں جہاں سے نمک نکلتا ہے۔ ہوا چلتی ہے تو ریتلے میدان کی سطح سے ریت اس طرح اڑتی ہے جیسے کوئی ساپ ریگ رہا ہو۔ میں جھیل کی جانب گیا تھا، اسے نمک والی جھیل کہا جاتا ہے مگر اس کا نام ایک نبُر جھیل بھی ہے۔ جھیل آٹھا بیکٹ نمک پھیل ہوئی ہے۔ اس جھیل میں قدم رکھتے ہی ایک عجیب سا احساس ہونے لگا۔ کہیں پانی تھا کہیں نمک کے ذرات، کہیں خنث فرش تو کہیں ٹھلل کی طرح زی محسوس ہوئی۔ دور سے ایسا لگا کہ سر دیوں کی وجہ سے جھیل کا پانی براف بن کر جم گیا ہے۔ مگر قریب جانے پر معلوم ہوا کہ جسے ہم براف سمجھ رہے تھے وہ نمک کی خنث طرح تھی ان ریت کے میلوں کے دامن میں ایسی آٹھ جھیلیں ہیں



اچھڑو تھر میں پانی کی کمی جھیلیں اور بہاؤ ہیں مگر جہاں جہاں موسم ہے وہاں کی زمین نمک پیدا کرنے

جن سے نمک نکلا جاتا ہے وہی نمک جس کے بغیر ہمارے تمام لذتی کھانے ادھورے ہیں۔

میں کافی بہتر ہے۔ بارشیں پڑنے کے بعد یہ جھیلیں پانی سے بھر جاتی ہیں اور نمک میں سطح سے مل کر بارشوں کا پانی اور بھی زیادہ نمک پیدا کرتا ہے۔ ایک صورت میں اسی جھیل اور سورج کی کرنیں اس کا پانی جذب کرتی رہتی ہیں جس کے بعد پانی کو نمک بننے میں دینہیں لگتی۔

آچر کو لئی جھیل پر کام کرنے والا ایک ایسا مزدوروں ہے جسے بس اتنا پتہ ہے کہ اس کے مقدار میں بس نمک نکالنا اور نمک صاف کرنا ہے۔ پہلے پہلے وہاں پر میری ملاقات اسی سے ہی ہوتی تھی۔ اس کے پانچھوں ناگوں اور بازوؤں پر نمک کی تہہ جبی ہوتی تھی۔ اگر میں اسے کھرچتا تو اس کے جسم سے شاید صرف نمک ہی نکلتا۔ میں نے جب اس کے پیروں کی جانب دیکھا تو مجھے چند بزرگ کے نشانات نظر آئے۔

” یہ آپ کے پیروں کو کیا ہوا ہے، کیا لگا رکھا ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

” صاحب یہ صدم بونڈ لگا ہے میرے پاؤں میں اسی جھیل میں کام ترکتے کرتے زخم ہو جاتے ہیں تو میں صدم بونڈ لگایتا ہوں، کوئی اور چیز نمک میں نمک نہیں سکتی، صدم بونڈ لگانے کے بعد پانی زخموں کے اندر نہیں جاسکتا اور پھر کام کرنے میں وقت نہیں ہوتی۔“ وہ سوال کا جواب دینے کے بعد مجھے جھیل کے اوپر اندر لے گیا۔

” مگر یہ تو کوئی علاج نہ ہوا، صدم بونڈ نہ تو کوئی دوا ہے اور نہ یہ مرہم۔“

” وہ آپ کے لیے نہیں ہوتا ہوگا۔ ایک نمک مزدوروں کو یہاں دوا اور مرہم نہیں ملے، بس تم اپنے زخموں کو اس نمک والے پانی سے پچالیں بیسی بہت ہے۔“ وہ مجھے نمک کے ڈھیر کی جانب لے گیا جہاں اسے بوریوں میں بند کیا جا رہا تھا۔ آچر بچپن سے اس

” کون سا اور کام؟ میرا باب بھی اسی جھیل میں نمک صاف کرتا تھا، میں بھی نہیں کھو دتا ہوں،“ شاید میرے بیٹے کے حصے میں بھی یہی کام آئے گا، اپنی زندگی تو نمک ہو گئی ہے صاحب۔“

اس کی آنکھوں میں مایوسی ظاہر ہو رہی تھی اور آواز بکلی ہو گئی۔ میرے چہار سو نمک ہی نمک تھا۔ مگر نمک تو آچر کی آنسوؤں کے پانی میں بھی ہو گا جو شاید اس نے میرے سامنے اس لیے نہیں بھائے تھے کہ وہ اپنے آپ کو کمزور نہیں دکھانا چاہتا تھا۔

جھیل میں نمک کا کام سارا سال جاری رہتا ہے۔ یہ نمک سارے ملک میں بیجھا جاتا ہے جہاں اسے اور بھی بہتر کیا جاتا ہے مگر کوئی نمک کا ٹھیکیدار آچر جسے مزدوروں کی اجرت بڑھانے کو تیار نہیں۔ آچر کا گھر بھی اسی جھیل کے کنارے ہے جہاں وہ اپنے بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ گھر کیا ہے، ایک دو جھونپڑیاں، جہاں پینے کا پانی بھی میراث نہیں ہے پانی

لانے کے لیے بھی انہیں ہرن کی طرح اس صورت میں
بھکننا پڑتا ہے۔

جھیل کی سطح کو غور سے دیکھنے کے بعد کسی مقام
پر ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے سطح پر شریانیں ابھر آئی ہوں
اور نمک ان شریانوں میں خون کی مانند بہرہ رہا ہو۔
آچ بھی سے بات چیت کرتے وقت بھی اپنے کام
میں مصروف عمل تھا۔ میرے لیے نمک کی سخت سخ پر
چنان مشکل تھا۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ آچ کے
زمخ کیسے ہوں گے جن کے لیے کوئی مرہم بھی مستحب
نہیں ہے۔ اور جب اس جھیل میں کام کرنے والے
مزدور کے پیروں میں زخم بن جائیں تو نمک والا پانی
گوشت کو گلانے میں درینہیں کرتا۔

میں جب تک وہاں تھا ہر ایک کو اپنے کام میں
مصطفی دیکھا۔ ہر ایک کو اس بات کی فکر تھی کہ اگر
آج کام پورا نہ ہوا تو مزدوری نہیں ملے گی۔ آچ کو لوٹی
کو بھی یہ فکر تھی کیونکہ پاس ہی اس کی جھونپڑی میں
اس کے پنجے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ نمک کی
بوریاں تیار کرنے کے بعد انہیں مڑکوں کے ذریعے
ملک کے دیگر شہروں میں بھیجا جاتا تھا اور اسی طرح
ایک دن کام تمام ہوتا ہے۔ دوسرا یعنی آچ جیسے کئی
مزدور پھر نمک کی جھیل میں اتر کر نمک بن جاتے
ہیں۔

اردو کے عظیم افسانہ نگار کرشن چندر نے افسانہ
‘پانی کا درخت’ شاید انہی نمک کے مزدوروں پر لکھا
تھا جو نمک کا کام کرتے کرتے نمک بن جاتے ہیں۔
جس میں بانو کی محبت روتی ہے کیونکہ محبت صرف
نمک ہی نہیں تھوڑا سا میٹھا پانی بھی جاہتی ہے۔ ان
مزدوروں کی زندگی کو دیکھ کر لگا کہ ان کی زندگی میں
بُن نمک کا ذات اقہمی رہ گیا ہے۔ ان کی انکھوں میں
خوشی کی جھلک نظر ہیں آتی اور ایسا لگتا ہے کہ ان کی
بے بُسی نے انہیں خوشیوں کے ذائقوں سے محروم



کر دیا ہے۔ میں جھیل کو دیکھتا ہا اور مجھے بُس کرشن
چندر کی کہانی کا ایک اقتباس یاد آنے لگا جس میں
انہوں نے لکھا تھا۔

”میرے دل کے اندر نمک کے کتنے بڑے
ڈلے اکٹھے ہو گئے تھے۔ میرے دل کے اندر نمک کی
ایک پوری کان موجود تھی۔ نمک کی دیواریں ستون
غار اور گھر اپنی کی ایک پوری جھیل۔ میرے دل
و دماغ اور احساسات پر نمک کی ایک پتلی سی جھلی
چڑھنگی تھی اور مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اگر میں اپنے
جسم کو کہیں سے بھی کھرچوں گا تو آنہ سوڑھل کر بہہ
لکھیں گے اس لیے میں چپ چاپ بیمار ہا۔“
☆☆.....☆☆

ان خاص لوگوں کی گہانیاں اور باتیں جن کے کام نے زمانے پر اپنے اثرات مرتب کیے

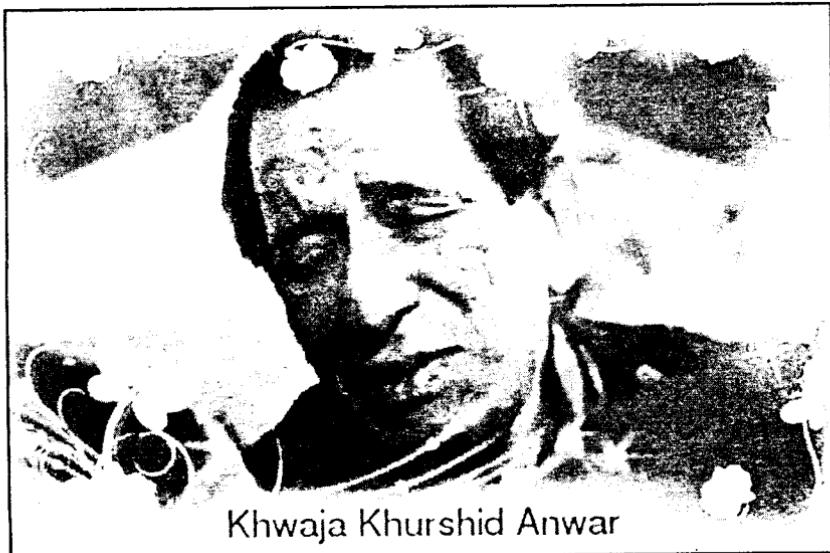
عظمی موسیقار

خواجہ خورشید انور

خواجہ صاحب کا علمی مطالعہ اور مشاہدہ بہت وسیع تھا

اے۔ آئی۔ رشیدی

سرز میں پنجاب نے یوں تو تمام شعبہ ہائے انبساط بھی..... عظیم موسیقار خواجہ خورشید انور حیات ہی میں نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں پنجاب کے ایک معزز (کشیری برادری)



Khwaja Khurshid Anwar

لیکن فلم و فن میں اس خطہ زمین کی کنشی یوں گھرائی کا یہ چشم و چراغ بھی بر صغیر اور پھر خصوصاً بلا ریب دگمان قابل قدر بھی ہے اور باعث تحریر پاکستانی فلمی صنعت کی ایک عظیم المرتبت اور

حیدر رکھا جو اپنے استاد مکرم ماشر غلام حیدر سے ان کی گہری والہان عقیدت و محبت کی ایک دلیل ہے اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ فن کسی کی میراث نہیں ہوتا خواجہ خورشید انور کے والد خواجہ فیروز الدین لاہور کے معروف وکیل تھے۔ پھر ان کے دو بھائیوں خواجہ سلطان اور خواجہ افضل کا شمار بھی شہر کے مقبول وکلاء میں ہوتا تھا۔

زمانہ طالب علمی میں خواجہ خورشید انور اور فیض احمد فیض ہم عمر بھی تھے اور دوست بھی۔

باکمال شخصیت کی حیثیت سے اپنی فنی عظمتوں کے ان منٹ نقش چھوڑ کر اس جہان رنگ و بوئے رخصت ہو گیا۔

نگیت سے تعلق رکھنے والے کبی گھر انوں میں اس قسم کے لوگوں کے لیے ایک اصطلاح عطاً استعمال ہوتی ہے جو محض ذاتی لگن اور شوق پھر اپنی جہد مسلسل سے شہرت و مقبولیت سے ہمکنار ہوتے ہیں اور اہل فن میں اپنا ایک مقام بنانے کا واجب الاحترام ہو جاتے ہیں، ثان بڑی

IMMORTAL MELODIES OF KHWAJA KHURSHID ANWAR

VOL.-1

- ♪ JIS DIN SE PIYA DIL LE GAYE
- ♪ CHAND HANSE DUNIYA BASEY
- ♪ AA GAYE GHAR AA GAYE
- ♪ O JANE WALE RE
- ♪ AA BHI JA AA BHI JA
- ♪ AANKH SE AANKH MILA LE
- ♪ SAWAN KI GHANGHOR GHATA
- ♪ CHUN CHUN NAACHUNGI



عجیب سی بات ہے کہ خواجہ خورشید انور کا رہنمائی شعروخن کی طرف تھا اور فیض ساز و آواز کی دنیا میں گہری دپکی رکھتے تھے مگر ذات باری کی رضا ملاحظہ ہو کہ اول الذکر فلمی موسیقی کے افق پر درخششہ ستارہ بن کر جگنگایا اور موخر الذکر عالم فکر و خن کی ایک عظیم المرتبت اور عہد آفریں شخصیت بن گیا۔ خواجہ خورشید انور نے بھی پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد ریڈ چو لاہور میں پروگرام پر وڈیو سرکی حیثیت سے اپنی تعلیمی زندگی کا

سہیل رعناء، رو بن گھوش کی مثالیں بھی دی جاسکتی ہیں، وادی مہران (سنده) کے ایک اور سپوت سائیں فضل علی جاموٹ جو ایک معزز وڈیو ہوتے ہوئے بھی دنیا میں محض اپنے شوق کی بھیل کے لیے آئے اور ایس گل کے نام سے مشہور و معروف ہوئے لیکن موسیقی کے شوق نے انہیں ماشر غلام حیدر کے اتنا قریب کر دیا کہ انہوں نے بھیت موسیقار اپنا نام ہی گل حیدر رکھ لیا اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنے بیٹے کا نام بھی فاروق

یا گنگ نے دی تھیں۔ 1947ء میں انہوں نے تین فلموں کی موسیقی دی چتر پروڈکشنز کی 'آج اور کل (ہدایت کار خواجہ احمد عباس)'، 'پنجوی کی پنگڈی' (ہدایت کار رام نرائے دیوب) اور جنت پروڈکشنز کی 'بروانہ (ہدایت کار جے کے نندہ)' سہ گل اور شریا کی اس فلم کے گیت بڑے مقبول ہوئے تھے۔

1949ء میں ہدایت کار موصوف (جے کے نندہ) ہی کی ایک فلم 'سُنگھار' کی موسیقی ترتیب دی (فلم ایچ نندہ پروڈکشنز نامی ادارے کے تحت بنی تھی) سُنگھار میں بھی ان کی موسیقی عمده تھی۔ یہ فلم کراچی کے جوبلی سینما کی اسکرین پر دھائی گئی تھی پچاس کی دہائی میں (غالباً 1952ء میں) چندر لیکھا فلمز نامی ادارے کی ایک فلم، نیلم پری، نمائش پذیر ہوئی تھی جس کی موسیقی خورشید انور نے ہی ترتیب دی تھی۔ پچاس کی دہائی میں شاید ایک دو اور فلموں میں موسیقی دینے کے بعد 1955ء میں یہ لا ہور چلے آئے۔ ہدایت کار وجہت سینم چکیری کی 'نشان' اور ہدایت کار ضیا سرحدی کی فلم 'یتیم' کی موسیقی بھی خواجہ خورشید انور کی ترتیب دی ہوئی تھی۔

پاکستان تشریف لانے کے بعد خواجہ خورشید انور سب سے پہلے ہدایت کار داؤڈ چاند کی فلم 'مرزا صاحب' (اردو) میں موسیقی دی۔ مرزا (سدھیر) کی بہن (یاسمن) پر فلمیا جانے والا نغمہ دین میرے داری میں تیرے..... بڑا مقبول ہوا تھا۔ 1956ء میں سلیکٹ پکھر ز کے تحت بننے والی مشہور و معروف نغمہ بار اور یادگار فلم 'انتظار' کی موسیقی دی۔ موسیقی ہی کی اہمیت اور افادیت کی بنیاد پر اس فلم کی کہانی بھی دراصل خود انہی کی تھی مفتر نامے اور مکالمے مشہور ادیب اور ناول

آغاز کیا۔ ایک زمانے میں تین اہم شخصیات کرش چندر، خورشید انور اور فیروز ناظمی ریڈ پولہ ہوئیں تھیں۔ خواجہ خورشید انور 1940ء میں فلمی صنعت سے وابستہ ہوئے اور پہلی بار نشاط پروڈکشنز کے تحت بننے والی فلم 'کڑھائی' کی موسیقی ترتیب دی۔ فلم کے ہدایت کار جے کے نندہ تھے (رادھارانی) واسطی نے مکری کردار ادا کیے تھے۔

1943ء میں ہدایت کار موصوف ہی کی ایک اور فلم 'اشارہ' کی موسیقی ترتیب دی (فلم ڈی آر ڈی پروڈکشنز نامی ادارے کے تحت بنی تھی) اشارہ میں سورن لتا، پرتوی راج، شریا، سیش جگد لیش یعنی مسعود اور این سکنہ کے کام کیا تھا۔ ہدایت کار سہراب مودی نے سینٹرل اسٹوڈیوز کے لیے ایک فلم پر کھڑا سلیکٹ کی تھی جس میں مہتاب نے مکری کردار ادا کیا تھا دیگر ادا کاروں میں شاہنواز، سوبھنا سرتھ، بلونت سگھ، یعقوب اور صادق علی بھی شامل تھے۔ اس فلم کی موسیقی خاتون موسیقارہ سرسوتی دیوی اور خواجہ خورشید انور نے مشترک طور پر مرتب کی تھی۔ (قارئین اسی کہانی کو بیہاں پاکستان میں ہدایت کار حسن طارق نے 'مشکوہ' نامی فلم کے نام سے پیش کیا تھا جس میں مہتاب والا مکری نوعیت کا رول مادام صبحہ نے بڑی خوبصورتی اور اپنیاں عمدگی اور کامیابی کے ساتھ ادا کر کے دادو چھیس حاصل کی تھی اور پھر ریاض شاہد کے جانب اور بر جتہ مکالموں نے اس میں اور زیادہ حسن اور تاثر پیدا کر دیا تھا۔ حسن لطیف لک کی دھن پر ملکہ ترنم کا وہ نغمہ آج محفل سجائے کوآئی لا جواب تھا۔

1946ء میں خواجہ صاحب نے دو فلموں 'نور عرب' اور 'سلور کوئین' (پنجوی فلمز) میں موسیقی دی جن کی ہدایات بالترتیب اے ایم خان اور راجہ

نگار سید امیاز علی تاج نے تحریر فرمائے تھے۔
 ہدایت کار مسعود پروین نے ہدایات دی تھیں بلاشبہ
 ملکہ ترجم نور جہاں (خصوصاً اندری محبوہ کے روں
 میں) سنتوں کمار (ڈبل روں میں) اور پھر سب
 سے بڑھ کر آشنا پولے کی ویس کے کردار میں
 رفارمنس اپنی اپنی جگہ لا جواب تھیں مگر انتظار کی
 قطعیں اشان کامیاب یقیناً اس نی دلکش اور سحر اگیز
 موسیقی ہی کی مرہوں منت تھی تمام ہی گانے ہست
 بلکہ پرہٹ تھے۔ جس دن سے پیادلے گئے
 ، اوچانے والے ٹھروڈر، آ بھی جاد کیہ آ کر ذرا
 گھر آگئے بالم پر دیکی چاند ہنسے دنیا بے روئے
 میرا پیار اور چون چون ناچوں کی کن گن گھاؤں کی
 بھی گیت بہہ گیر شہرت و مقبولیت سے ہمکنار
 ہوئے اس کے بعد انہوں نے زہرشق نامی فلم کا
 میوزک دیا وہ بھی عمدہ اور دلو از تھا۔ رات چاندنی
 میں اکیلی اور پھر موہے پیا ملن کو جانے دے
 انتہائی عمدہ گیت تھے جو ناہید نیازی نے گائے تھے
 فلم کوئی میں ملکہ ترجم کی جادو بھری آواز اور خواجه
 صاحب کے حسن کمال کا سعّم ہوا اور ان نغمات
 نے جنم لیا، دل کا دیا جلا یا میں نے ساگر روئے
 لہریں شور چاکیں اور رم جھم رم جھم پڑے پھوار
 (بحمد نیازی اور ملکہ ترجم کی آوازوں میں الگ

فلم جھومر میں خواجه خورشید انور کا کپوز کیا ہوا
 یہ نغمہ بھی بے حد مقبول ہوا جو فلم کی بیرونی مسافت
 نذر یہ پر ناہید نیازی کی آواز میں فلم بند کیا گیا تھا
 اس کے بول تھے چلی رے چلی رے چلی رے
 میں تو دلیں پیا کے چلی رے اپنی ہی تحریر کی ہوئی
 کہاںی اور ڈاڑی یکش میں بننے والی فلم گھونکھٹ
 مکمل طور پر ایک پرہٹ میوزیکل فلم تھی اور اس
 کے حسین و دلو از نغمے بھی خواجه صاحب کے کمال

میں) کپوز کی ہوئی صلو علیہ وآلہ کس قدر روح تاریخی اور ثقافتی پس منظر میں) اور اپنے حلقہ احباب کی مناسبت سے خواجہ صاحب کا علمی پرور نعمت ہے اور ہماری محافل میلاد اور اس قسم کی



دیگر مذہبی تقریبات کی شان، عظمت اور تقدیم کو دو بالا کر دیتی ہے۔ مندرجہ بالا سطور میں دی گئی فلموں کے علاوہ خواجہ صاحب نے سرحد، پرانی آگ، سلام مجتب، شیریں فرباد، حیدر علی، گذروا اور مرزا جٹ (دوسری بار بننے والی مسعود پرویز کی) نامی فلموں میں بھی موسیقی ترتیب دی۔ جہاں تک ایوارڈ کا تعلق ہے (انہوں نے انتظار پر صدارتی ایوارڈ 1956ء میں بھیشیت، بہترین موسیقار بھی حاصل کیا تھا) انہوں نے 1958ء میں زہر عشق، 1962ء میں گھونگھٹ اور 1970ء میں ہیر راجھا پر بہترین موسیقار کے نگار ایوارڈ حاصل کیے۔ عطا ہو کر یہ صاحب کمال موسیقار اس قدر جیں و دلکش نغموں کی سوغات دے کر 30 اکتوبر 1984ء میں اس جہان رنگ و بوکو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جاما پروردگاران کی مغفرت فرمائے آئیں۔

اپنے دور کے خصوصی حالات (سیاسی، سماجی،

مطالعہ اور پھر مشاہدہ، بہت وسیع تھا اور زمانہ طالب علمی میں انہیں فکر و ختن سے بھی گہری و پچھی رہی۔

☆☆.....☆☆

سینئر صحافی شاعر اور ملکوں ملکوں کھو مے تجزیہ کار

محمد شام کی زیر ادارت

انہادوں میں رابطہ

ماہنامہ

کلچری



جولائی 2014 سے باقاعدگی سے شائع ہونے والا

بین الاقوامی معیار کا پہلا قومی میکریں

☆ ہمارا عالم یونیورسٹیوں، دینی مدارس، حقیقی اداروں تربیت گاہوں سے پھوٹنے والی روشنی عوام تک پہنچانا

☆ ڈنیا بھر میں پاکستان اور مسلم اسلام پر شائع ہونے والی تازہ ترین اخباروں کی تجزیہ

☆ پاکستان کے یادداں، تعلیمی اداروں، سرکاری مک浓厚وں کے بارے میں عامی تجزیاتی اداروں کی
بے لاگ روپرٹیں، آسان اردو میں

☆ ملک میں سرگرم ایک لاکھ سے زیادہ آئین جی اور کسی سرگرمیوں سے جو عوام ہاندہ

☆ صدوری ☆ سفارت کاری ☆ کتابیں ☆ کامیاب زندگی ☆ فن تعمیر ☆ تدریسی

☆ پاکستان کے اخراج ☆ موسقی ☆ ایم اور ہمارے پیچے ☆ طنز و مراح ☆ اردو ادب سے انتساب

لائبریریوں، یونیورسٹیوں، دینی مدارس کو خصوصی رعایت ☆ یونیورسٹیز کو معقول کیش

جو کچھ آپ کے اطراف میں ہے..... ماہنامہ اطراف میں ہے

توبہ نگہداری نمبر 508، لینڈ مارک بلازا، آئی آئی چندر مگر روڈ۔ کراچی
Ph: 0092 21 32274661 Mob: 0300-8210636 Email: mohammadshaam@gmail.com Web Site: www.atrafmagazine.com

دنیا کی خفیہ زبانوں سے ترجمہ گئی کہانیاں

دسمبر اور جمیعت

W SOMERSE MAUGHAM

اگریزی سے ترجمہ: سید حمیر شاہ

ڈیوڑھی میں بجٹ وکرار کی آوازیں سن کر دو ”نی کرایہ دار اپنا سامان لانے والے قلی
سے لڑ رہی ہے۔“ ایک عورت نے کہا۔ تمن آدمی اپنے کروں سے باہر آگئے۔



ہوں، تجھ سے تین یورو طے ہوئے تھے اور وہ میں
نے دے دیے ہیں۔“
” بالکل جھوٹ، میں نے پانچ یورو طے کیے
تھے۔“
وہ رقم کے تباہ عذر پر بہت دیر سے لڑ رہے
تھے۔

” پانچ یورو؟ اور ان چیزوں کو اٹھانے کے
لیے کیا تیرا دماغ پھر گیا ہے۔“ عورت نے اسے
دھکا دے کر ہٹانے کی کوشش کی۔

” میں اس وقت تک یہاں سے نہیں ہوں گا
جب تک میری پوری مزدوری نہ چکاؤ گی۔“

” میں زیادہ سے زیادہ تجھے چار یورو اور
دے سکتی ہوں۔“

شور و غوغای پرستا جا رہا تھا۔ عورت بری طرح
چلا رہی تھی اور مغلقات ساری تھی۔ بالآخر قلی ہی
کو دینا پڑا۔

” اچھا بابا! تم چار یورو ہی دو میں تم جیسی
ذلیل عورت سے بحث کر کے اپنا وقت ضائع کرنا
نہیں چاہتا۔“

اس عورت نے قلی کو ایک پس دے دیا اور وہ
اس کا سامان پنج کریپڑا تا جوا دا پکن چلا گیا۔
عورت نے ایک کوشش گالی کی اور جیسیں گھیث کر
کرے میں لے جانے کے لیے پیچے مڑی، اس
وقت دونوں عورتوں نے پہلی بار اس کا چہرہ
دیکھا۔

” اف خدا! کتنا بھی اک چہرہ ہے؟ مجھے تو
بالکل قاتل معلوم ہوتی ہے۔“ ایک لڑکی اسی وقت
اوپر آئی اور اس کی ماں نے آواز دی۔

” روز الیا! کیا تم نے اسے دیکھا؟“
” میں نے ابھی قلبی سے پوچھا تھا کہ یہ عورت
کہاں سے آ رہی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ وہ اس

لامیک نا کے عقبی بازار میں یہ دو منزلہ رہائشی
بلڈنگ دا تھی۔ اس علاقے کا شاہراہ سوائل کی
سب سے زیادہ گندی بستیوں میں ہوتا تھا۔ مزدور
پولیس کا نشیبل، پوسٹ میں، ٹرائیور کی قسم کے
لوگ جن سے اپیں بھرا پڑا ہے یہاں کرائے
داروں کی حیثیت سے مقیم تھے اور ان کے میلے
کھلے پنچے تمام دن گلی میں شور چاٹتے رہتے۔
بلڈنگ میں تقریباً میں خاندان آباد تھے۔ یہ لوگ
معمولی سی بات پر آپس میں لڑپڑتے اور تھوڑے
دنوں بعد پھر شیر و شکر ہو جاتے۔ فرست کے
وقات میں ان کی گپوں سے فضا گونخ اٹھتی۔
سادہ لوح لوگوں کی طرح یہ بھیسا اک دوسرے کی
مد کرتے رہتے، غرضیک ان کی زندگی مجموعی طور پر
بہت سکون اور دل جھی سے بس رہو رہی تھی۔
بلڈنگ کا ایک کمرہ کچھ مدت سے خالی پڑا تھا
لیکن آج صحیح ایک عورت نے اس کو کرائے پر لے
لیا تھا اور ایک سختے بعد ہی وہ اپنے سامان سے
لدی پہنچنی آ پکھی۔ اس کے پیچے ایک قلی بقیہ
سامان اٹھائے آ رہا تھا۔

قلی اور عورت میں جھکڑا طول پکڑتا جا رہا تھا
اور دونوں عورتیں جو چلی منزل سے گمراں رہی
تھیں، نسوانی فطرت کے مطابق اس جھکڑے کا
اک ایک لفظ سننے کے لیے برآمدے پر جک
لکھیں۔ نووارد اپنی تیز و تندا آواز میں گالیوں کی
بوچھاڑ کر رہی تھی اور قلی بھی گاہے گاہے اسے سخت
ست کہہ رہا تھا۔ دونوں عورتوں نے ایک
دوسرے کو کہنی ماری۔

” میں اس وقت تک یہاں سے نہیں ہوں گا
جب تک تم میری پوری مزدوری نہ چکاؤ گی۔“ وہ
متواتر کے جا رہا تھا۔
” میں تو پوری مزدوری پہلے ہی دے چکی

بلڈنگ کے کرایہ داروں کا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ اپنائی مفکوں الحال ہے۔ اس کے بوسیدہ کپڑے اس کی غمازی کرتے تھے۔ وہ روزانہ صبح چھ بجے باہر چل جاتی اور رات گئے لوٹتی۔ اس کا ذریعہ معاش سب کے لیے ایک چوتھاں بنا ہوا تھا۔ انہوں نے ایک بار پولیس کا شیل سے جو اس مکان میں رہتا تھا، اس عجیب و غریب عورت کے متعلق تحقیقات کرنے کو کہا۔ لیکن اس نے جواب دیا کہ جب تک وہ قانون کی حدود میں رہتی ہے اس وقت تک مجھے کسی قسم کی تحقیقات کرنے کا حق نہیں۔ لیکن سوال میں انہیں بہت تیزی سے سے گشت کرتی ہیں اور چند ہی روز میں ایک عمارتے جو مکان کے بالائی کمرے میں مقیم تھا، تمام گھروالوں کو بتایا کہ اس کا ایک دوست جو ٹریانا میں رہتا ہے، اس کی بوجھی عورت کی گزشتہ زندگی سے واقف ہے۔ لا کچیرا اصراف ایک ماہ قبل رہا ہوئی ہے، وہ سات سال تک جیل کی چار دیواری میں بند رہی تھی اور اس کا جرم تھا..... قتل۔

رہائی کے بعد اس نے ٹریانا میں ایک مکان کرائے پر لے لیا۔ لیکن اس کی زندگی کا بھی ایک راز جلد ہی طفت از بام ہو گیا۔ اسے دیکھتے ہی شہر کے نئے آوازے کئے اور پھر چھکتے۔ وہ غصے میں لال پیلی ہو کر انہیں مارتا۔ یہ باتیں اتنی مدت تک متواتر جاری رہیں کہ تمام شہر میں اضطراب پھیل گیا اور مجبور ہو کر مالک مکان نے اسے نکل جانے کا نوش دے دیا۔ لا کچیرا نے مالک مکان اور تمام لوگوں کو جنہوں نے اسے نکالا تھا، دل کھول کر گالیاں دیں اور ایک دن اچانک شہر سے غائب ہو گئی۔

لیکن اس نے کس کا خون کیا تھا؟، روز الیا

کا سامان ’ٹریانا‘ سے لارہا ہے۔ اس مکار عورت نے بے چارے سے چار روبل کا وعدہ کیا تھا لیکن صرف تین روبل دے۔“

”قیٰ نے اس کا نام بتایا؟“

”اسے معلوم نہیں، لیکن وہ کہہ رہا تھا کہ ٹریانا میں یہ لا کچیرا کے نام سے مشہور تھی۔“

دریں اشادہ اپنا منہوں چورہ اٹھائے سامنے آئی۔ اس نے بالکل میں کھڑی عورتوں پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی اور اپنا ایک بنڈل اٹھا کر جو باہر بھول گئی تھی، خاموشی سے کمرے میں محس گئی۔

”اُس کی ٹھیک دیکھ کر مجھے کپکپی ہونے لگتی ہے۔“ روز الیا نے ہمی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

لا کچیرا چالیس سال کے پیٹے میں ہو گی۔

وحشت زدہ صورت، پانس کی طرح سوکھا مریل جنم، اشخوانی ہاتھ اور انگلیاں تو بالکل گدھ کے پیچوں کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ اس کے گالوں میں گڑھے پڑے ہوئے تھے اور اس کا جھریلوں

بھرا رہ جسم دیکھ کر ایسا لگتا تھا مجھے کسی نے اس کا خون نچوڑ لیا ہو۔ جب وہ اپنے موٹے موٹے

زرد ہوٹھ کھول کر کسی سے بات گرتی تو اس کے نوکیلے دانت کسی خون خوار درندے کے دانتوں کی

طرح معلوم ہوتے تھے۔ اس کے پال سیاہ اور کھر درے تھے جن کو وہ عجیب وضع سے باندھے رکھتی تھی۔ بالوں کی دو لیس اس کے کانوں پر انگلی رہتی تھیں، بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں جو بہت مضبوطی سے حلقوں میں جڑی معلوم ہوتی تھیں،

ایک عجیب قسم کی ڈراؤنی چک تھی۔ اس کے پھرے پر اس غصب کی بہت نظر آتی کہ کسی کو اس سے بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اس کی

دنیا اپنی ذات تک محدود تھی۔

نے پوچھا۔

”لوگ کہتے ہیں کہ مقتول اس کا عاشق تھا۔“

معمار نے جواب دیا۔

”کوئی شخص اس سے محبت نہیں کر سکتا۔“

روز الیا نے حقارت آمیز مسکراہٹ سے کہا۔

”تو پہ..... روز الیا کی ماں بولی۔“

”میں نے تو پہلے دن دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ

یہ کوئی قاتل معلوم ہوئی ہے، خدا ہم سب کو اس کے شرے سے محفوظ رکھے۔“

روز الیا نے کانپتے ہاتھوں سے اپنے سینے پر

صلیب کا نشان کھینچا۔ اسی لمحے لا کچیر اندر داخل

ہوئی اور تمام حاضرین کو جیسے سانپ سوچ گیا۔

گھبراہٹ کے عالم میں وہ ایک دوسرے کی

طرف ہٹکنے لگے اور ان کی متوجہ نگاہیں اس کا

جاائزہ لینے لگیں۔ لا کچیر ان کی اچانک خاموشی

سے ہٹکنی اور اس نے مٹکوں نظروں سے

انہیں دیکھا۔

پولیس کا نشیل نے سلسلہ گفتگو شروع کرنے

کے لیے اسے سلام کیا۔ اس نے ترش روئی سے

سلام کا جواب دیا اور جلدی سے کمرے میں داخل

ہو کر دروازہ بند کر لیا۔

دروازے کے مقابل ہونے کی آواز فضا کے

سکوت میں گوچی۔ ان کے کانوں سے ٹکرائی۔ ان

منجوس تند و تیز آنکھوں نے سب پر عجیب سی

کیفیت طاری کر دی تھی اور وہ اس طرح سرگوشی

میں بول رہے تھے جیسے کسی بدرجوان نے انہیں محور

کر دیا ہو۔

”اس کی آنکھوں میں شیطانیت رقص کرتی

معلوم ہوئی ہے۔“ روز الیا نے کہا۔

”میتوں! خدا کا شکر ہے کہ تم ہماری حفاظت

کے لیے یہاں موجود ہو۔“ اس کی ماں نے پولیس

کا نشیل سے کہا
لیکن لا کچیر نے کسی شخص کو ٹھکایت کا موقع
نہیں دیا۔ وہ ہمیشہ ایگ تھلک رہتی اور کسی سے
کبھی ایک لفظ تک نہ کہتی اور اگر کسی شخص نے اس
سے راہ در اسم پیدا کرنے کی کوشش کی تو وہ اسے خٹتی
سے جھڑک دیتی۔ اسے محبوس ہونے لگا تھا کہ اس
کے ہماسے اس کا راز..... قتل کی واردات اور قید
و بند کی طویل مدت کے متعلق سب کچھ جان گئے
ہیں اور اس احساس کے ساتھ اس کے چہرے پر
درستی کے نقوش گہرے ہوتے گئے اور اس کی
دھنسی ہوئی آنکھوں کی وحشیانہ چمک بڑھتی گئی۔

رفقت نہ کش و شب کا غبار جو اس کی خوفناک
ہیئت اور دہشت ناک ماضی کی وجہ سے اس کی
ہستی کے گرد چھایا ہوا تھا، چھٹتا گیا تھا کہ روز الیا
کی باقاعدی ماں نے بھی لا کچیر اکی طرف توجہ دینی
چھوڑ دی۔

”میرا خیال ہے جیل خانے کے ماحول نے
اسے پاکل کر دیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہاں کا
بھیاںک ماحول اکثر انسان کا دماغ ماؤف کر دیتا
ہے۔“ اس نے کہا۔

دن گزرتے گئے اور اضطراب و استجواب کی
دھنڈ آہستہ آہستہ صاف ہوئی گئی لیکن ایک دن
ایک ایسا واقعہ ظہور پزیر ہوا کہ چمگوئیاں از سرنو
شروع ہو گئیں۔ روز الیا کی ماں ڈیوڑھی میں پیغمبھر
اسکرٹ سی رہی تھی کہ ایک نوجوان نے دروازے
پر آ کر کہا۔

”کیا انٹو نیا سچیز ہیں رہتی ہیں؟“
روز الیا کی ماں نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا
اور کندھے جھکتے ہوئے کہا۔

”یہاں تو اس نام کی کوئی عورت نہیں رہتی۔“
”نہیں وہ بیٹی رہتی ہے۔“ نوجوان نے کہا

اور قد رے توقف کے بعد بولا۔
”شاید وہ انہیں لا کچیرا کے نام سے جانتے
ہیں۔“

بوزہی عورت نے والہانہ انداز میں اپنے
باڑوں کی گردن کے گردھائل کر دیے اور بے
تحاشا پیار کرنا شروع کر دیا۔ وہ اس کے سینے سے
چھٹی دنوں ہاتھوں سے پیار بھرے انداز میں اس
کا چہرہ حصہ پھر ہی تھی۔ روز الیا اور اس کی ماں
دونوں تصویر حیرت بی یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ ان
کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی
کہ اس مکروہ ٹکل عورت کا دل اتنا خوب صورت
اور محبت کے نور سے معور ہو سکتا ہے۔ اپنے بیٹے
کو خوب پیار کرنے کے بعد وہ فرط سرست سے
ہلکی ہلکی سکیاں بھرتی اسے کر رہے میں لے گئی۔
”تو یہ اس کا لڑکا ہے۔“ روز الیا نے حیرت
سے کہا۔

”بھلا کون سوچ سکتا تھا کہ اتنا خوب صورت
اور وحیہ نہ بجو ان اس کا پیٹا ہو سکتا ہے؟“
کریٹ کے جسم پر اس کا طیم چہرہ اور سفید
موزوں دانت بہت نیماں تھے۔ اس کے بال
کنپیوں سے کٹے اور خالص ہسپانوی انداز میں
سر بر جھے تھے۔ اس کی نو خیز دامی، گندی جلد پر
بہت جعلی معلوم ہو رہی تھی۔ حقیقتاً وہ بہت وجہ
آدمی تھا۔ ہر ہسپانوی کی طرح اسے بھی اچھے
کپڑوں کا شوق تھا۔ اس کی چست پتلوں، چھوٹا
ساجیکت، جھالدار میض اور چڑھے جھجھی کی بہت
اس کے سڈول بدن پر بچ رہی تھی۔
آخرا کارلا کچیرا کے کمرے کا دروازہ کھلنا اور
وہ فرط محبت سے اپنے بیٹے کے بازو کا سہارا لیے
باہر لگا۔

”تم اگلے اتوار کو پھر آؤ گے نا؟“ اس نے

ہوئے کہا اور ایک کمرے کی طرف اشارہ کر کے
کہا۔
”ارے.....“ روز الیا نے دروازہ کھولتے
”وہ وہاں رہتی ہیں۔“ ”شکر یہ۔“ نوجوان نے مسکراتے ہوئے
کہا۔

روز الیا تھکے خوب صورت نقوش کی دل
فریب لڑکی تھی۔ سرخ و سفید رنگ اور آنکھیں بے
حد خوبصورت اور بے باک بالوں میں لگے سرخ
پھول سے اس کی زلفوں کی چمک دار سیاہ رنگت
نگھر رہی تھی۔

”خوش قسمت ہے وہ ماں جس نے تمہیں جنم
دیا۔“ نوجوان نے اجنبی زبان کا روز مرہ قفرہ
استعمال کرتے ہوئے کہا۔
”خداحشی مدد کرے۔“ روز الیا کی ماں
نے دعا دی۔

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا آگے بڑھا اور
دروازے پر دستک دی۔ دونوں عورتیں متجب
نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔
”یہ کون ہو سکتا ہے؟“ روز الیا کی ماں نے
کہا۔

”آج تک تو کوئی شخص لا کچیرا سے ملنے میں
آیا۔“

اس کی دستک پر اندر سے کوئی جواب نہیں
آیا۔ اس نے دوبارہ دروازہ کھلکھلایا۔ لا کچیرا کی
کرخت آواز گوئی۔

”کون ہے؟“
”موم.....!“ وہ چلایا۔

پوچھا۔

”یقیناً بشرطک کوئی دشواری پیش نہ آئی۔“

اس نے روز الیا پر بھر پور نظر ڈالی اور اپنی ماں کو سلام کر کے روز الیا کی طرف بھی سر ٹھم کیا۔ روز الیا نے مسکراتے ہوئے سلام کا جواب دیا۔ ریشمی پلکوں کی چمار کے پیچھے، اس کی خوب صورت سیاہ آکھیں سرت سے ناجھی ہوئی اُخیں اور اس نے کریٹوں کو معنی خیر نظر وں سے دیکھا۔ لاکھڑا نے ان نگاہوں کے پیغام کو پڑھ لیا۔ کرخی کی لمبیں جانے بیٹھے سے ملاقات کی وجہ سے عارضی طور پر دب گئی تھیں۔ ایک بار پھر امیر آئیں۔ اس کے چہرے پر نفرت و حقارت کے آثار پیدا ہو گئے اور اس نے خوفناک نظر وں سے روز الیا کو گھورا۔

”کیا وہ تھہارا لڑا کا تھا؟“ روز الیا کی ماں نے اس کے جانے کے بعد پوچھا۔ ”ہاں وہ میرا لڑا کا تھا۔“ لاکھڑا نے بختی سے جواب دیا اور اپنے کمرے میں گھس گئی۔

دینا کی کوئی چیز اس کے دل میں نہیں پیدا نہیں کر سکتی تھی اور اس سرت اُخیز لمحے میں بھی جب اس کا پڑھ مردہ دل اپنے کڑیں جوان بیٹھے سے ملنے کی خوشی میں محل اٹھا تھا اس نے دوستی کا ہاتھ درخشتی سے جھکٹ دیا۔

لاکھڑا اکوائی سے بیٹھے سے دلی محبت تھی۔ دینا میں وہی اس کے لیے سب کچھ تھا اور وہ اسے اس بے پناہ جذبے سے چاہتی تھی کہ اس کی محبت کا جواب اس شدت سے دینا انسان کے بس سے باہر تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا بھی دینا میں صرف اسی کو اپنا سب کچھ خیال کرے۔ اپنی مصروفیات کی وجہ سے وہ ماں کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا لاکھڑا کچیرا اکثر سوچتی کہ اس سے دور رہ کر وہ

کیا کرتا ہو گا؟ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ اس کا بیٹا کی اور عورت کی طرف دیکھے اور صرف اس تصور سے ہی کہ وہ کسی لڑکی سے محبت کر رہا ہو گا، اس پر ایک یہ جانی کیفیت طاری ہو جاتی۔ سوائل کے باشندوں کی سب سے دلچسپ تفریخ یہ ہے کہ دو شیزادیں، آدمی آدمی رات تک کھڑکیوں یا دروازوں پر کھڑی اپنے محبوب کا انتظار کرتی ہیں جو گلیوں میں گھونٹتے ہوئے ان کے کانوں میں اپنی مدد بھری آواز کا رس گھولتے ہیں۔ لاکھڑا نے ایک دوبار اپنے بیٹھے سے اس کے روانوں کے بارے میں پوچھا لیں اس نے ہر بار قسم کھا کر کہا کہ وہ ان جھکڑوں میں پڑا پسند نہیں کرتا بلکہ شام کے وقت کام کا ج میں مصروف رہتا ہے۔ لاکھڑا جانتی تھی کہ وہ سراسر جھوٹ بول رہا ہے کیونکہ اس جیسا وجہ نہ جانے تھیں حسین لڑکیوں کے خوابوں میں بستا ہو گا لیکن اس کے باوجود یہ انکار سن کر وہ اپنے آپ کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتی اور اس کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔

جب اس نے روز الیا کی محبت پاش لگا ہیں اور کریٹوں کی معنی خیز مسکراہٹ دیکھی تو اسے غصے سے اپنا سانس گھٹتا محسوس ہوا۔ اسے شروع سے اپنے ہمسایوں سے نفرت تھی کیونکہ وقت نے ان کی قسمت میں کامرانیاں اور شاد میانیاں، لیکن اس کی جھوٹی میں ناکامیاں، محرومیاں اور بدنصیباں ڈالی تھیں اور جب سے وہ اس کے خوف ناک راز سے واقف ہو گئے تھے، نفرت کی یہ خلیج وسیع تر ہو گئی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں کوئی نقاہے بجا بجا کر کہہ رہا تھا کہ یہ لوگ اس کے اکتوتے بننے کو اس سے چھین لینے کی سازش کر رہے ہیں۔ اُنکے اتوار کو سہ پہر کے وقت لاکھڑا اپنے کمرے سے

پاہر نکلی اور ڈیوڑھی سے نکل کر دروازے پر آ کر
کھڑی ہو گئی۔ یہ بات اتنی خلاف معمول تھی کہ
دوسرے کرایہ دار اس پر تبصرہ کیے بغیر نہ رکھے۔
”تم مجھے اتنی آسانی سے بھکست نہ دے سکو
گی۔“ اگلے انوار جب لاکچری ادروازے پر آ کر
برا جان ہو گئی تو روز الیا پاہر سڑک پر چلنی اور
ای سست میں گھومتی ہوئی چل دی جس طرف سے
کریٹو کے آنے کی توقع تھی۔ ذرا دیر بعد ہی وہ
آتا دھماکی دیا لیکن وہ آگے چلتی رہی اور عمدًا اسے
نظر انداز کرنی رہی۔

”ہیلو.....“ اس نے رکتے ہوئے کہا۔

”اوہ وہ آپ ہیں؟ میں نے سوچا کہ شاید آپ
مجھے بات کرتے ہوئے ڈریں گے۔“
”میں کسی چیز سے نہیں ڈرتا۔“ اس نے فخر
انداز میں کہا۔

”اپنی امی کے علاوہ؟“ اور یہ کہہ کر وہ آگے
چل دی جیسے وہ اس سے بات کرنا نہ چاہتی ہو
لیکن پر عورت کی طرح وہ مرد کی کمزوری سے
واقف تھی۔ اسے بخوبی علم تھا کہ وہ ضرور اس کے
بیچھے آئے گا۔

”ارے تم کہاں چل دیں؟“

روز الیا کی توقع پوری ہو رہی تھی۔

”آپ کو اس سے کیا؟ سعادت مند بیٹھے!
فور آپنی والدہ ماجدہ کے پاس چلے جائیے ورنہ وہ
آپ کو ماریں گی۔ جب آپ ان کے ساتھ
ہوتے ہیں تو مجھ پر نگاہ ڈالتے ہوئے بھی ڈرتے
ہیں۔“

”کیا اول فول بک رہی ہو؟“

”بس خدا حافظ مجھے ضروری کام ہے۔“ اور
وہ آگے بڑھ گئی۔

کریٹو دبے دبے قدم رکھتا آگے چلا گیا اور
روز الیا دل میں ہنسنی سیدھی چلتی رہی۔

شام کو جب وہ اپنی ماں کے ساتھ پاہر نکلنے کا

کھڑی ہو گئی۔ یہ بات اتنی خلاف معمول تھی کہ
کھڑی ہے؟“ روز الیا نے ٹھٹھی ہوئی آواز میں
ہنسنے ہوئے کہا۔
”اس کا بے مثال لخت جگہ آج اس مکان کو
زینت بخش رہا ہے اور وہ بھیں چاہتی کہ ہم اس
کے دیوار سے مشرف ہوں۔“

”بے دوقوف عورت! کیا اس کا خیال ہے کہ
ہم اس کے لڑکے کو کھا جائیں گے؟“ کریٹو کے
آتے ہی وہ اسے تیزی سے اپنے کمرے میں لے
گئی۔

”بڑھا اس کی حفاظت اس طرح کرتی ہے
جیسے وہ اس کا عاشق ہی ہو،“ روز الیا کی ماں نے
کہا۔

روز الیا نے ہنسنے ہوئے بند دروازے کی
طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں شرات کی
پریاں ناق اٹھیں۔

”اگر آج کریٹو کے ساتھ گفتگو ہو جائے تو
کیا رہے؟“ اس نے سوچا اور پھر لاکچری کے
غصے کا تصور کر کے اسے بے احتیاط ہنسی آگئی۔
وہ خاموشی سے دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئی
تاکہ جب وہ دونوں پاہر آئیں تو اس کے پاس
سے ہو کر گزریں لیکن کمرے سے پاہر نکلتے ہی
جب لاکچری اسے دہاں کھڑے دیکھا تو اپنے
بیٹھے کے پہلو میں آ کر کھڑی ہو گئی تاکہ وہ روز الیا
کو دیکھ بھی نہ سکے اور روز الیا کی ایکیم ناکام
ہو گئی۔

”اچھا.....“ روز الیا نے کندھے جھکتے
ہوئے کہا۔

تو روز الیا پھر ڈیورڈی میں موجود تھی اس بار
نداشت مٹانے کے لیے اس نے جو ات کر کے
روز الیا کو شب بخیر کہا۔ لاکھیرا کا منہ غصے سے
سرخ ہو گیا۔

”کریپٹ جلدی آؤ۔“ وہ جھینختی آواز میں
چلائی۔

”تم کس کا انتظار کر رہے ہو؟“

وہ چلا گیا۔ لاکھیرا ایک لمحے کے لیے روز الیا
کے سامنے رکی جیسے وہ کچھ کہنے والی ہو لیکن پھر اس
نے اپنے پرقبابو پالیا اور خاموشی سے اپنے سناں
تاریک گمراہے میں چل گئی۔

چند روز بعد سینٹ اسیدور کا میلہ تھا اور اس
خوشی میں معابر اور دو تین آدمیوں نے ڈیورڈی
میں چینی قدیلیوں کا ایک فانوس لگایا۔ موسم سرما
کی سہانی رات میں قدیلیوں آب و تاب سے
چک رہی تھیں اور چکنے نقیٰ ستارے آسمان پر
سو تیوں کی طرح لکھے معلوم ہوتے تھے۔ گمراہ کے
لوگ ڈیورڈی کے وسط میں، کرسیدن پر بیٹھے خوش
گپیاں کر رہے تھے۔ عورتیں چھوٹے چھوٹے
کاغذی عکسیں اور جملتے ہوئے آس پاس کی انواہوں پر
تہبرے کر رہی تھیں۔ کبھی کبھی کسی پیچے کی شرارت
اس مسلسل گفتگو میں رخنہ والی دیتی اور اس کی ماں
بے تحاشا صلوٰاتیں سنائی شروع کر دیتی۔ کچھ

عورتیں اپنے بچوں کو چھاتیوں سے لگائے دودھ
پلاڑی چھیں۔ دن بھر کی سخت گری اور جبکی کے بعد
نیک رات بے حد خوکوار معلوم ہو رہی تھی۔ جن
لوگوں نے صحیح سانڈوں کی لڑائی کا تماشہ دیکھا تھا
وہ فخریہ انداز میں دوسروں کو اس کی چھوٹی چھوٹی
تفصیلات بتا رہے تھے۔ ان کی خیال آرائیوں
سے موضوعات کی دلچسپی، رنگینی اور تنوع میں
اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور رات بھاگتی جا رہی تھی۔

لاکھیرا کے علاوہ تمام لوگ موجود تھے لیکن اس
کے سناں آسیب زدہ کمرے میں ایک سوم تھی
جل رہی تھی۔

”اور اس کا لڑکا کہاں ہے؟“ کسی نے
پوچھا۔

”وہ اندر رہی ہے۔“ روز الیا کی ماں نے کہا۔

”میں نے ایک لمحتے پہلے اسے جاتے دیکھا
تھا۔“

”وہ بہت خوش ہو رہا ہو گا؟“ روز الیا نے
ہنس کر کہا۔

”اچھا روز الیا، اب لاکھیرا کا قصہ دفع
کرو۔“ ایک عورت نے کہا۔

”ہم سب تمہارے رقص کے منتظر ہیں۔“

”ہاں ہاں۔“ سب چلائے۔

”روز الیا اٹھو۔“

اپنیں کے لوگوں کو رقص کرنے اور دیکھنے سے
والہاں اُنہیں ہے۔ بہت مدت ہوئی کسی نے کہا تھا
کہ اپنیں کی ہر عورت رقصہ ہوئی ہے۔ لوگوں
نے جلدی جلدی کردیں کو دائرے کی ٹھیک میں
رکھ لیا۔ معمار اور ٹرام کنٹیکٹر اپنے گٹاراٹھا
لائے۔ روز الیا نے اپنے پاؤں میں پال باندھی
اور ایک لڑکی کو ساتھ لے گر رقص شروع کر دیا۔
موسیقی کی آواز سن کر کریٹوں کے کان کھڑے
ہو گئے۔

”لوگ رقص کر رہے ہیں۔“ اس نے کہا اور
اس کے روئیں روئیں میں پاہر جا کر رقص کرنے
کی خواہش ترپنے لگی۔

اس نے پردے سے جھانک کر دیکھا۔ چینی
قدیلیوں کی شمشادی روشنی میں لوگ کریساں ڈالے
بیٹھے ہیں اور دو لڑکیاں رقص کر رہی تھیں۔

روز الیا ا تو اکار کا خاص لباس پہنے ہوئے

روز الیا سیدھی کریوں کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔
اس کا سر پچھے کی طرف جھکا اور تنفس کی تیزی سے
اس کا سائس پھولا رہا تھا۔
”آپ کو تو ناچنا نہیں آتا ہو گا؟“ اس نے
کہا۔

”کیوں نہیں، میں جانتا ہوں۔“
”تو پھر آئیے۔“ اس نے دل فریب انداز
میں مسکراتے ہوئے اسے دعوت دی۔ کریوں نے
اٹھنا چاہا لیکن چکچا کر بیٹھ گیا۔ اس نے تاریکی میں
غور سے گھوڑا اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کی موم
کا یہاں بھی تاریکی میں موجود ہے۔
روز الیا س کا غہوٹ بیٹھ گئی۔

”کیا آپ کو ابھی تک ڈرگ رہا ہے؟“
”مجھے کس سے ڈر کے گا؟“ اس نے
کندھے جھکتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ رقص
گاہ میں داخل ہو گیا۔

گنار جھنجلا اٹھے۔ تماشا یوں نے مویشی کی
تان کے ساتھ تالیاں بجا میں اور ڈبوڑھی اولے
اویں کے پر جوش نعروں سے گونج آئی۔ ایک
لڑکی نے کریوں کو ہنگھر دل کا جوڑا دیا اور جوڑے
نے ناچا شروع کر دیا۔ اچانک انہوں نے ’سی‘
کی ایک آواز سنی جیسے کوئی ساپ تاریکی میں
چھکنا کریں مار رہا ہو۔ روز الیا نے بے نیازی سے
ہنس کر اس سنتے ہوئے سفید چہرے کو دیکھا جو
تاریکی کے سامنے میں خبیث روح کی طرح
چھلک رہا تھا۔ لا کچیرا اپنی جگہ سے نہ بیلی۔ وہ رقص
چھلک رہا تھا۔ لا کچیرا پر تھا اور
کرنے والوں کی حرکات و سکنات دیکھتی رہی۔
جسموں کی مدھوٹی کے عالم میں جھولتے اور
قدموں کو ایک خاص انداز سے اٹھتے دیکھتی رہی۔
اس نے دیکھا کہ روز الیا ایک خاص ادا سے پچھے
بھتی اور مسکراتی آنکھوں سے کریوں کو دیکھتی۔

اور اس کے چہرے پر عام دستور کے مطابق خوب
پاؤڈر لگا ہوا تھا۔ گلب کا ایک پیارا سارخ
پھولوں اس کے سر کے بالوں میں تاج کی طرح
چمک رہا تھا۔ کریوں کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔
اپنیں میں محبت کے مشکل مدرج جلد طے

ہو جاتے ہیں اور جس روز سے کریوں نے خوب
صورت چھرے اور گداز بدن والی اس نوجوان
لڑکی سے ٹفتگو کی تھی، وہ اکثر اس کے تصور میں
کھو جاتا تھا۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔
”تم کہاں چارہ ہے ہو؟“ لا کچیرا نے کہا۔

”میں ان کا رض و سکھنے جا رہا ہوں..... کیا تم
چاہتی ہو کہ میں دنیا کی کسی تفریح میں شریک نہ
ہوں۔“

”تم رقص نہیں روز الیا کو دیکھنے جا رہے
ہو۔“ لا کچیرا نے اسے روکنے کی کوشش کی، لیکن
کریوں نے اسے پرے دھکل دیا اور لوگوں میں
بینہ کر رقص سے لطف انداز ہونے لگا۔ لا کچیرا
لڑکھڑاتی ہوئی ایک دو قدم چلی اور پھر ساکت و
سامت کھڑی ہو گئی۔ اس کے وحشت ناک
چہرے پر مایوسی کے سامنے منڈلارہے تھے اور
اس کے دل کی گہرا یوں میں غصے کا سمندر رھا تھا۔
مار رہا تھا۔

رات شباب پر تھی، رقص شباب پر تھا اور
روز الیا کا زہد نہ کرن شباب کریوں کو منحور کر رہا تھا۔
روز الیا کی نگاہ اس پر پڑی۔

”کیا آپ کو میری طرف دیکھتے ہوئے ڈر
نہیں لگ رہا؟“ اس نے ایک بار کریوں کے پاس
سے گزرتے ہوئے کہا۔

رقص نے اس کے دل و دماغ کو روئی کے
گالے کی طرح ہلکا کر دیا تھا اور اسے لا کچیرا کا
رتنی بھر خوف نہیں رہا تھا۔ رقص ختم ہو گیا اور

بن کر ناچ رہا تھا۔ لا کچیر اس کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔

”تم بیرے بیٹھے سے کیا چاہتی ہو؟“ اس کی غیر متوقع آمد اور گفتگو سے روز الیا چند لمحوں کے لیے ششدہ رہ گئی لیکن اس نے فراخ دو سنبھال لیا اور چہرے پر حرمت کے آثار پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی؟“ لا کچیر اک جسم میں غصے کی شدید لہر دو گئی اور اپنے آپ پر قابو پانے کے لیے اس نے اپنا ہاتھ کاٹ کھایا۔

”تم اپنی طرح میرا مطلب صحیح ہوتا ہے میرے بیٹھے کو مجھ سے چیننا چاہتی ہو۔“

”اوہ، تمہارا خیال ہے کہ میں تمہارے بیٹھے کو اپناتا چاہتی ہوں۔ تم اسے مجھ سے دور رکھا کرو۔ اگر وہ بھاگ کر ہر جگہ میرے پاس پہنچ جو میرے پاس اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔“

”یہ سراسر جھوٹ اور بہتان ہے۔“

”یہ تم اس سے پوچھو۔“ اور اب روز الیا کی آواز میں نفرت و حقارت کا اتنا زہر بھرا تھا کہ لا کچیر ابڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال رہی تھی۔

”وہ ایک ایک گھنٹے بازار میں میرا انتظار کرتا ہے۔ تم اسے اپنے کیجھ سے چھٹا کر کیوں نہیں رکھیں۔“

”تم جھوٹ بولتی ہو، تم جھوٹ بولتی ہو، تم جھوٹ بولتی ہو۔“ خود جان جان کر اس کے سامنے آتی ہو۔

”اگر مجھے کسی عاشق کی ضرورت ہوتی تو مجھے بغیر کہے بیسوں مل جاتے..... کم از کم میں ایک قاتل عورت کے لڑکے کو اپنا عاشق بنانا نہیں

لا کچیر اک آنکھیں جلتے کوئی طرح دہنکنے لگیں اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے آج وہ حلقوں میں جل کر بجسم ہو جائیں گی۔ اس کے دل میں غصہ و انتقام کی آگ سلگ رہی تھی لیکن کسی نے اس آگ کو اس پیش کونڈے دیکھا۔ اس نے غصے میں آہ بھری۔ رقص ختم ہو گیا اور فھاٹالیوں سے گونج اٹھی۔ روز الیا نے سکراتے ہوئے کریٹوں کا اس کے شاندار رقص پر مبارکبادی اور اس کی مدھ بھری آنکھوں میں ایک خاص چمک کو نہیں۔

رقص ختم ہوتے ہی لا کچیر اپنے کمرے میں ٹھہر گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ جب کریٹوں نے دروازے پر دستک دی تو وہ خاموش پڑی رہی اور اس کی متواتر درخاستوں پر بھی دروازہ نہ کھولا۔

”اچھا پھر میں جاتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ درد اور یاس کی شدت سے لا کچیر اک اسرا پھٹا جا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں لا اس اابل رہا تھا اس کے غم زدہ پذیر نصیب دل میں ہوک ائھڑ رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ دروازہ کھول دے لیکن وہ خاموش پڑی رہی۔ اس وسیع و عریض دنیا میں کریٹوں اس کا واحد اٹاٹھ تھا دنیا میں صرف وہی ایک ہستی تھی جسے دیکھ کر اس کے پڑ مردہ خند دل میں محبت اور مانتا کے لطیف جذبات بیدار ہو جاتے تھے لیکن اس کے باوجود اسے اپنے بیٹھے سے نفرت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ تمام رات بستر پر کروٹیں بدلتی اور شم دیواری کے عالم میں سوچتی رہی کہ یہ سب لوگ مل کر کیوں اس کے بیٹھے کو چھین لینے کی سازش کر رہے ہیں۔ منج وہ کام پر نہیں گئی بلکہ روز الیا کے انتظار میں بیٹھی رہی۔ کافی دیر بعد روز الیا سامنے سے آتی دکھائی دی۔ اس کے کپڑے ملے ہوئے تھے اور رات کے رقص کا خمار اس کی آنکھوں میں سرخ ڈرے

چاہوں گی۔"

ان آخری الفاظ نے لاکھیرا کے ضبط کا آخري بند بھي توڑ دیا۔ اسے ہر چیز گردش کرتی معلوم ہوئی۔ اس کے دماغ پر ہتھوڑے بنجے لگے۔ وہ بھیریے کی طرح روزاليا پر بھپٹ پڑی اور اس کے بال نوچ ڈالے۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارے کی طرح دبک رہی تھیں۔ روزاليا چلائی اور اس نے اپنا بچاؤ کرنا چاہا لیکن فوراً ہی ایک راہ گیر نے انہیں چھڑا دیا۔

"روزالیا....." اس نے آہستہ سے کہا۔ وہ چونک کر پچھے مڑی اور جیرت سے اس کے منہ سے بلکل سی چیخ نکل گئی۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو۔" اس نے کریوں کی طرف جاتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔

"میں تم سے درجنیں رہ سکتا۔"
"کیوں؟" اس نے اپنے دل فریب انداز میں مسکرا کر کہا۔

"کیوں؟ کیوں کہ میں اپنے دل اپنی روح کی گہرائیوں سے تمہیں چاہتا ہوں۔"

"شاید تمہیں علم نہیں کہ آج تمہاری ماں نے مجھے جان سے مارڈا الا ہوتا۔"

اور پھر اپنی عورتوں کے روایتی انداز میں حاجیہ لگا لگا کر اس نے تمام واقعہ سنایا لیکن وہ آخری فقرہ نظر انداز کر گئی جس کی چوٹ سے بے قابو ہو کر لاکھیرا آپ سے باہر ہو گئی تھی۔

"اس کی بدزماعتی کی کوئی انہما نہیں۔" کریو نے سخت لہجہ میں کہا۔

"آج میں اسے بتا دوں گا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"یہ سن کر تو وہ خوشی سے باغ باغ ہو جائے گی؟" روزاليا نے طنزیہ مکراہٹ سے کہا۔

"کل تم رجا میں ضرور آتا۔"
"اچھا دیکھو۔" اس نے جواب دیا۔

کریو نے ہلکا ساقہ قہقہہ لکایا کیونکہ روزاليا کا لہجہ غمازی کر رہا تھا کہ وہ ضرور آئے گی۔ جب وہ

"روزالیا سے جواب مت دو۔"

لاکھیرا غیظ و غضب کے عالم میں غرائی جیسے کوئی درندہ اپنا شکار نکل جانے پر غراتا ہے اور مکان کی طرف چل دی۔

رقص کے بعد روزاليا اور کریو ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے۔ روزاليا ایک حسین خواب کی طرح کریو کے دل و دماغ پر چھا گئی اور

اگلے روز وہ تمام دن اس کے سرخ ہونٹوں کے تصور میں کھویا رہا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں کی دل فریب چک کریو کے دل کی گہرائیوں

میں فروزال رہی اور وہ محور سا ہو گیا۔ بار بار اس کے دل میں خواہشِ امتحنی کروہ روزاليا کو ہمیشہ کے لیے اپنا بنا لے۔ رات کی خاموش سہاٹی گھڑیوں میں وہ بے قرار ہو کر اس کے مکان کی طرف چل

گھر واپس جا رہا تھا تو اس کا سینہ خوشی سے پھول رہا تھا اور وہ خلافی معمول سینہ تان کر بازار میں جا رہا تھا۔

اگلے دن جب وہ رات کو روز الیا کے مکان پر پہنچا تو وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ سوال کے دستور کے مطابق وہ سرگوشیوں میں باتمیں کرتے رہے۔ جب اس نے روز الیا سے پوچھا کہ کیا وہ بھی اس سے اسی شدت سے محبت کرنی ہے تو اس نے جذبات میں ڈولی ایک ہلکی سی آہ بھری۔

ستاروں کی چھاؤں میں، وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے محبت آئی جلتی قدمیں دیکھتے رہے اور پھر وہ ہر رات وہاں جانے لگا۔ اگلے اتوار کو اسے اپنی ماں سے ملنے جانا تھا لیکن وہ اس ڈر سے نہ گیا کہ لاکھیرا کو اس کے وزان آنے کے متعلق معلوم نہ ہو گیا ہو۔ حرمان نصیب

عورت تمام دن بے چینی سے اس کا انتظار کرتی رہی۔ اس کا دل درد سے پاش پاش ہو رہا تھا۔ وہ گھنٹوں کے بل گر کر اس سے معافی مانگنے کو تیار تھی۔ کریش اس کا بیٹا تھا۔ اس دنیا میں اس کا واحد

امانش تھا اس کی امیدوں کا مرکز تھا۔ بار بار وہ دروازہ کھول کر بھٹکتی تھیں اس کی کچھی کچھی نکاحیں مایوس ہو کر لوٹ آتیں۔ ہر آہٹ پر اس کا دل دھڑکنے لیکن اس کے دروازے بھر کسی نے دیکھ نہ دی۔ غم زدہ بڑھایا تھا اسی میں اکیلی پڑی گھریاں کھنٹی رہی اور پھر جب تمام دن گزر گیا اور وہ نہ آیا تو اس کے دل میں کریٹ کے لیے سخت

نفرت پیدا ہو گئی۔ وہ اس کی لاش اپنے قدموں میں تڑپتی ہوئی دیکھنا چاہتی تھی۔ جب اس نے یہ تصور کیا کہ اسے اپنے بیٹے سے ملنے کے لیے ایک ہفتہ اور گز اڑاڑے کا تو اس کا دل ڈوبنے لگا۔

دوسرہ اہفتہ جبھی گزر گیا اور وہ نہ آیا۔ اب وہ

اس جدائی کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا پورا وجود حکم کرب بن گیا۔ اس کو کریٹ سے اتنی شدید محبت تھی کہ دنیا کی کوئی محوجہ پر اس شدت سے محبت نہیں کر سکتی اور اب بھی اگرچہ کریٹ نے اسے ٹھکرا دیا تھا لیکن اس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تلی دی کہ یہ اس کا قصور نہیں بلکہ صرف روز الیا کی چال پازیوں کا نتیجہ ہے اور جیسے جیسے اس نے اس بات کو سوچا اس کے دل میں غیظ و غصب کا طوفان بڑھتا گیا۔

آخر کاراگلے اتوار کو کریٹ سے محبت کر کے اپنی ماں کے پاس بہنچ گیا لیکن اس نے بہت درستک انتظار کرایا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب لاکھیرا کی محبت کا سوتا ہمیشہ کے لیے خلک ہو گیا ہے۔ جب کریٹ نے اسے پیار کرنا چاہا تو لاکھیرا نے سے پرے دھیل دیا۔

”تم پہلے کیوں نہیں آئے؟“

”تم نے مجھے اندر نہیں گھسنے دیا تھا“ میں نے سوچا کہ تم مجھ سے مٹا نہیں چاہتیں۔ ”کیا اس کی وجہ صرف یہی ہے؟ کیا کوئی اور وجہ نہیں ہے؟“

”میں بہت مصروف تھا۔“ اس نے پنجی نظریں کیے ہوئے کہا۔

”مصروف، تم جیسا است اور بدمعاش شخص مصروف رہے گا؟ مجھ سے ملنے کے لیے تم بہت مصروف ہو لیکن اگر میری بجائے روز الیا سے ملنا ہوتا تو تمہاری مصروفیات حارج نہیں ہوتی۔“

”تم نے اسے مارا کیوں تھا؟“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میونے اسے مارا تھا؟ کیا تم اس سے ملے تھے؟“ لاکھیرا افسوس سے کھڑی ہو کر اس کی طرف بڑھی۔ اس کی آنکھیں وحشیانہ طور پر چک رہی تھیں۔

”میں نے اسے مارا کیوں کہ اس نے مجھے قاتل کہا تھا۔“

”تو پھر کیا ہو گیا؟“

”ڈیل کیا ہو گیا؟“ وہ اتنے سے زور سے چلائی کہ ڈیوڑی میں بھی اس کی آواز کو نہیں سنی۔

”اگر میں قاتل کہلائی تو صرف تمہاری وجہ سے..... ہاں میں نے سب سے سانچی کو قتل کیا تھا لیکن صرف اس وجہ سے کہ وہ یہیں مار رہا تھا۔ تمہاری خاطر میں سات سال جیل کی کوڑی میں سڑتی رہی۔ سات سال تک بے دوقت! تمہارا خیال ہے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے لیکن تمہیں یہ نہیں معلوم کہ وہ ہر رات گھٹنوں ڈیوڑی میں کسی کے ساتھ رہتی ہے؟“

”محبے معلوم ہے۔“ کریٹ کے چہرے پر بے ساختہ سکراہٹ پھیل گئی۔

لاکچر اکولا جیسے اسے کسی پچھونے ڈک مارا ہو۔ اس نے بے ساختہ چوک کر دیکھا اور دریتک کریٹ کے چہرے کے اتار چڑھاوا کا چائزہ لیتی رہی اور پھر وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ غصے اور کرب کی شدت سے اس کا سانس دھونکی کی طرح جلنے لگا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنادل پیڑھر اس طرح پیٹھنگی چیزے وہ کسی لحد پھٹ جائے گا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم ہر روز رجاء میں آتے رہے لیکن تم بھی ایک منٹ کے لیے بھی میرے پاس نہیں آئے۔ افسوس اے شق القلب! میں نے دنیا کی ہر چیز تھی پر نثار کر دی؟ کیا تو سمجھتا ہے کہ میں پسے سانچی سے محبت کرتی تھی۔ میں نے اس کی لاتیں صرف اس لیے کھائیں کہ تجھے بھوکانہ مر نے دوں، لیکن جب اس نے تجھے مارا تو میں نے اسے قتل کر دیا۔ اگر تجھے سے ملنے کی امید میرے دل کو بے چین نہ کیے ہوتی تو میں جیل

خانے کی تکلیفیں اٹھانے کی بجائے زہر کھاتی۔“
”اچھا مام، ذرا عقل سے کام لومیں اب میں سوال کا ہو گیا ہوں، تم مجھ سے کیا امید رکھتی ہو؟“
اگر روز الیانہ سکیں تو کوئی اور نہیں۔“

”ڈیل کیتیں؟“ وہ بے ساختہ چلائی۔
”میں جھسے نفرت کرتی ہوں، باہر نکل جاؤ۔“
”طمینان رہو، میں بھی یہاں ٹھہرنا نہیں چاہتا۔“

وہ اطمینان سے ڈیوڑی سے گزرنا اور آہنی دروازہ زور سے بند کر کے باہر نکل گیا۔ لاکچر اپنے چھوٹے سے کمرے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھر تی رہی۔ ٹھیکاں آہستہ آہستہ ریختی رہیں۔ کافی دیر وہ کھڑکی میں کھڑی رہی اور اس خوفناک طریقے سے ٹکری باندھے باہر دیکھتی رہی جیسے کوئی درندہ جست لگانے والا ہو۔ وہ ساکت و صامت کھڑی تھی اور دل میں الٹتے جوش کو دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”رجا، میں دستک کی صدائیں ہوئی جیسے کوئی شخص باہر کھڑا ہو۔ وہ ہانپتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس کی خوفناک آنکھیں حلقوں میں اوپر چڑھی تھیں..... لیکن یہ تو عممار تھا۔“

وہ پھر انتظار کرنے لگی اور پھر روز الیا کی مال سینے ہیوں پر چڑھ کر اپنے کمرے میں آئی۔ لاکچر اپنے ٹکل کو دونوں ہاتھوں سے دبایا تا کہ وہ سانس کے بے پناہ دباو کر سکے۔ کچھ وقٹے کے بعد اس کے تمام حجم میں کچھ دوڑ گئی۔

آخر کار..... دروازے پر دستک ہوئی اور ایک آواز آئی۔

”کون؟“
”کون؟“

”میں، لاکچر نے روز الیا کی آواز کو بیچاں لیا۔ اس کے مند سے آہ نکل گئی۔ دروازہ اوپر سے

کھولا گیا اور روز الیا پچھلی چال میں آہستہ آہستہ
ڈیوڑھی پار کر رہی تھی۔ اس کی ایک ایک حرکت
میں زندگی کی تزپ اور سرت نمایاں تھی۔ اس
نے ڈیوڑھی پار کر لی اور زینے پر قدم رکھنے ہی
والی تھی کہ لاچیرا تیزی سے آگئے آئی اور اپنے
استخوانی ہاتھوں سے روز الیا کا بازو اتنی بختی سے
پکڑ لیا کہ جبکش نہ کر سکی۔

”تم کیا چاہتی ہو؟“ روز الیا نے کہا۔

”مجھے جانے دو۔“

”تم میرے لڑکے سے روز کیوں ملتی ہو؟“

”مجھے جانے دو ورنہ میں چلانے لگوں گی۔“

”کیا یہ حق ہے کہ تم ہر رات اسے رجا میں
ملتی ہو؟“

”ای! انٹونیو! دوڑو۔“ روز الیا تیز آواز
میں چلائی۔

”مجھے جواب دو۔“

”اچھا! اگر تم پچھی باتیں سننا چاہتی ہو تو سنو۔
وہ مجھ سے شادی کرنے والا ہے۔ وہ مجھ سے بے
انتبا محبت کرتا ہے اور میں میں بھی اپنے دل
کی گہرائیوں سے اس سے محبت کرتی ہوں۔“ وہ
لاچیرا کی طرف مردی اور اس کی گرفت سے اپنے
آپ کو چھڑانے کی کوشش کی۔

”کیا تم بھتی ہو کہ اپنے ان منحوس ہاتھوں
سے تم ہماری خوشیوں کا گلا گھونٹ سکتی ہو؟ کیا تم
اس غلط فہمی میں بتلا ہو کہ تم سے خوف زدہ ہے؟
اس نے تو مجھ سے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ تم سے
نفرت کرتا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ تم بھی جیل سے رہا
نہ ہوتی۔“

”اس نے تم سے پہ کہا ہے؟“ لاچیرا حیرت
کے عالم میں پیچھے ہٹ گئی۔ روز الیا نے موقع سے
فائدہ اٹھایا۔

کیا

خدا نے آپ کو

حسن کی

و لت

سے نوازا ہے؟

کیا آپ کو

لیاں

پہننے کا سلیقہ آتا ہے؟

تو پھر آپ

کیا

سچی کہانیاں

کے سرورق کی زینت کیوں نہ بنیں؟؟
آج ہی ہمارے نوٹوگرافر سے رابطہ قائم کیجیے۔

021-35893121-22

II-88 خیابان جامی فیور 7 - ڈپنس باؤس گر انحرافی، کراچی

”ہاں اس نے مجھ سے یہ کہا ہے اور اس نے تو مجھ سے اور بھی بہت کچھ کہا ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے پیسے ساتھی کو قتل کیا تھا اور تم ساتھی میں بندہ ہی ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ کاشت تم مرجاتیں۔“ روزالیا نے یہ الفاظ نفرت کے عالم میں چبا چکار کئے۔

لاپکھر اس طرح پیچھے ہٹ گئی جیسے کسی نے اس پر شدید ضرب میں لگائی ہوں۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر روزالیا زور سے ٹھیکی۔ ”اور تمہیں اس بات پر غفران ہونا چاہیے کہ میں نے ایک قاتل عورت کے لڑکے کی بیوی بننے سے انکار نہیں کیا۔“

یہ کہہ کر اس نے لاپکھر اکوپرے دھکیل دیا اور سڑھوں کی طرف لپکی، لیکن اس حرکت نے لاپکھر اکے مقلوب جسم میں جان ڈال دی۔ تیر کی طرح پیچتے ہوئے طعنوں نے اسے زندگی کی غصیم ترین اذیت پہنچائی تھی۔ غصے میں اس نے ایک خوفناک حق ماری اور روزالیا پر جھٹکت کر اسے شانوں سے ٹپڑ کر نیچے ٹھیٹ لیا۔ روزالیا پیچھے ہٹری اور لاپکھر اکے منہ پر ٹھیٹ مارا۔ لاپکھر اکے غصیف کے نیچے سے ایک چاقو نکالا اور غلظیت گالی بکتے ہوئے پورا چاقو روزالیا کی گردن میں پیوسٹ کر دیا۔

”ماں..... اس نے مجھے مارڈا لا۔“ وہ زینے سے نیچے گر گئی اور گھٹڑی کی بین پتھروں پر جا پڑی۔ جوانی کے ابھتے ہوئے گرم خون نے زمین پر ایک چھوٹا سا سرخ گڑھا بنادیا۔ دل دوز چیخ رات کی تاریکی اور خاموشی میں ہر طرف گونج آئی اور چھ سات دروازے ایک ساتھ کھل گئے۔ لوگ لاپکھر اکو پکڑنے

دوڑے لیکن وہ دیوار سے پیٹھے لگائے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر غمیض و غصب کا انتہ خوف ناک تاثرات چھاگئے تھے کہ کسی کو آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اسی اثناء میں روزالیا کی ماں بالکوئی سے چھینیں مار تھیں اور ایک لمحے کے لیے توجہ دوسرا طرف مرکوز ہو گئی۔ لاپکھر اکے موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنے کمرے میں ھس کر دروازہ مقفل کر دیا۔

آنفاٹا پورا دالان لوگوں سے بھر گیا۔ روزالیا کی ماں میں کرتی اپنی بیٹی سے لپٹ گئی۔ حاضرین میں سے کوئی ڈاکٹر کو بلانے بھاگا تو کسی نے پولیس کو خبر دی۔ لوگ سڑک سے بھاگ بھاگ کر دروازے کے پاس جمع ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ادھر ڈاکٹر اپنا سیاہ بیک لیے موقع واردات پر پہنچ گیا۔ ادھر پولیس آن پہنچی۔ چھ سات آدمیوں نے ایک ساتھ سائیک کے متعلق تفصیلات بتانی شروع کر دیں۔ انہوں نے پولیس کو لاپکھر اک کمرے پر پہنچا دیا اور دروازے کو توڑ دیا گیا۔

کچھ دیری کی شخص کمش کے بعد پولیس لاپکھر اک کا ہاتھوں میں ہٹکڑیاں ڈال کر باہر لے آئی۔ لوگ جو شیع کے عالم میں آگے بڑھے لیکن پولیس نے ملزم کے گرد گھبرا دیا اور گھنیوں سے لوگوں کو پرے ہٹا دیا۔ عوام دور سے اسے گالیاں دیتے اور کے دکھاتے رہے لیکن لاپکھر اکی آنکھیں ہر چیز سے بے نیاز تھیں کہ نئے سے چمک رہی ہیں۔ پولیس اسے ڈیورٹی سے نکال کر باہر لے آئی جہاں ڈاکٹر ایک سر دلاش کے پاس کھڑا تھا۔

”کیا یہ مر گئی ہے؟“ لاپکھر اک نے پوچھا۔ ”ہاں۔“ ڈاکٹرنے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ”یا خدا! تیرا شکر ہے۔“ لاپکھر اک نے کہا۔

☆☆.....☆☆